پیاسی روحیں

روح میں کپکپی پیدا کر دینے والی خوفناک اور سنسنی خیز کہانیاں



عنایت اللہ

فہرست

پیش لفظ

اپنے معاشرے کی چودہ سچی کہانیوں کا مجموعہ پیش کر رہا ہوں۔

ان کہانیوں کے متعلق اتنا ہی کہنا کافی ہونا چاہئے کہ ہر کہانی حقیقی زندگی کی سچی کہانی ہے اور یہ کہانیاں اُن ہی خواتین و حضرات نے خود لکھی یا سنائی ہیں جن کے ساتھ یہ عجیب و غریب' جذبات کو ہلا دینے والے' سنسنی خیز' ڈرامائی واقعات اور حادثات پیش آئے ہیں۔

"حکایت" کی مقبولیت کی وجہ ہی یہی ہے کہ اس میں اپنے معاشرے کی سچی کہانیاں شائع کی جاتی ہیں۔ یہ چودہ کہانیاں "حکایت" میں چھپنے والی سینکڑوں کہانیوں میں سے منتخب کی گئی ہیں۔ ان میں چار دیواری کی دنیا کی اور دیواروں میں محبوس دنیا کے باہر کی کہانیاں بھی ہیں۔ آپ بیتیاں اور جگ بیتیاں بھی ہیں۔ بعض کہانیوں کے پس منظر خالصتاً" نفسیاتی ہیں۔ اس پس منظر کی وارداتیں زیادہ دلچسپ اور فکر انگیز ہیں۔ اس مجموعے میں آپ کو ایسی کہانیاں بھی ملیں گی جیسے آپ سکرین پر ایکشن فلم دیکھ رہے ہوں۔

یہ سچی کہانیاں نہ تو افسانے ہیں نہ یہ افسانوی انداز سے لکھی گئی ہیں۔ طرزِ تحریر سیدھا سادا اور قدرتی ہے جیسے کوئی آپ کے پاس بیٹھا اپنے ساتھ پیش آنے والا کوئی واقعہ یا حادثہ سنا رہا ہو۔

ان کہانیوں میں آپ کو کلیڈوسکوپ کی طرح کئی رنگ اور بدلتے رنگوں کے مناظر نظر آئیں گے۔ آپ شام کو گھر آکر یقیناً" ایسی تفریح کی ضرورت محسوس کرتے ہیں جو آپ کے تھکے ماندے اعصاب کو سہلا کر پُرسکون کر دے۔ میں دعوے سے کہتا ہوں کہ یہ مجموعہ آپ کی یہ ضرورت پوری کر دے گا۔

یہ کہانیاں آپ بچوں کو بھی پڑھا سکتے ہیں بلکہ بچوں کو پڑھائیں تاکہ وہ انگریزی

سے ترجمہ کی ہوئی مار دھاڑ اور جرم و گناہ کی خیالی اور اخلاق کو مجروح کرنے والی چسکے دار کہانیوں سے ہٹ جائیں۔

میں قارئین کرام سے درخواست کرتا ہوں کہ اس مجموعے میں کوئی خامی دیکھیں تو مجھے ضرور لکھیں تاکہ میں آئندہ بہتر انتخاب کروں۔ میں تو ان کہانیوں کی تعریف کر رہا ہوں لیکن بہترین جج آپ ہیں۔

عنایت اللہ

مدیر ماہنامہ "حکایت" لاہور

ریل کی پٹڑی سے ریل کی پٹڑی تک

چار دیواری کی دنیا کی بعض ایسی کہانیاں سننے میں آتی ہیں جن پر یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا حالانکہ ہم سب ان کہانیوں کے اصلی کردار ہوتے ہیں پھر بھی نہ جانے کیا بات ہے کہ یہی محسوس ہوتا ہے جیسے یہ کسی اور معاشرے کی کہانیاں ہیں۔ جو کہانی میں سنانے لگی ہوں اس کے بارے میں ابھی تک مجھے خود یقین نہیں آیا کہ میری زندگی میں ایسا بھی ہُوا ہو گا لیکن حقیقت یہی ہے کہ ایسا ہُوا تھا اور میں زندگی کے ایک انوکھے ڈرامے کی مرکزی کردار تھی۔ یہ واقعہ اب ایک خواب کی طرح یاد آتا ہے لیکن یہ ایک ایسا واقعہ ہے جس نے میری زندگی میں انقلاب برپا کر دیا۔

امتیاز میرے مرحوم شوہر کا اصلی نہیں فرضی نام ہے۔ وہ اس دنیائے فانی سے رخصت ہو چکے ہیں پھر بھی میں چاہتی ہوں کہ ان کا اصلی نام کتاب میں نہ آئے۔ آپ میرا نام بھی فرضی ہی لکھیں۔ دیگر نام اور مقامات بھی فرضی ہی لکھوں گی۔ صرف واقعات اصلی اور سچے ہوں گے کیوں کہ مجھے معلوم ہے کہ قارئین کو نام اور مقام سے نہیں کہانی سے دلچسپی ہوتی ہے۔

یہ آج سے تقریباً دس سال پہلے کی کہانی ہے۔ میں تدریس کے شعبے سے منسلک تھی اور ایک بڑے شہر میں ایک ہوسٹل میں رہتی تھی جسے "ورکنگ ویمن ہوسٹل" کا نام دیا گیا تھا۔ میرے والدین کسی دوسرے شہر میں رہتے تھے۔ انہیں مجھ پر مکمل اعتماد تھا اس لئے میں ان کی اجازت سے اکیلی رہ رہی تھی۔ حقیقت میں میں اکیلی نہیں تھی۔ میرے شہر کی دو اور لڑکیاں بھی اسی ہوسٹل میں رہتی تھیں۔ ان کے والدین اور میرے والدین نے آپس میں صلاح مشورہ کر کے ہم تینوں کو یہاں رہنے کی اجازت دی تھی۔ میرے والدین کو میری ذات پر جو اعتماد تھا اس کی

وجہ یہ بھی تھی کہ میں ان کی اکلوتی بیٹی تھی اور میرے ان کے ساتھ دوستانہ تعلقات تھے۔ والدین اور خصوصاً" والد صاحب جب اپنی اولاد کے ساتھ دوستانہ تعلقات کی سطح پر اتر آئیں تو پھر اولاد اپنے باپ کے نام اور عزت کی خاطر جان پر بھی کھیل جاتی ہے اور لڑکیاں ایسی کسی حرکت کا تصوّر بھی نہیں کر سکتیں جس سے باپ کے نام پر حرف آئے۔ ویسے بھی جن لڑکیوں کو بہن بھائیوں اور والدین کی طرف سے پیار اور شفقت ملے ان کو کوئی شخص بھی بے وقوف نہیں بنا سکتا کیونکہ ان میں خود اعتمادی ہوتی ہے اور وہ کسی نفسیاتی محرومی میں مبتلا نہیں ہوتیں۔

میری دونوں ساتھی لڑکیاں سوشل ویلفیئر کے محکمے میں ملازم تھیں اور ہماری آپس میں بڑی گہری دوستی تھی۔ ہم تینوں شام کو ٹہلنے کے لئے نکل جاتی تھیں۔ ہم آپس میں باتیں کرتیں، چھیڑتیں چھاڑتیں اور سیر کر کے واپس آجایا کرتی تھیں۔ وہ میرے ایک پھوپھی زاد بھائی کا نام لے کر مجھے چھیڑتی تھیں۔ میرا یہ پھوپھی زاد بچپن سے ہی میرے ساتھ منسوب تھا اور میں بھی اسے دل و جان سے پسند کرتی تھی۔ وہ کسی عرب ریاست میں ملازم تھا اور ہمارے گھر والوں کا پروگرام تھا کہ ایک آدھ سال بعد ہماری شادی کر دیں گے۔ میں تصوّرات سے دل بہلانے والی لڑکی نہیں تھی بلکہ حقیقت کی دنیا میں رہتی تھی پھر بھی کبھی کبھی میرا پھوپھی زاد میرے تصوّر میں آتا اور میری روح کو سرشار کر جایا کرتا تھا۔ میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ وہ مجھے خط بھی لکھا کرتا تھا۔ میں بھی اس کو جواب ضرور دیا کرتی تھی۔ اس کے خطوط میں کوئی فضول بات نہیں ہوتی تھی بلکہ وہ دوستانہ انداز میں خط لکھا کرتا تھا۔ میں اس کا خط اپنی والدہ کو دکھا دیا کرتی اور والدہ خاموشی سے مسکرا دیا کرتی تھیں۔

ہم تینوں سیر کرتی کرتی ریلوے لائن تک نکل جایا کرتی تھیں۔ ریل گاڑی کو گزرتے دیکھنا میرا شوق تھا۔ میں اس میں بیٹھے ہوئے مسافروں کو دیکھ کر خوش ہُوا کرتی تھی۔ کبھی چھوٹے چھوٹے بچے ہاتھ ہلایا کرتے کبھی کسی عورت کا چہرہ کھڑکی میں نظر آتا جس کے برقعے کا نقاب اٹھا ہوتا تھا۔ ہر قسم کے چہروں کا نظارہ میرے لئے اتنا دلچسپ تماشا ہوتا تھا کہ میری دونوں سہیلیاں میرا مذاق اُڑایا کرتی تھیں۔

"لالہ رخ!" ___ وہ مجھے چھیڑتیں ___ "تمہیں تو ایئرپورٹ پر جا کر جہازوں کو دیکھنا چاہئے۔ اس نے دبئی سے ریل گاڑی پر تو نہیں آنا۔ وہ تو جہاز پر آئے گا۔ کل ہم تمہیں رن وے کی سیر کرائیں گی" ___ پھر وہ دونوں مل کر اتنی زور سے قہقہہ لگاتیں کہ بعض اوقات راہ گیر ہمیں مُڑ کر دیکھنے لگتے۔ ایسے میں مجھے بہت غصہ آتا مگر ان دونوں کی شرارتوں کے آگے میری ذرا پیش نہ چلتی۔

ایک روز ہمیں واپس آتے آتے ذرا دیر ہو گئی اور سورج افق میں اتر گیا۔ شام کی روشنی ابھی تھوڑی تھوڑی باقی تھی۔ میں نے دور سے ریل گاڑی کے انجن کی بتی دیکھ لی تھی۔ میں نے دونوں سے کہا کہ تھوڑی دیر ٹھہر جاؤ، ریل گاڑی کو گزر لینے دو پھر چلیں گے مگر وہ نہ مانیں اور انہوں نے مجھے زبردستی اپنے ساتھ گھسیٹ لیا۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ پہلے ہی دیر ہو گئی ہے۔ اب ہوسٹل واپس چلنا چاہئے۔

اتنی دیر میں ایک لڑکی گھبرا کر بولی ___ "وہ دیکھو کیا ہے؟" ___ ہم سب نے چونک کر دیکھا۔ اندھیرے میں ریلوے لائن کے اوپر ایک ہیولا سا نظر آ رہا تھا۔ گاڑی ابھی تھوڑی دُور تھی ورنہ انجن کی روشنی میں نظر آ جاتا کہ ریلوے لائن پر کون کھڑا ہے۔

"کوئی سیر کے لئے آیا ہو گا"۔

"نہیں، مجھے تو مصیبت کی ماری کوئی عورت معلوم ہوتی ہے۔ خود کشی کرنے آئی ہو گی"۔

"کوئی محبت کا مارا عاشق ہو گا" ___ ہماری ایک سہیلی جملہ کسنے سے باز نہ آئی ___ "عشق میں ناکام ہو کر ریلوے لائن پر آ گیا ہو گا"۔

ہم نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ کوئی آس پاس نہیں تھا۔ سردیوں کی شام تھی اس لئے لوگ گھروں میں دبکے ہوئے تھے۔ میں نے کہا کہ قریب چل کر دیکھتے ہیں۔ میری دونوں سہیلیوں نے کچھ بھی نہ کہا اور خاموشی سے میرے ساتھ چل پڑیں۔ ہم نے انجن کی طرف دیکھا۔ گاڑی قریب آ گئی تھی۔ ہم تینوں دوڑ پڑیں۔ میں ان دونوں سے آگے آگے دوڑ رہی تھی۔ ایسے لگتا تھا جیسے مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ اگلے لمحے کیا ہونے والا ہے۔ گاڑی تیزی سے قریب آ رہی تھی۔ وہ جو کوئی بھی تھا،

ریلوے لائن پر جھک رہا تھا۔ انجن کی روشنی میں اس کا چہرہ نظر نہیں آرہا تھا کیونکہ اس نے اپنے چہرے پر کپڑا لپیٹ رکھا تھا جس کی وجہ سے اس کی آنکھیں بھی نظر نہیں آرہی تھیں۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے اپنا سر ریلوے لائن پر پھینک دیا۔

اُس کے کچلے جانے میں صرف ایک لمحہ باقی تھا کہ میں دوڑ کر آگے آئی اور اس کو پاؤں سے پکڑ کر پیچھے گھسیٹ لیا۔ ایک سیکنڈ میں ہی گاڑی اُس جگہ سے گزر رہی تھی جہاں اُس نے سر رکھا تھا مگر اب وہ شخص ریلوے لائن کے باہر پڑا تھا۔ ابھی اس کی زندگی باقی تھی کہ ہم تینوں وقت پر پہنچ گئیں۔

اب ہم نے غور سے دیکھا۔ اس شخص نے اپنے سر اور چہرے پر اُونی سویٹر لپیٹ رکھا تھا۔ میں نے جلدی جلدی اس سویٹر کو کھولا اور اُس کا چہرہ دیکھا۔ وہ تقریباً بیس سال کی عمر کا جوان لڑکا تھا اور خالی خالی نگاہوں سے ہم تینوں کو دیکھ رہا تھا۔ مجھے ایسے لگا جیسے یہ چہرہ میرا جانا پہچانا ہے۔

دیکھتے ہی دیکھتے اس کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔

"کون ہو تم؟" — میں نے پوچھا — "مرنا کیوں چاہتے تھے؟"

اس نے ہچکیاں لے لے کر رونا شروع کر دیا۔ میں اس سے بار بار پوچھتی تھی کہ وہ خودکشی کیوں کرنا چاہتا تھا، مگر وہ میری بات کے جواب میں روئے جا رہا تھا۔ تھوڑی دیر تک روتے رہنے کے بعد وہ خاموش ہُوا۔

"تم نے مجھے کیوں بچایا ہے؟" — اُس نے ہم سے پوچھا — "مرنے کیوں نہیں دیا؟"

"تمہاری ابھی مرنے کی عمر نہیں" — میں نے کہا — "تمہاری ماں ہو گی۔ تمہارے چھوٹے چھوٹے بہن بھائی ہوں گے۔ اگر تم مرجاتے تو سوچو ان پر کیا گزرتی"۔

"میرا کوئی نہیں" — اس نے پھٹ کر کہا اور روتے روتے بولا — "کسی کو میرے مرنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا"۔

"تمہارا اس دنیا میں کوئی نہیں؟" — میری سہیلی نے پوچھا۔

"ماں ہے" — اس نے جواب دیا — "ایک سوتیلا بھائی ہے اور سوتیلا باپ ہے پر سچ پوچھو تو کوئی نہیں۔ میں اس دنیا میں اکیلا ہوں۔ کئی بار میں نے خودکشی کا ارادہ کیا مگر مجھے موت سے بھی خوف آتا ہے۔ آج میں نے پکا ارادہ کر لیا تھا کہ اپنی جان لے کر رہوں گا۔ میں نے اپنی آنکھوں پر سویٹر باندھ لیا تھا کہ موت کو نہ دیکھ سکوں اور آرام سے دنیا سے گزر جاؤں مگر یہ دنیا اتنی ظالم ہے کہ مرنے بھی نہیں دیتی"۔

میری دونوں سہیلیوں کو اس طرح کے لوگوں سے نمٹنے کا طریقہ آتا تھا۔ ان کی نوکری بھی ایسی ہی تھی کہ انہیں بے سہارا اور سوسائٹی کے ٹھکرائے ہوئے لوگوں سے واسطہ پڑتا رہتا تھا۔ انہوں نے اسے کہا کہ ہمارے ساتھ چلو، مگر اس نے جانے سے انکار کر دیا۔

"میں اب اپنے گھر نہیں جانا چاہتا" — اس نے کہا — "تم مجھے میرے حال پر چھوڑ دو"۔

"اپنے گھر بے شک نہ جاؤ" — میری سہیلی نے کہا — "لیکن یہاں سے چلو"۔

ہم نے اسے وہاں سے اٹھایا اور وہ ہمارے ساتھ چل پڑا۔ میری سہیلیوں نے اسے باتوں ہی باتوں میں قائل کر لیا کہ وہ زندگی سے بھاگے گا نہیں، بلکہ حالات کا سامنا کرے گا۔ ان دونوں لڑکیوں کی گفتگو بڑی اچھی ہوتی تھی۔ ان کا طرزِ استدلال ایسا تھا کہ وہ ہر آدمی کو ٹوٹے ہوئے آدمی کو تو خاص طور پر قائل کر لیا کرتی تھیں۔

"ہمیں ابھی تمہارے حالات کا صحیح طور پر اندازہ نہیں" — ایک نے کہا — "تم اگر مناسب سمجھو تو کل ہمارے دفتر آجاؤ۔ ہم دیکھیں گی کہ تمہارے لئے کیا کر سکتی ہیں مگر شرط یہ ہے کہ اس وقت سیدھے اپنے گھر جاؤ۔ کل ہمارے پاس آجانا"۔

انہوں نے اس لڑکے کو اپنے دفتر کا ایڈریس بتا دیا۔ بعد میں انہوں نے مجھے بھی کہا کہ میں بھی ان کے پاس دفتر ہی چلی آؤں۔ وہ اس لڑکے کی مدد کرنے میں خاصی سنجیدہ تھیں۔ رات کو ہوسٹل کے کمرے میں بھی وہ اسی نوجوان کے متعلق

باتیں کرتی رہیں۔

لوگ خودکشی کیوں کرتے ہیں؟

یہ بات اس وقت میرے لئے معمّے کی حیثیت رکھتی تھی۔ ظاہری سی بات ہے کہ اپنی جان کسی دوسرے کی جان لینے سے زیادہ مشکل کام ہے۔ میں ابھی تک یہ بات نہیں سمجھ سکی تھی کہ لوگ اتنا حوصلہ کیسے پیدا کر لیتے ہیں کہ خود کو موت کے اندھے، تاریک اور گہرے کنوئیں میں اپنے ہاتھوں گرا دیں۔ خودکشی میرے لئے پُراسرار بھی تھی اور خوفناک بھی اور میں جو دوڑ کر ریلوے لائن پر پہنچی تھی اور میں نے اس نوجوان کو موت کے منہ سے باہر کھینچ لیا تھا یہ شاید اس تڑپ کا نتیجہ تھا جو چند سال پہلے اس راز سے پردہ اٹھانے کے لئے میرے اندر پیدا ہو گئی تھی۔

میری سہیلیاں مجھ سے زیادہ پڑھی لکھی تھیں۔ انہوں نے مجھے کئی ایک واقعات سنائے اور بتایا کہ وہ کون سے عوامل ہوتے ہیں جن کی بنا پر لوگ ایک لمحے کے لئے اپنے ہوش و حواس سے بیگانہ ہو کر یا اپنی جان لے لیتے ہیں یا کسی دوسرے کو قتل کر دیتے ہیں۔ انہوں نے غیر ملکی کتابوں کے حوالے بھی دیئے اور مجھے سمجھانے کی کوشش کی لیکن میں اس راز کو سمجھ نہ سکی۔

اُس رات میں سو بھی نہ سکی۔ میں نے وہ ساری رات آنکھوں میں کاٹ دی۔ پانچ سال پہلے کا ایسا ہی ایک منظر بار بار میری آنکھوں کے سامنے آ رہا تھا۔ بالکل ایسا ہی ایک خوبصورت نوجوان اسی طرح سماج کے ظالم بندھنوں سے تعلق توڑ کر ریلوے لائن پر پہنچ گیا تھا۔ اس شام کوئی لالہ رُخ وہاں نہیں ٹہل رہی تھی جو اس کو کھینچ کر موت کے جبڑوں سے نکال لاتی۔ میں جب تصوّر میں لاتی ہوں کہ وہ نوجوان کس طرح انجن کے سامنے لیٹا ہو گا اور اس نے کس حوصلے سے اپنی گردن ریل کی پٹڑی پر رکھی ہو گی تو خوف کے مارے میرے جسم پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔ اس حادثے نے میرے بھرے گھر کو ویران کر دیا تھا۔ میرا اکلوتا اور لاڈلا بھائی صرف اس لئے موت کی اندھیری وادی میں اُتر گیا تھا کہ جس کو اس نے اپنی زندگی سمجھا تھا وہ اس کے منہ پر رسوائی اور جگ ہنسائی کی کالک مل کر کسی اور کی ہو گئی تھی۔

یہ ایک علیحدہ اور طویل کہانی ہے جو میں اس کہانی کے ساتھ نہیں سنا سکتی۔ مختصراً اتنا سمجھ لیں کہ محبت میں ناکامی کا داغ ایسا تھا جس نے میرے بھائی کا دل اچاٹ کر دیا تھا۔ میرے ماں باپ کو تو اس صدمے نے پاگل کر دیا۔ اکلوتے جوان بیٹے کی موت ماں باپ کی کمر توڑ کر رکھ دیتی ہے اور پھر وہ فرمانبردار اور سعادت مند بیٹا تھا۔ میرے والد ایک کارخانے کے مالک تھے۔ انہیں کسی چیز کی تنگی نہیں تھی مگر اب ان کی اس دولت کا وارث کوئی نہیں رہا تھا۔ اتنے بڑے وسیع کاروبار کو سنبھالنے کے لئے انہیں ایک معاون کی ضرورت تھی جس کے لئے انہوں نے اپنے بیٹے پر نظر رکھی تھی مگر اب انہیں یہ کاروبار اکیلے ہی چلانا تھا۔ بیٹے کی موت کے بعد انہوں نے میری دلجوئی کرنی شروع کر دی۔ یہی وجہ ہے کہ جب میں نے نوکری کا ارادہ کیا تو وہ میرے راستے کی رکاوٹ نہ بنے حالانکہ وہ کہہ سکتے تھے کہ نوکری تو اسے کرنی چاہئے جسے پیسوں کی ضرورت ہو اور تم کارخانہ دار کی بیٹی ہو کر نوکری کیوں کر رہی ہو، مگر انہوں نے میری خواہش کا احترام کیا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بھائی کی موت کا زخم بھرتا جا رہا تھا، لیکن شام کو اس نوجوان نے میرے سامنے آ کر یہ زخم پھر تازہ کر دیا تھا۔ اسے ریلوے لائن پر دیکھ کر میں ایسے ہی نہیں دوڑی تھی۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے مجھے کوئی کہہ رہا ہو کہ لالہ رخ، دیر نہ کرو ورنہ ایک اور نوجوان موت کے گھاٹ اتر جائے گا۔ مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ اگلے لمحے کیا ہونے والا ہے۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا جیسے میرا بھائی ریلوے لائن پر جھک کر اپنی گردن آہنی پٹڑی پر رکھ رہا ہے۔ میں دیوانی ہو گئی تھی اور اسی دیوانگی میں میں نے اس نوجوان کو پیچھے کھینچ لیا تھا۔ اس کی زندگی بچا کر مجھے ایسے لگا جیسے میں نے اپنے بھائی کو بچا لیا ہو۔

اگلی صبح میں اس نوجوان سے ملنے کے لئے بے تاب ہو رہی تھی۔ وہ جب میری سہیلی کے دفتر میں داخل ہُوا تو اس کی حالت گزشتہ شام کی نسبت بہتر تھی۔ دن کی روشنی میں مَیں نے اسے دیکھا تو میرا دل تڑپ گیا۔ وہ ایک خوبصورت نوجوان تھا۔ بالکل میرے بھائی کی طرح وجیہہ و شکیل تھا۔ میں سوچنے لگی کہ یہ خوبصورت لڑکا اگر ریل کے پہیوں کے نیچے آ کر قیمہ بن جاتا تو دنیا کو پتہ بھی نہ چلتا

کہ کوئی اس عمر میں رخصت ہو گیا ہے۔ اس کی ماں البتہ ساری عمر اس کے لئے روتی رہتی۔ یہ لڑکا جسے ماں باپ کے بڑھاپے کا سہارا بننا تھا خود کو نوجوانی میں ہی بے سہارا محسوس کر رہا تھا۔

"میں باپ کی موت کے ساتھ ہی بے سہارا ہو گیا تھا" —— اس لڑکے نے ہمیں اپنی داستان سنائی۔ اس کی داستان تو بہت طویل تھی جو اس نے کم از کم تین گھنٹوں میں سنائی۔ اتنی زیادہ دیر اس لئے بھی لگی کہ وہ بار بار رو پڑتا تھا۔ اسے چپ کرانا مشکل کام تھا' اس لئے ہم نے اسے رونے دیا۔ جب وہ دل کی بھڑاس نکال چکا تو اس نے باقی کہانی سنائی۔

اس لڑکے کا باپ اس وقت مر گیا تھا جب اُس کی عمر ابھی دس گیارہ سال تھی۔ باپ زرعی جائیداد کا مالک تھا۔ اس کا ایک چچا بھی تھا جس نے یہ سوچ کر کہ بھائی کی جائیداد اس کے اپنے ہاتھوں میں رہے' مرحوم کی بیوہ سے نکاح کر لیا۔ وہ تھا تو اس کا چچا مگر اس کی دلچسپی صرف اس جائیداد کے ساتھ تھی جو اس کا بھائی چھوڑ کر مرا تھا۔ اس لڑکے کی ماں نے بھی اتنی جلدی شادی کی ہامی بھر لی تھی جیسے اسے خاوند کی موت کا انتظار ہو۔

"مجھے اب یاد آتا ہے" —— اس لڑکے نے سنایا —— "کہ میری ماں نے عدت بھی مشکل سے گزاری تھی۔ عدت کی مدت پوری ہوتے ہی اس نے چچا سے شادی کر لی۔ مجھے اپنی ماں سے اس لئے نفرت نہیں کہ اس نے چچا سے شادی کی تھی' میں تو اس کو اس لئے پسند نہیں کرتا کہ اس نے میرے باپ کو کبھی خوش نہیں رہنے دیا تھا۔ میرا باپ جب زمینوں پر جاتا تھا تو ہمارے گھر میں دو آدمی آیا کرتے تھے اور میری ماں مجھے پیسے دے کر گھر سے باہر بھیج دیتی تھی۔ اُس وقت میں بچّہ تھا اس لئے یہ ساری باتیں میں نہیں سمجھ سکتا تھا مگر اب جب وہ باتیں مجھے یاد آتی ہیں تو میرے اندر قہر بھر جاتا ہے۔ آپ چاہے مجھے بے شرم کہہ لیں یا بے غیرت کہیں' میں یہ بات ضرور کہوں گا کہ میری ماں میرے باپ کو دھوکہ دے رہی تھی.....

"اور جب میرا باپ زمینوں سے واپس آتا تھا تو ماں کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر میرے باپ سے لڑائی چھیڑ دیتی تھی۔ اُس وقت مجھے اپنی ماں زہر لگتی تھی۔ میری

ماں بچپن میں مجھے چڑیل سے ڈرایا کرتی تھی اور چڑیل کا تصور کرنے کے لئے میں اپنی ماں کی طرف دیکھا کرتا تھا۔ جب وہ میرے باپ سے چیخ چیخ کر بولتی تھی تو مجھے چڑیل لگتی تھی۔ نہ صرف یہ کہ اس نے میرے باپ سے بے وفائی کی بلکہ اس نے مجھے بھی کسی توجہ کے قابل نہ سمجھا۔ وہ اپنی ساری توجہ اپنے آپ کو بنانے سنوارنے پر صرف کرتی تھی۔ اگر میں کبھی اس کے پاس بھی چلا جاتا تو وہ مجھے دھتکار دیا کرتی تھی.....

"میرا باپ جس عمر میں مرا وہ اس کے مرنے کی عمر نہیں تھی۔ اسے خانگی جھگڑوں نے کھا لیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ میں اپنی ماں کو اپنے باپ کی قاتل سمجھتا ہوں۔ میری ماں میری بھی قاتل ہے۔ اس نے میری روح کو ختم کر دیا ہے۔ میں اس گھر میں اس طرح رہتا تھا جیسے دو دشمن ایک چار دیواری کے اندر رہ رہے ہوں۔ میرا صرف ایک دوست اور ایک ہی خیر خواہ تھا اور وہ میرا باپ تھا۔ میں نے گھر سے باہر کوئی دوست نہیں بنایا اور آج تک میرا کوئی دوست نہیں بنا۔ میں دل کی باتیں کرنے کے لئے باپ کی قبر پر چلا جایا کرتا ہوں اور قبر سے باتیں کرتا رہتا ہوں یا پھر آج آپ لوگوں سے باتیں کر رہا ہوں.....

"باپ کے مرنے کے بعد میری دنیا اندھیر ہو گئی مگر ایسے لگتا تھا جیسے میری ماں کی عید ہو گئی ہو۔ آپ یقین نہیں کریں گے کہ عدت کی مدت ختم ہونے سے پہلے بھی ایک آدمی ہمارے گھر میں آیا کرتا تھا حالانکہ عورت کو عدت کے دوران کسی غیر مرد کا سایہ بھی نہیں دیکھنا چاہئے۔ پھر ماں نے چچا سے شادی کر لی اور اس کی وہ زندگی دوبارہ شروع ہو گئی جو میرے باپ کے زمانے میں تھی۔ فرق صرف یہ پڑا ہے کہ ماں چچا سے جھگڑا نہیں کرتی لیکن جو لوگ میرے باپ کی زندگی میں آیا کرتے تھے وہ بعد میں بھی آنے لگے کیونکہ میرا چچا بھی کچھ دنوں کے لئے زمینوں پر چلا جایا کرتا تھا.....

"اس دوران میرا ایک سوتیلا بھائی پیدا ہوا۔ ماں اس سے پیار کرتی ہے۔ چچا بھی اس سے پیار کرتا ہے۔ میرے حصے میں صرف دھتکار اور پھٹکار ہے۔ اپنے باپ کی زمین کا میں وارث ہوں مگر چچا میرا سرپرست بنا ہوا ہے۔ وہ مجھے اپنے

راستے سے ہٹا تو نہیں سکتا مگر اس نے میرے لئے وہ حالات پیدا کر دیئے ہیں کہ میں خود ہی اس کے راستے سے ہٹ جاؤں.....

"میں اب جوان ہو گیا ہوں مگر اس سے میری قسمت نہیں بدلی۔ فرق صرف یہ پڑا ہے کہ پہلے جو باتیں میں سمجھ نہیں سکتا تھا اب وہی باتیں میں سمجھتا ہوں اور کڑھتا ہوں۔ میری ماں کی عمر ڈھل گئی ہے مگر اس کی ہوس ابھی پوری طرح جوان ہے۔ میں نے کل رات اپنی ماں کو ایسی حالت میں ایک آدمی کے ساتھ دیکھا کہ میرا دماغ اُلٹ گیا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ اسے قتل کر دوں مگر میرے اندر اتنا حوصلہ بھی نہیں رہا۔ اس کو تو میں قتل نہیں کر سکا مگر میں اپنے آپ پر قابو نہ پا سکا۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ دھوکے اور فریب کی اس دنیا کو ٹھکرا کر باپ کے پاس چلا جاؤں گا مگر تم نے میری یہ حسرت بھی پوری نہیں ہونے دی"۔

ہر بچّہ اپنی ماں کو تقدیس اور عفت مآبی کی علامت سمجھتا ہے۔ وہ تصوّر بھی نہیں کر سکتا کہ اس کی ماں اس کے برعکس بھی ہو سکتی ہے مگر جب ایسا کوئی شک دل میں پھُوٹنا شروع کر دے تو پھر بچّے کا وہی حال ہوتا ہے جو آج کل اعلیٰ سوسائٹی کے کچھ بچوں کا ہو رہا ہے۔ بچے منشّیات کے عادی ہو جاتے ہیں۔ ان کے اندر قہر بھر جاتا ہے۔ وہ دنگا فساد حتیٰ کہ قتل کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ یہ نوجوان جو ہمارے سامنے بیٹھا ہمیں اپنی داستان حیات سنا رہا تھا' یہ اپنا سارا غصہ اپنی ذات پر نکال رہا تھا۔ اس میں حالات نے اتنی جرأت بھی نہیں رہنے دی تھی کہ کسی ہجولی کو اپنا رازدان ہی بنا لیتا۔ وہ اندر ہی اندر کڑھتا رہتا تھا۔ جب اُس کا غصہ اپنی انتہا کو پہنچ گیا تو اس نے اپنی جان لینے کا فیصلہ کر لیا۔

"تم کچھ پڑھے لکھے بھی ہو؟" ــــ میں نے پوچھا۔

"ایف۔ اے تک پڑھا ہے" ــــ اس نے جواب دیا ــــ "میرے چچا نے صرف اس لئے' مجھے کالج داخل کرا دیا تھا کہ کوئی اسے یہ نہ کہہ سکے کہ وہ بھائی کی جائیداد پر تو سانپ بن کر بیٹھ گیا ہے مگر اپنے بھتیجے کو تعلیم بھی نہیں دلا رہا۔ کالج کی فیس ادا کرنے کے سوا کسی نے میری تعلیم میں کوئی دلچسپی نہیں لی"۔

"تمہارا کالج میں تو کوئی دوست بنا ہو گا" ــــ میں نے کہا۔

"بالکل نہیں" ــــ اس نے جواب دیا ــــ "وہ سب لڑکے مجھ سے اتنے مختلف تھے کہ میں ان سے بات کرتے ہوئے بھی جھجکتا تھا"۔

محرومی کا وہ احساس جو اس کے گھر کے حالات نے اس کے اندر پیدا کیا تھا کالج میں جا کر بڑھ گیا تھا۔ اس نے ٹھیک کہا تھا کہ کالج کے لڑکے اس سے بہت مختلف تھے۔ وہ کالج میں اس قسم کی باتیں کرتے جو اس کے لئے عجیب و غریب ہوتی تھیں۔

"چلو ٹک شاپ میں کچھ کھا پی لیتے ہیں"۔

"نہیں یار! میری ماں نے مجھے بڑا زبردست ناشتہ کرایا ہے۔ وہ صبح منہ اندھیرے ہی اٹھ کر میرے لئے ناشتہ تیار کرنا شروع کر دیتی ہے"۔

"میری ماں بھی ایسی ہی ہے یار! وہ مجھے بازار کی کوئی چیز نہیں کھانے دیتی۔ کہتی ہے تمہارا معدہ بگڑ جائے گا"۔

"تمہارا سویٹر بڑا خوبصورت ہے"۔

"ماں نے بنایا ہے۔ سردیاں شروع ہوتے ہی وہ میرے لئے اون ڈھو کر گھر لے آتی ہے اور ہر وقت بس سویٹریں ہی بناتی رہتی ہے"۔

"مجھے تو اب اجازت دو۔ دس منٹ کی بھی دیر ہو جائے تو ماں پریشان ہو کر دروازے پر کھڑی ہو جاتی ہے"۔

ان لڑکوں کو وہ کسی اور دنیا کی مخلوق سمجھتا تھا اس لئے وہ ان میں گھل مل نہیں سکتا تھا۔ وہ سوچتا تھا کہ ایسی مائیں بھی ہوتی ہیں کیا؟

"اب آپ خود ہی بتائیں" ــــ اس نے کہا ــــ "میں کالج میں ان لوگوں کو کیسے دوست بنا سکتا تھا۔ میں انہیں کیا کہتا کہ میری ماں کیسی ہے۔ میں انہیں یہ تو نہیں کہہ سکتا تھا کہ گھر میں میرا کوئی بھی انتظار نہیں کرتا کیونکہ ماں کو خود فرصت نہیں۔ میں انہیں یہ بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ "میری ماں خاوند کی غیر موجودگی میں عیش کرتی پھرتی ہے۔ اگر میں ایسی بات کرتا بھی تو لوگ مجھے پاگل سمجھتے"۔

میری سہیلی نے مجھے بتایا تھا کہ اس نے ایک ایسا کیس پہلے بھی دیکھا تھا۔ ایک لڑکی تھی جس کو اپنی ماں سے نفرت تھی۔ وہ اپنے باپ کو بھی پسند نہیں کرتی تھی۔

اس کے گھر کے حالات نے اسے تنہائی پسند بنا دیا۔ اس نے کالج کی تعلیم بھی حاصل کی تھی مگر وہ اپنی کوئی سہیلی نہ بنا سکی۔ میری سہیلی اسے پاگل خانے میں ملی تھی۔

"میں تم لوگوں کو ایک بات بتا دوں"۔۔۔ اس نے ہم سے کہا۔۔۔ "کل شام تو تم لوگوں نے مجھے بچا لیا تھا مگر اب آئندہ اگر تمہیں خبر ملے کہ ایک نوجوان ریل گاڑی کے نیچے آ کر ہلاک ہو گیا ہے تو مجھے معاف کر دینا"۔

"تم ایسا نہیں کرو گے امتیاز!" ۔۔۔ میری سہیلی نے اسے کہا ۔۔۔ "ابھی تمہارے مرنے کی عمر نہیں۔ ہم تمہیں ایسا نہیں کرنے دیں گی"۔

"تم کیا کرو گی؟" ۔۔۔ وہ بگڑ کر بولا ۔۔۔ "تم مجھے ماں کا پیار دو گی؟ ایک دھتکارے ہوئے انسان کو سر آنکھوں پر بٹھاؤ گی؟ تم میرے لئے کیا کر سکتی ہو؟..... شاید کچھ بھی نہیں"۔

"دیکھو امتیاز!" ۔۔۔ میں نے بھی تیز لہجے میں بولتے ہوئے کہا ۔۔۔ "میں نہیں چاہتی کہ تمہاری لاش گاڑی کے نیچے آ کر قیمہ بن جائے اور تمہاری ماں ساری عمر رو کر گزار دے۔ وہ آخر تمہاری ماں ہے..... سنو' وہ بھی تمہاری طرح کا ایک خوبصورت نوجوان تھا جو آج سے چند سال قبل اسی طرح ریلوے لائن پر کٹ گیا تھا اور میں آج تک اس کا ماتم کر رہی ہوں..... وہ میرا بھائی تھا۔ اُس روز میں نے تمہیں ریلوے لائن پر دیکھا تو میں یہی سمجھی تھی کہ میرا بھائی ایک بار پھر خودکشی کرنے کے لئے آ گیا ہے۔ تمہیں بچا کر میری روح کا بوجھ ہلکا ہو گیا ہے۔ میں تو یہی سمجھ رہی ہوں کہ میں نے اپنے بھائی کو مرنے سے بچا لیا ہے"۔

میں نے امتیاز کو اپنے بھائی کی موت کا سارا واقعہ سنا کر کہا ۔۔۔ "زندگی اور موت خدا کے اختیار میں ہے۔ تم سوچو کہ خدا نے تمہیں مرنے سے بچا لیا ہے۔ وہ شاید تم سے کوئی کام لینا چاہتا ہو گا۔ تم اب مرنے کا خیال چھوڑ دو۔ کوئی کام کاج کرو۔ کہیں نوکری کر لو۔ تم مصروف ہو جاؤ گے تو سب کچھ بھول جاؤ گے"۔

اس نے ہمیں بتایا کہ وہ نوکری کی کوشش بھی کر چکا ہے۔ اسے کلرکی تک نہیں ملی۔ ہم نے اسے کہا کہ وہ ہمارے پاس آتا رہے' ہم اس کے لئے کچھ نہ کچھ ضرور کریں گی۔ میں نے اسے اپنے ہوسٹل کا پتہ بھی دے دیا اور اسے رخصت کر

دیا۔

"یہ تم نے کیا کیا لالہ رخ!" ۔۔۔ اس کے جانے کے بعد میری سہیلیوں نے مجھے ڈانٹتے ہوئے کہا ۔۔۔ "تم نے اسے ہوسٹل کا پتہ کیوں دے دیا؟ اب ایسا نہ ہو کہ یہ ہوسٹل کے چکر ہی لگاتا رہے"۔

"لگاتا رہے" ۔۔۔ میں نے بے پروائی سے کہا ۔۔۔ "میں تمہیں پہلے کہہ چکی ہوں کہ اسے دیکھ کر مجھے اپنا بھائی یاد آ گیا تھا۔ اب میں ہر حال میں اس کی مدد کروں گی اور اسے زندگی کے راستے پر واپس لا کر دم لوں گی"۔

میرے والد صاحب کو ایک ایسے قابلِ اعتماد نوجوان کی ضرورت تھی جو کارخانے میں ان کا ہاتھ بٹاتا۔ میں نے آپ کو بتایا ہے کہ بیٹے کی موت کے بعد وہ بالکل تنہا ہو گئے تھے۔ آدمی تو بہت مل جاتے تھے مگر انہیں اپنے بیٹے کا نعم البدل' ایک ایسا نوجوان جس پر وہ آنکھیں بند کر کے اعتماد کر سکیں نہیں مل سکا تھا۔ میں نے سوچا کہ اگلے ہفتے جب میں گھر جاؤں گی تو والد صاحب سے اس نوجوان کا ضرور ذکر کروں گی۔

امتیاز اس دوران دو تین بار میرے ہوسٹل میں آیا۔ وہ جب بھی ہوسٹل میں آتا تھا مجھ سے ہی ملتا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں اس کی نوکری کے لئے کوشش کر رہی ہوں۔ میں نے اس سے پوچھا کہ اگر اس کو کسی دوسرے شہر میں نوکری ملی تو وہ کر لے گا؟

"ایک بات بتاؤں لالہ رخ!" ۔۔۔ امتیاز نے مجھے بے تکلفی سے مخاطب کرتے ہوئے کہا ۔۔۔ "میں اس شہر میں رہوں یا کہیں اور' اس سے کسی کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مجھے بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ میں کئی کئی راتیں گھر سے باہر ریلوے اسٹیشن پر گزار دیتا ہوں۔ صبح گھر جاتا ہوں تو نہ کبھی ماں نے مجھ سے پوچھا' نہ چچا نے کہ میں رات بھر کہاں رہا ہوں۔ میں ان میں سے نہیں ہوں جن کی مائیں دروازے پر کھڑی ہو کر ان کا انتظار کیا کرتی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اگر میں دوسرے شہر میں چلا گیا تو میرا چچا اور میری ماں خدا کا شکر ادا کریں گے۔ میرا چچا تو دن رات دعائیں مانگتا ہے کہ میں اس دنیا سے ہی رخصت ہو جاؤں..... رہی میری بات تو میں

سمجھتا ہوں کہ اس شہر سے ہمیشہ کے لئے ہی چلا جاؤں تو بہتر ہے تم میرے لئے بہت کچھ کر رہی ہو۔ میں، تمہارا احسان زندگی بھر نہیں اتار سکوں گا۔ تمہارا یہی احسان کیا کم ہے کہ تم میری بات صبر و تحمل سے سن لیتی ہو"۔

"تم اس کو احسان نہیں سمجھتے کہ میں نے تمہاری جان بچائی؟"

"سچ پوچھو تو بالکل نہیں" —— اس نے جواب دیا —— "اگر تم مجھے وہاں پر پڑا رہنے دیتیں تو شاید یہ میرے اوپر بہت بڑا احسان ہوتا' لیکن ٹھہرو..... شاید میں سچی بات اب بھی نہیں کر رہا۔ اگر میں مرجاتا تو پھر تم جیسی ہمدرد لڑکی سے میں کہاں ملتا؟..... لالہ رخ! میں سمجھتا تھا کہ میرا کوئی دوست نہیں لیکن تم سے ملنے کے بعد میری رائے تھوڑی بدل گئی ہے۔ تمہاری ہمدردی' تمہارے خلوص اور تمہاری..... " وہ بولتے بولتے رک گیا اور سوچنے لگا کہ وہ جو بات کہنا چاہتا ہے وہ اسے کہنی چاہئے یا نہیں۔ تھوڑی دیر بعد وہ اپنا حوصلہ یکجا کر کے بولا —— ....."اور تمہاری دوستی نے شاید میرے خیالات کو بھی تھوڑا تھوڑا بدل دیا ہے۔ اب مجھے دنیا اتنی بُری بھی نہیں لگتی"۔

"کسی غلط فہمی میں نہ رہنا امتیاز!" —— میں نے اسے خبردار کرتے ہوئے کہا —— "میں تمہیں پہلے بھی کہہ چکی ہوں کہ تمہیں دیکھ کر مجھے اپنا مرحوم بھائی یاد آگیا تھا۔ میں اب بھی تمہیں اسی کی تصویر سمجھتی ہوں۔ میں دوستی لگانے والی لڑکی نہیں"۔

میرے لہجے میں شاید تھوڑی سی تلخی آگئی تھی اس لئے اس نے نہایت ذہانت سے بات کا رخ بدل دیا اور بولا —— "مجھے نوکری کہاں کرنی ہوگی؟"

"ابھی میں کچھ نہیں کہہ سکتی" —— میں نے گول مول سے لہجے میں جواب دیا —— "ابھی میں کوشش کر رہی ہوں" —— ابھی میں اس کو ساری تفصیل نہیں بتا سکتی تھی مگر میرے اس طرح بولنے کو شاید وہ میری بے رخی سمجھا۔

"ناراض ہو گئی ہو لالہ رخ!" —— اس نے لجاجت سے پوچھا —— "خدا کے لئے میری کسی بات کا غلط مطلب نہ لینا۔ اگر تم بھی ناراض ہو گئیں تو پھر میں دنیا میں کس کے سامنے جا کر اپنے دکھڑے بیان کروں گا؟"

میں نے اسے تسلّی دی کہ میں اس سے ناراض نہیں ہوئی لیکن میں نے یہ بھی اسے آرام سے سمجھا دیا کہ میری ہمدردی کا وہ کوئی غلط مطلب نہ لے۔ حقیقت بھی یہی تھی کہ وہ نوجوان مجھے اچھا لگا کرتا تھا مگر شاید اس لئے کہ مجھے اس میں اپنے مرحوم بھائی کی جھلک نظر آیا کرتی تھی۔ وہ عمر میں مجھ سے چار پانچ برس چھوٹا تھا۔ پہلے میں نے سوچا کہ میں اپنی سہیلیوں سے ذکر کروں کہ یہ نوجوان میری ہمدردی کو کیا سمجھ رہا ہے پھر اس لئے خاموش ہو گئی کہ یہ خواہ مخواہ چھیڑ چھیڑ کر میرا ناک میں دم کر دیں گی۔

میں نے آپ کو اس کہانی کے شروع میں اپنے پھوپھی زاد بھائی کے بارے میں بتایا ہے۔ وہ میرے خیالوں میں بستا تھا۔ میری اس کے ساتھ ہجولیوں والی بے تکلفی تھی۔ ہم ایک دوسرے کو خط بھی لکھتے تھے اور اس میں چھوٹی سے چھوٹی باتیں بھی لکھا کرتے تھے۔ میں نے اب اسے خط لکھا تو اس میں امتیاز کے بارے میں تفصیل سے لکھا۔

اس سے ایک ہفتہ بعد میں اپنے گھر گئی اور اپنے والد صاحب کو امتیاز کے بارے میں بتایا۔ اس کے تفصیلی حالات بتائے تو امی جان اور والد صاحب دونوں کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ انہیں بھی شاید میری طرح اپنا جوان مرگ بیٹا یاد آگیا تھا۔

"آپ اس نوجوان کو اپنے ساتھ کام میں لگا لیں" —— میری امی نے والد صاحب کو مشورہ دیا —— "نیکی کا کام ہے۔ آپ کو بھی کام کرنے والے نوجوان کی ضرورت ہے۔ ایک تو اُس کی زندگی سنور جائے گی دوسرے آپ کو ایک معاون مل جائے گا"۔

"میں ایک اور بات سوچ رہا ہوں" —— والد صاحب نے کہا —— "یہ نوجوان ذہنی طور پر اتنا اکھڑا ہُوا ہے تو کام کیا کرے گا۔ بہرحال میں اُسے چھوٹا موٹا کام دے کر دیکھتا ہوں کہ وہ میرے ساتھ چل بھی سکے گا یا نہیں" —— پھر والد صاحب نے میرے پھوپھی زاد بھائی کا نام لے کر کہا —— "میں سوچ رہا ہوں کہ میرا اپنا بھانجا دبئی سے واپس آجائے گا تو اسے اپنے ساتھ لگا لوں۔ میں اپنا سارا کاروبار اس کے

حوالے کرنا چاہتا ہوں۔ اب اس کے اور لالہ رخ کے علاوہ میرا اور ہے بھی کون؟ یہ کاروبار بعد میں بھی اسے ہی سنبھالنا ہے پھر اسے دبئی میں دھکے کھانے کی کیا ضرورت ہے؟"

"اب وہ چھٹی آئے تو اس سے بات کر کے دیکھ لیں" ــــ امی جان نے کہا ــــ "لیکن میرے خیال میں آپ کی بہن اور بہنوئی کا پروگرام اور ہے۔ میں نے سنا ہے کہ وہ واپس آئے گا تو اس کا باپ اسے علیحدہ کاروبار کرائے گا۔ وہ دبئی میں جو بھی پیسہ کما رہا ہے وہ اپنا علیحدہ کاروبار کرنے کے لئے کما رہا ہے"۔

"چلو جو ہوگا دیکھا جائے گا" ــــ والد صاحب نے مجھ سے کہا ــــ "تم امتیاز کو میرے پاس لے آنا۔ میں اسے ملازم رکھ لوں گا۔ مجھے اُمید تو نہیں کہ وہ میرے کسی کام آسکے گا مگر میں ایک خطرہ مول لے لیتا ہوں"۔

پروگرام یہ بنا کہ میں اگلے ہفتے امتیاز کو اپنے ساتھ ہی لے آؤں گی۔ میں خوشی خوشی واپس آگئی اور اس سے اگلے ہی روز امتیاز آپہنچا۔ میں نے اسے بتایا کہ اس کی نوکری کا انتظام ہو گیا ہے۔ وہ یہ بات سن کر خوش ہو گیا۔

"اپنی ماں اور اپنے چچا سے دور جانے کا خیال ہی میرے لئے بہت بڑی بات ہے"۔ اس نے خوشی سے بے قابو ہوتے ہوئے کہا ــــ "تم نے مجھے مرنے سے بچایا اور اب مجھے زندہ رہنے پر مجبور کر رہی ہو بلکہ ایسے حالات پیدا کر رہی ہو کہ میں زندگی سے پیار کرنا شروع کر دوں" ــــ اس نے بچوں کی طرح میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور خوشی سے جھومتے ہوئے کہنے لگا ــــ "میں تمہارا شکریہ کس منہ سے ادا کروں لالہ رخ! تم میرے اوپر بہت احسان کر رہی ہو"۔

وہ اپنی خوشی کا اظہار بڑے خطرناک الفاظ میں کر رہا تھا۔ میں نے آہستگی سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھڑایا اور اِدھر اُدھر دیکھا۔ کوئی بھی ہمیں نہیں دیکھ رہا تھا۔ اگر کوئی امتیاز کی یہ حرکت دیکھ لیتا تو ہوسٹل میں قیامت آجاتی اور میں خواہ مخواہ بدنام ہو جاتی۔ پہلے میں نے سوچا کہ امتیاز کو ڈانٹ دوں۔ پھر مجھے اس پر ترس آگیا۔ وہ پیار اور توجہ کا پیاسا تھا۔ اس نے جو حرکت کی تھی اس میں اس کی نیّت اور ارادے کا کوئی دخل نہیں تھا۔ یہ اس کی اضطراری حرکت تھی۔ ایسے لگ رہا

تھا جیسے وہ ایک معصوم بچّہ ہے اور میں نے اسے اس کا من پسند کھلونا لے دیا ہے۔

پہلی بار مجھے امتیاز پر پیار آیا۔ مجھے وہ بالکل اپنا بچّہ معلوم ہو رہا تھا۔

میں نے امتیاز کو اس کی نوکری کی مبارکباد دی اور اپنی سہیلیوں کو بلا کر انہیں بھی امتیاز کے سامنے یہ خوشخبری سنائی۔ انہوں نے بھی اسے مبارکباد دی۔ پھر ہم نے ایک نوکر کو بھیج کر چوک سے مٹھائی منگوائی۔ امتیاز یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا اور اس کے چہرے پر صاف لکھا نظر آتا تھا کہ اسے ابھی تک اعتبار نہیں آیا کہ ہم اس کے ساتھ کیا کر رہی ہیں۔ وہ غالباً سوچ رہا تھا کہ اگر کسی کو نوکری مل جائے تو اس کی ماں اور اس کے گھر والے ایسی خوشی منایا کرتے ہیں۔ اس وقت ہم ہی اس کے گھر والے تھے۔ ہم نے بچی ہوئی مٹھائی نوکروں میں بانٹ دی۔

"امتیاز!" ــــ میں نے اسے کہا ــــ "اپنی ماں اور گھر والوں کے لئے مٹھائی لے جانا اور انہیں خوشخبری سنانا کہ تمہیں نوکری مل گئی ہے۔ دیکھ لینا تمہاری ماں کتنی خوش ہوگی"۔

"خوش تو وہ بہت ہوگی" ــــ اس نے کہا ــــ "میں اس کی نظروں سے دور ہو جاؤں گا اور اگر میں اسے نوکری کی بجائے اپنی موت کی خوشخبری سناتا تو وہ اور بھی خوش ہوتی اور شاید محلے والوں میں لڈو بھی بانٹتی"۔

"امتیاز! تم زیادتی کر رہے ہو" ــــ میری سہیلی نے اسے ٹوکا ــــ "کوئی ماں ایسی نہیں ہوتی۔ ماں کتنی ہی ظالم اور سنگدل کیوں نہ ہو' اپنی اولاد کی اتنی دشمن نہیں ہوتی جتنی تم سمجھ رہے ہو"۔

"تو پھر تم اس کی بیٹی بن جاؤ" ــــ امتیاز نے زہریلے سے لہجے میں کہا ــــ "پھر میں تم سے پوچھوں گا کہ ماں کیا ہوتی' ہے...... لعنت بھیجو میری ماں اور میرے گھر والوں پر۔ اس وقت تم لوگ ہی میرے رشتہ دار اور میرے گھر والے ہو۔ بار بار میری ماں کا نام لے کر میری خوشی برباد نہ کرو"۔

اس کا لہجہ تلخ ہو گیا تھا اس لئے ہم نے موضوع بدل دیا اور ہم امتیاز کے مستقبل کی منصوبہ بندی کرنے لگیں۔

"امتیاز!" ــــ میری ایک سہیلی نے اس سے کہا ــــ "نوکری تو تمہیں مل ہی

گئی ہے' اب شادی کب کر رہے ہو؟..... کوئی لڑکی دیکھ رکھی ہے کیا؟"

"لڑکی بھی اب تم ہی دیکھو گی" ___ امتیاز نے کہا ___ "اگر تم نے کوئی اچھی لڑکی تلاش کر لی تو میں تم تینوں کو ایک ایک نیا جوڑا لے کر دوں گا"۔

ہم تینوں نے ایک دوسرے کی طرف حیرت سے دیکھا۔ یہ ایک خوشگوار تبدیلی تھی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ امتیاز اس طرح بات کر رہا تھا۔ اب اس کے انداز میں شکستگی نہیں تھی۔

"شیطان!" ___ میری سہیلی نے اسے مصنوعی غصے سے ڈانٹا ___ "ہمیں رشتے کرانے والی مائیاں سمجھتا ہے؟"

اور ہم سب ہنس پڑے۔ ہم جتنی دیر بیٹھے رہے اسی طرح ہنسی مذاق کرتے رہے۔ اُس روز امتیاز بہت خوش تھا اور اُٹھنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا کیونکہ وہ خود ہنسی مذاق کے موڈ میں تھا۔

"ایک بات بتاؤ" ___ امتیاز نے ہم سے پوچھا ___ "کیا میں تمہارے ساتھ ہوسٹل میں نہیں رہ سکتا؟ گھر جانے سے مجھے وحشت ہوتی ہے"۔

"رہ سکتے ہو" ___ میری سہیلی نے جواب دیا ___ "نوکروں کے کوارٹر میں یقیناً" جگہ خالی ہو گی پر تمہیں پھر اس ہوسٹل میں نوکری کرنی پڑے گی"۔

بات مذاق میں کہی گئی تھی مگر امتیاز سنجیدہ ہو گیا۔ ہم سمجھیں شاید اسے یہ بات بُری لگی ہے۔ امتیاز نے ہم سے اجازت لی اور چلا گیا۔

"دیکھا!" ___ رات میں نے اپنی سہیلیوں سے کہا ___ "نوکری کے نام پر ہی وہ کتنا بدل گیا ہے۔ سوچو جب اسے نوکری ملے گی تو وہ کتنی جلدی نارمل ہو گا"۔

"یہ سب تمہاری ہمدردی کا نتیجہ ہے لالہ رخ!" ___ میری سہیلی نے کہا ___ "اللہ کرے تمہاری یہ ہمدردی صرف ہمدردی ہی رہے ورنہ اگر اس نے اس سے کوئی غلط مطلب لے لیا تو اس کی زندگی پھر برباد ہو جائے گی"۔

اگلے ہفتے میں امتیاز کو ساتھ لے گئی۔ میرے والدین اس سے بڑے پیار سے ملے۔ والد صاحب نے اپنے کارخانے میں اسے لکھنے پڑھنے کا کوئی چھوٹا موٹا کام دے دیا۔ اس کی رہائش کا مسئلہ درپیش تھا۔ امی جان نے کہا کہ وہ ہمارے گھر کے

ہی ایک کمرے میں رہ جائے۔ امتیاز ضد کر رہا تھا کہ وہ چوکیدار کے ساتھ رہ لے گا مگر میری والدہ نے اسے اچھا نہ جانا کہ وہ نوکر کے ساتھ رہے۔ اسے گھر کے اندر ہی رہنا پڑا۔

میں جو کچھ کر رہی تھی اپنے پھوپھی زاد بھائی کو تفصیل سے لکھتی تھی۔ ایک بار اس کا خط آیا تو اس میں صرف اتنا لکھا تھا ___ "لالہ رخ ہمدردی کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ میں تو اب یہ سمجھنے لگا ہوں کہ امتیاز میری جگہ لے رہا ہے"۔

مجھے بہت غصہ آیا کہ اس نے مجھے غلط سمجھا ہے۔ میں نے اسے ایک لمبا چوڑا خط لکھ دیا اور اسے پہلی بار لکھا کہ عورت زندگی میں صرف ایک بار محبت کرتی ہے اور میں بھی صرف تم سے محبت کرتی ہوں۔ میرا خیال تھا کہ میرا خط پڑھ کر اس کے خیالات بدل جائیں گے اور غلط فہمی رفع ہو جائے گی۔

میں اگلی دفعہ گھر گئی تو والد صاحب بہت خوش تھے۔ وہ بتا رہے تھے کہ امتیاز ان کی توقع کے خلاف بڑا ذہین اور محنتی نوجوان ثابت ہُوا ہے۔ ابّا جان نے اُس کا کام بڑھا دیا تھا اور اب وہ کلرک اور منیجر کے درمیان درمیان کچھ تھا۔ قدرتی بات ہے کہ مجھے بھی بہت خوشی ہوئی۔ میں نے نوکر کو بھیج کر امتیاز کو بلوایا مگر نوکر نے واپس آکر کہا کہ امتیاز صاحب کہتے ہیں اس وقت سخت مصروف ہوں اس لئے گھر نہیں آ سکتا مجھے امید نہیں تھی کہ وہ نوکری میں اتنی دلچسپی لے گا۔ والد صاحب نے مجھے بتایا کہ وہ بعض اوقات وہ کام بھی کرنا شروع کر دیتا ہے جو اس کے کرنے کا نہیں ہوتا۔

"اس لڑکے میں ذہانت بھی ہے اور کام کرنے کا جذبہ بھی" ___ والد صاحب نے مجھے بتایا ___ "اگر اس کے گھر کے حالات ٹھیک ہوتے تو یہ لڑکا بہت ترقی کرتا۔ میں دیکھ رہا ہوں' اگر یہ اسی طرح محنت اور دلچسپی سے کام کرتا رہا تو میں اسے بہت جلدی منیجر بنا دوں گا..... کل یہ مجھے کہہ رہا تھا کہ میں علیحدہ مکان لے کر رہنا چاہتا ہوں۔ میں نے اس سے پوچھا کہ تمہیں اس گھر میں کوئی تکلیف ہے؟ کہنے لگا کہ تکلیف تو کوئی نہیں مگر میں آپ لوگوں کو اور زیادہ تکلیف دینا مناسب نہیں سمجھتا۔ میں نے اسے کہا کہ تم اب میرے گھر میں ہی رہو گے۔ سچ پوچھو تو جب

سے وہ یہاں آیا ہے گھر میں بھی رونق سی ہو گئی ہے"۔

"اگر وہ اپنا مکان لے کر علیٰحدہ رہنا چاہتا ہے تو رہنے دیں" ___ امی جان نے کہا ___ "لالہ رخ کے سسرال بھی اسی شہر میں ہیں۔ وہ شاید امتیاز کا اس گھر میں رہنا اچھا نہ سمجھیں"۔

"تم میری بہن کو اتنا گھٹیا نہ سمجھو" ___ والد صاحب نے کہا ___ "وہ لوگ کچھ نہیں کہیں گے۔ ویسے بھی امتیاز کا تنہا رہنا اس کے لئے اچھا نہیں ہو گا"۔

رات کو امتیاز گھر آیا تو میں نے پہلی نظر ہی میں بھانپ لیا کہ وہ اپنی نوکری سے بہت مطمئن ہے۔ وہ اس طرح سب کے ساتھ ہنس کھیل رہا تھا جیسے بچپن سے ہی اس گھر میں رہتا آیا ہو۔ اس کو پہلی بار توجہ اور شفقت ملی تو اس کی شخصیت نکھر آئی۔ اس بدلی ہوئی شخصیت میں وہ اور بھی پیارا لگ رہا تھا۔

امی جان نے مجھے تنہائی میں بلا کر پوچھا کہ میرے پھوپھی زاد بھائی کا کوئی خط تو نہیں آیا۔ میں نے امی کو صاف بتا دیا کہ اس نے خط میں کیا لکھا ہے۔

"مجھے یہی فکر تھی" ___ امی نے کہا ___ "تمہاری پھوپھی کے گھر والے بھی بیہودہ باتیں کر رہے ہیں۔ جب سے امتیاز اس گھر میں آیا ہے انہوں نے تمہارے خلاف فضول باتیں کرنی شروع کر دی ہیں۔ اگر وہ براہِ راست میرے ساتھ بات کرتے تو میں ان کی غلط فہمی دور کر دیتی مگر ان کی باتیں مجھے محلّے کی عورتوں کے ذریعے معلوم ہوتی ہیں"۔

میں نے امی جان کو تسلی دی اور انہیں بتایا کہ وہ فکر وغیرہ نہ کریں میں نے اپنے پھوپھی زاد بھائی کو تفصیل سے خط لکھا ہے۔ امید ہے کہ اس کی غلط فہمی رفع ہو جائے گی۔

"میں تو کہتی ہوں امتیاز یہاں سے چلا ہی جائے تو بہتر ہے" ___ امی جان نے کہا ___ "کہیں یہ نیکی ہمیں مہنگی نہ پڑے"۔

"نہیں امی جان!" ___ میں نے کہا ___ "خدا آپ کی یہ نیکی برباد نہیں کرے گا۔ ان لوگوں کی غلط فہمی دور ہو جائے گی"۔

مگر میرا یہ خیال غلط ثابت ہُوا۔ جو غلط فہمیاں چار دیواری کی دنیا میں پیدا ہوتی

ہیں وہ دور نہیں ہوتیں۔ یہ غلط فہمیاں عورتوں کی پیدا کردہ ہوتی ہیں جن کی دلچسپی کا اور کوئی سامان نہیں ہوتا۔ وہ محض اپنی دلچسپی کی خاطر آگ پر تیل چھڑکتی رہتی ہیں اور دور بیٹھ کر تماشا دیکھتی ہیں۔ میری پھوپھی کے خاندان کو چار دیواری کی عورتوں نے ہی بتایا تھا کہ امتیاز کو میں لائی ہوں۔ پھر امتیاز ہمارے گھر میں رہنے لگا تو اس افسانے میں مزید رنگ آمیزی کی گئی۔ چار دیواری کی عورتیں ہی میری ماں کو آکر طرح طرح کی باتیں بتایا کرتی تھیں۔ جس روز والد صاحب نے امتیاز کو اپنے کارخانے کا مینجر بنا دیا اُس روز کے بعد غلط فہمیوں کی یہ آگ ایسی بھڑکی شروع ہوئی کہ ٹھنڈی ہونے کا نام ہی نہیں لیتی تھی۔

اُدھر میرے پھوپھی زاد بھائی کو خطوں کے ذریعے کئی افسانے سنائے جا رہے تھے۔ اس نے میرے کئی خطوں کا جواب ہی نہ دیا اور آخری خط لکھا بھی تو اُس میں صرف یہ لکھا ___ "تمہارے ماں باپ نے میرا نعم البدل ڈھونڈ لیا ہے" ___ میری قسمیں اور میرا پیار بھی اس کی غلط فہمی دور نہ کر سکا اور امتیاز کو ریلوے لائن سے اٹھا کر میں نے جو نیکی کی تھی اس نے میری قسمت پھوڑ دی۔

پھر ایک روز میرے پھوپھی کے گھر والے ہمارے گھر آئے اور انہوں نے میرے بارے میں فضول فضول باتیں کیں۔ انہوں نے منگنی قائم رکھنے کے لئے دو شرطیں رکھیں۔ پہلی یہ کہ لالہ رخ نوکری چھوڑ دے اور دوسری یہ کہ والد صاحب امتیاز کو نوکری سے نکال دیں۔ اگر یہ دونوں شرطیں مان کر بھی والد صاحب کو یقین ہوتا کہ میری پھوپھی کا خاندان مجھے معاف کر دے گا تو شاید وہ ان کی شرطیں مان لیتے مگر میرے والد صاحب اچھی طرح جانتے تھے کہ جس رشتے میں غلط فہمی اور شکوک جڑ پکڑ جائیں اس کا انجام تباہی ہوتا ہے۔ اپنے معاشرے میں ایک لعنت یہ بھی ہے کہ لڑکے والے لڑکی والوں کو کمین سمجھنے لگتے ہیں اور توقع رکھتے ہیں کہ لڑکی والے ان کے آگے سر جھکا کر رکھیں گے۔ آپ نے اکثر کئی لڑکے والوں کو لڑکی والوں کے متعلق یہ کہتے سنا ہو گا ___ "دیکھو جی! لڑکی والے ہو کر ایسی باتیں کرتے ہیں"۔

والد صاحب نے ان کی باتیں سن کر ان کو خود ہی اس رشتے سے جواب دے

دیا اور میری بچپن کی نسبت ختم کر دی۔

میری زندگی کا ایک دور ختم ہو گیا۔

ہمیں بعد میں پتہ چلا کہ ان لوگوں نے میرے بارے میں بیہودہ افسانے مشہور کر دیئے تھے۔ وہ سب کو یہی بتاتے تھے کہ لالہ رخ نوکری کے بہانے عیش کرتی پھرتی ہے۔ جس ہوسٹل میں رہتی ہے وہاں مرد اس سے ملنے آتے ہیں۔ میں نے غلطی کی تھی کہ میں نے اپنے پھوپھی زاد بھائی کو امتیاز کے متعلق صاف صاف لکھا تھا۔ وہ بجائے اس کے کہ میری نیکی کی تعریف کرتا اس نے اس کے غلط معنی لئے۔ جب اس کے گھر والوں نے بھی اس کو میرے خلاف بھڑکایا تو وہ یہی سمجھا کہ میں واقعی ہوسٹل میں رہ کر امتیاز کے ساتھ عیش کرتی پھرتی ہوں۔ میں نے سنا ہے کہ اس نے بھی اپنے ماں باپ کو میرے خلاف کئی باتیں لکھی تھیں اور منگنی قائم رکھنے کی جو شرائط اس کے ماں باپ نے پیش کی تھیں وہ دراصل اس کی اپنی شرائط تھیں۔

ادھر امتیاز اس صورتِ حال سے سخت پریشان تھا۔ وہ خود کو مجرم سمجھ رہا تھا۔ اس نے میرے والد صاحب سے کہا کہ مجھے اجازت دیں، میں پہلے ہی آپ کا بہت نقصان کر چکا ہوں مگر والد صاحب نے اس کی بات نہ مانی۔

"تم نے ہمارا کوئی نقصان نہیں کیا نوجوان!" —— والد صاحب نے اس کی پیٹھ تھپکتے ہوئے کہا —— "تمہاری وجہ سے تو ہمیں کھوٹے کھرے کی پہچان ہو گئی ہے"۔

امتیاز نے میری طرف دیکھا۔ میں بھلا والد صاحب سے کیسے کہہ سکتی تھی کہ اس کو جواب دے دیں۔ یہ تو میرا اپنا لگایا ہوا پودا تھا جو ایک بے جان جڑ سے ایک تناور درخت بنا تھا۔ امتیاز کا سیدھے راستے پر آجانا میری وہ نیکی تھی جس نے خود مجھے میری اپنی نظروں میں بہت اونچا کر دیا تھا۔ اگر میرا پھوپھی زاد بھائی منگنی قائم رکھنے کی یہ شرط کہ امتیاز کو نوکری سے نکال دیں، میرے سامنے رکھتا تو میں خود اس رشتے کو مسترد کر دیتی۔

پھر وقت گزرتا رہا اور پھوپھی نے میرے بارے میں جو مشہور کر دیا تھا اس

کے بعد کوئی لڑکے والا ہمارے دروازے پر نہ آیا۔ میری ماں میرے بارے میں اب ہر وقت فکرمند رہتی تھی مگر والد صاحب مطمئن تھے۔ ادھر امتیاز اب تک ہمارے گھر میں رہ رہا تھا۔ اس کے گھر والوں نے پلٹ کر پوچھا بھی نہیں کہ امتیاز کہاں ہے۔ شروع شروع میں میرے والد صاحب نے امتیاز سے کہا بھی کہ اپنی ماں اور گھر والوں سے مل آؤ مگر اس نے انکار کر دیا۔ اس نے کہا کہ اب آپ لوگ ہی میرے سب کچھ ہیں۔

ایک روز امی جان نے مجھ سے پوچھا کہ امتیاز کے ساتھ تمہارے رشتے کی بات کریں؟

"نہ امی!" —— میں نے امی کو روک دیا —— "اس پر یہ ظلم نہ کریں۔ میں عمر میں اس سے بڑی ہوں اور پھر ایک بدنام لڑکی ہوں"۔

"بدنام بھی تو تم اس کی وجہ سے ہی ہوئی ہو" —— امی نے کہا —— "اور پھر وہ ایک اچھا اور محنتی لڑکا ہے۔ تمہارے ابا جان بھی کہہ رہے تھے کہ اب امتیاز نے ان کا سارا کام سنبھال لیا ہے۔ اگر وہ ہمارا بیٹا بن جائے تو تمہارے والد صاحب کی کئی پریشانیاں دور ہو جائیں گی"۔

میں آپ کو تفصیل کیا سناؤں؟ بس یہ سمجھ لیں کہ میری اور امتیاز کی شادی ہو گئی۔ اس رشتے پر وہ بہت خوش تھا۔

"لالہ رخ!" —— امتیاز نے پہلی رات مجھ سے کہا تھا —— "میں جو کچھ بھی ہوں تمہاری وجہ سے ہوں اور اب ساری زندگی تمہارا ہی ہو کر رہوں گا"۔

اور امتیاز نے کچھ عرصے تک اپنے قول کی لاج رکھی۔ وہ مجھ پر اپنی جان چھڑکتا تھا۔ میں بھی اس کے پیار کا جواب والہانہ گرمجوشی سے دیتی تھی اور میرے ماں باپ ہمارا پیار دیکھ کر جی رہے تھے مگر معلوم نہیں کیا بات تھی کہ مجھے اپنی زندگی میں کوئی خلاء محسوس ہوتا تھا۔ ایسے لگتا تھا جیسے میری زندگی میں کوئی کمی رہ گئی ہے۔ امتیاز ایک خوبصورت، محنتی، ذہین اور پیار کرنے والا لڑکا تھا اور کسی بھی عورت کو اس سے بڑھ کر اور کسی بھی چیز کی تمنا نہیں ہوتی پھر بھی مجھے کسی نہ کسی کمی کا احساس ہوتا تھا۔ مجھے اپنے پھوپھی زاد بھائی سے جو پیار تھا اسے وقت کے صحرا میں

چلنے والی ریت کی آندھیوں نے دفن کر دیا تھا۔ اس راکھ میں کوئی چنگاری بھی باقی نہیں رہی تھی۔ میں اب دل و جان سے امتیاز کی تھی۔ اس کی خاطر میں نے اپنی نوکری بھی چھوڑ دی تھی۔ پھر بھی میری ازدواجی زندگی نامکمل تھی۔

شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ میں نے امتیاز کو اس روپ میں نہیں دیکھا تھا جس روپ میں وہ اب میرے ساتھ تھا۔ وہ عمر میں مجھ سے چھوٹا تھا اور میں نے اسے پناہ دی تھی۔ شاید عورت اپنے خاوند کو اپنے اوپر حاوی دیکھنا پسند کرتی ہے اور اس کے برعکس میں امتیاز پر حاوی تھی۔ ممکن ہے کوئی اور وجہ ہو لیکن ایک بات میں آپ کو صاف صاف بتا دیتی ہوں کہ میں نے کبھی امتیاز کو محسوس نہیں ہونے دیا کہ میں کیا سوچ رہی ہوں اور کیا محسوس کرتی ہوں۔ اگر میں ایسی غلطی کر بیٹھتی تو پھر وہ بھی غلط فہمی کا شکار ہو جاتا۔ میں اسے کسی غلط فہمی کے عذاب میں مبتلا نہیں کرنا چاہتی تھی۔

مگر جو ہونا ہوتا ہے وہ ہو کر رہتا ہے۔ میں نے امتیاز کو خوش رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن کچھ ہی عرصے بعد امتیاز نے بھی اپنا روپ بدل لیا۔ پہلے وہ مجھ پر جان چھڑکتا تھا اب وہ بات بات پر مجھ سے تفتیش کرنے لگا۔

"خیریت تو ہے؟" —— وہ کبھی پوچھتا —— "آج بڑی بن سنور کر تیار ہو رہی ہو۔ کہاں کے ارادے ہیں؟"

"امتیاز!" —— میں حیرت سے کہتی —— "تمہارے آنے کا وقت ہوتا ہے تو میں روز ہی بنتی سنورتی ہوں' صرف تمہارے لئے"۔

"نہیں لالہ رخ!" —— وہ آہ بھر کر کہتا —— "میرے لئے کون بنتا سنورتا ہے؟"

ایک دفعہ میں ایک سہیلی کے گھر گئی۔ اُس روز بڑی سخت گرمی پڑ رہی تھی۔ واپس آتے آتے میں پسینے میں شرابور ہو گئی۔ تازہ دم ہونے کے لئے میں نہانے کے لئے غسل خانے میں گھس گئی۔ اُدھر سے امتیاز بھی دوپہر کے کھانے کے وقت گھر آیا۔ میں غسل خانے سے نکلی تو وہ کھانا چھوڑ کر کھڑا ہو گیا اور مجھے بازو سے پکڑ کر کمرے میں لے گیا۔

"سچ بتاؤ آج کہاں سے آئی ہو؟" —— امتیاز کے لہجے میں غصے کا رنگ تھا۔

"ایک سہیلی کے گھر گئی تھی" —— میں نے جواب دیا —— "اور صبح تمہیں بتا کر گئی تھی"۔

"ہونہہ سہیلی کے گھر!" —— اُس نے طنزیہ انداز میں کہا —— "سہیلی کے گھر سے آنے کے بعد تو نہانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ تم کہیں اور سے آ رہی ہو"۔

میں اس کی بات سن کر حیرت اور غصے سے سن ہو گئی۔ میں تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کہ امتیاز اس حد تک بھی جا سکتا ہے۔ میں نے اسے رو رو کر یقین دلایا کہ وہ مجھے غلط نہ سمجھے۔

"کس کو صحیح سمجھوں" —— اس نے کہا —— "تمہیں صحیح سمجھوں یا تمہارے ان رشتہ داروں کو جو تمہیں اچھی طرح جانتے تھے اور جنہوں نے تمہیں ٹھکرا دیا"۔

"امتیاز!" —— میں نے کہا —— "یہ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میرے رشتے داروں نے مجھے کس کی خاطر ٹھکرایا تھا' تمہاری خاطر"۔

"اور اب تمہیں اسی بات کا افسوس ہے" —— امتیاز نے کہا —— "میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تمہارے دل میں اب بھی تمہارا پہلا منگیتر بستا ہے۔ تم تو مجھے صرف ہمدردی میں برداشت کر رہی ہو مگر خدا کے لئے میرے ساتھ بے وفائی تو نہ کرو۔ مجھے معلوم ہے وہ دبئی سے آ گیا ہے اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ تم اپنی سہیلی سے ملنے نہیں جاتیں بلکہ اپنے سابق منگیتر سے ملنے جاتی ہو..... اگر میری یہ باتیں غلط ہیں تو پھر تم کھوئی کھوئی کیوں رہتی ہو؟"

امتیاز کی باتیں اب میری برداشت سے باہر ہوتی جا رہی تھیں۔ میں نے آپ کو صرف ایک دو مثالیں دی ہیں۔ ایسی بک بک ہر وقت ہوتی رہتی تھی۔ میں سوچتی تھی کیا کروں۔ ایک خیال آتا تھا کہ امتیاز پر لعنت بھیجوں اور اسے کہوں مجھے طلاق دے دے۔ پھر میں سوچتی کہ میں پہلے ہی بہت بدنام ہو چکی ہوں۔ اگر ایسی بات ہوئی تو میری پھوپھی کا خاندان مجھ پر اور کیچڑ اچھالے گا اور میرا اور میرے ماں باپ کا اس شہر میں جینا محال ہو جائے گا۔ یہ تو ہو نہیں سکتا تھا کہ میں امتیاز کی باتیں

مزید برداشت کرتی۔

ایک روز صبح ہی صبح امتیاز نے اس سے زیادہ سخت باتیں کیں اور کارخانے چلا گیا۔ اُس وقت میرے پیٹ میں میرا پہلا بچّہ تھا۔ غصے اور افسوس نے میری سوچنے سمجھنے کی ساری صلاحیتیں سلب کرلی تھیں۔ میں نے امتیاز کے نام خط لکھا ——

"امتیاز میں نے تمہیں دل کی گہرائیوں سے چاہا تھا مگر تم میرے نہ بن سکے۔ اب یہ زندگی اتنی اذیت ناک ہوگئی ہے کہ مجھے زندہ رہنے میں کوئی فائدہ نظر نہیں آتا۔ میں بھی اب ریلوے لائن پر اُسی جگہ جارہی ہوں جہاں میرے بھائی نے اپنی گردن گاڑی کے آگے رکھی تھی۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے تمہیں تو زندگی کے راستے پر ڈال دیا مگر مجھے خود زندہ رہنے کا سلیقہ نہ آیا۔ شام کو میری لاش دیکھو تو مجھے معاف کردینا —— تمہاری لالہ رخ"۔

میں نے یہ خط تکیے کے نیچے رکھا اور تیزی سے گھر سے نکل گئی۔ امی نے مجھے نکلتے دیکھا تو آواز دی مگر میں کسی آواز پر لوٹنا نہیں چاہتی تھی۔ ہمارے شہر سے گزرنے والی ریلوے لائن ہمارے گھر سے تین میل دور تھی اور میں فاصلے کے احساس سے عاری ہوگئی تھی۔ بس چلی جارہی تھی لیکن مفلوج اعصاب اور سلب شدہ حواس کے باوجود میں درست سمت میں جارہی تھی۔

مجھے یاد نہیں میں کتنا فاصلہ طے کر آئی تھی کہ مجھے اپنے پیچھے کسی کی آہٹ سنائی دی۔ میں نے پیچھے دیکھے بغیر اپنی رفتار تیز کرلی۔ آہٹ بھی تیز ہوگئی۔ میں نے بھاگنا شروع کردیا مگر اگلے ہی لمحے میں دو مضبوط بازوؤں کے شکنجے میں تھی۔ میں نے نظر اٹھا کر سامنے دیکھا۔ ریلوے لائن صرف دس قدم کے فاصلے پر دھوپ میں چمک رہی تھی۔

دور سے انجن کی وسل سنائی دے رہی تھی۔ میرے پاس وقت کم تھا اور کوئی مجھے دبوچے ہوئے تھا۔ میں خود کو اس سے چھڑانے کے لئے زور لگارہی تھی۔

لوگ خودکشی کیوں کرتے ہیں؟ میں یہ معمّہ حل کرچکی تھی۔ جس راز کو پانے کے لئے میں برسوں سے تڑپ رہی تھی وہ میری نظروں پر آشکار ہوگیا تھا۔

گاڑی قریب آئی تو میں نے اور زور لگایا اور جس کسی نے مجھے دبوچ رکھا تھا

اسے بھی اپنے ساتھ گھسیٹنا شروع کردیا۔ وہ مجھ سے کچھ کہہ رہا تھا جو میں اُس وقت نہیں سن رہی تھی۔ میری ساری حسّیں صرف ایک حس میں بدل گئی تھیں اور وہ یہ تھی کہ گاڑی سامنے ہے اور میرے پاس چند سیکنڈ ہیں۔

جب گاڑی میری آنکھوں کے سامنے سے گزر گئی تو میرا وجود ڈھیلا پڑ گیا۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ میں امتیاز کے بازوؤں میں تھی۔ میں نے اس کے سینے پر سر رکھ کر پھُوٹ پھُوٹ کر رونا شروع کردیا۔

اُس دن کے بعد میری زندگی مکمل ہوگئی۔ امتیاز' میرا خاوند' میرے بچوں کا باپ میری زندگی کا محور بن گیا۔ اُس نے مجھے کبھی طعنہ نہیں دیا' کبھی شکوہ نہیں کیا۔ اس نے اس کے بعد مجھ سے صرف پیار کیا اور چند سال بعد ایک حادثے میں مر کر میری زندگی میں پھر سے خلاء پیدا کرگیا مگر اس کی یاد نے مجھے کبھی اداس نہیں ہونے دیا۔ اس کے بچوں نے اس کی یاد کو میرے دل میں تازہ رکھا ہُوا ہے۔

اب میں زندگی کے اُس دور سے گزر رہی ہوں کہ بہت سی باتیں خود بخود سمجھ میں آجاتی ہیں۔ ایسی باتیں بھی جو بظاہر ناقابلِ یقین ہوتی ہیں۔ میری کہانی کو سن کر شاید کسی کو بھی یقین نہ آئے کہ امتیاز میرے ساتھ وہ سلوک بھی کرسکتا ہے جو اس نے کیا۔ حالانکہ میں نے اس کے لئے کیا کچھ نہ کیا۔ اسے مرنے سے بچایا۔ اسے زندہ رہنے کا حوصلہ دیا۔ اسے زندگی کے راستے پر ڈالا۔ اس کی خاطر سب کو چھوڑا اور پھر اس سے شادی کرلی۔ اس کے بعد امتیاز نے میرے ساتھ جو سلوک کیا وہ خود میرے لئے ناقابلِ یقین تھا مگر اب میں حالات کا حقیقت پسندی سے جائزہ لیتی ہوں تو میری آنکھوں کے آگے سے کئی پردے خود بخود ہٹ جاتے ہیں۔

امتیاز نے جو کچھ بھی کیا اس میں وہ مطلقاً" بے قصور تھا۔ اس نے ایسے ماحول میں پرورش پائی تھی جس میں اس کے لئے صرف نفرت اور پھٹکار تھی۔ اس نے اپنی ماں کو دیکھا تھا جو اپنے خاوند سے بیوفائی کررہی تھی۔ شاید اسی وجہ سے وہ ساری عورتوں کو ایسا ہی سمجھ رہا تھا۔ اسے جب شفقت' توجہ اور عزت ملی تو اسے اعتبار نہ آیا کہ یہ سب کچھ اسے بھی حاصل ہو سکتا ہے۔ اس نے میرے پیار کا بھی یقین نہ کیا اور مجھ پر ایسی الزام تراشی کرتا رہا جسے کوئی عورت بھی برداشت نہیں کر

سکتی چاہے ایسے الزام سچے ہی کیوں نہ ہوں اور پھر مجھ پر تو اس نے جھوٹا شک کیا تھا۔ میں جو ماں بننے والی تھی اس کی یہ باتیں برداشت نہ کر سکی اور اپنی جان لینے پر تل گئی مگر جب اسے میرا خط ملا تو اسے ایک جھٹکا لگا جس نے اس کے ذہن سے غلط فہمیاں نکال پھینکیں اور وہ دل و جان سے میرا ہو گیا۔

یہ تو میں نے آپ کو بتایا ہی نہیں کہ امتیاز میرے پیچھے کس طرح آیا تھا۔ ہُوا یوں کہ میری امی نے جب مجھے تیزی سے دروازے سے نکلتے دیکھا تو ان کا ماتھا ٹھنکا۔ کہتے ہیں سانپ کا ڈسا رسّی سے بھی ڈرتا ہے۔ وہ ایک بیٹے کی قربانی دے چکی تھیں۔ وہ جانتی تھیں کہ امتیاز کے رویّے کی وجہ سے مجھ پر کیا گزر رہی ہے۔ انہوں نے جب مجھے نکلتے دیکھا تو میرے پیچھے لپکیں۔ پھر کسی خیال کے تحت میرے کمرے میں گئیں۔ سائڈ ٹیبل پر تہہ کیا ہُوا میرا خط پڑا تھا۔ اُنہوں نے خط پڑھا اور بھاگتی ہوئی کارخانے گئیں اور امتیاز کو بُرا بھلا بھی کہا اور میرا خط بھی دیا۔ امتیاز اسی وقت بھاگا اور ایک حادثے نے جو ہوتے ہوتے رہ گیا نہ صرف مجھے بلکہ میری ازدواجی زندگی کو بھی بچالیا۔

امتیاز کو خدا غریقِ رحمت کرے۔ وہ حادثے کی طرح میری زندگی میں داخل ہُوا تھا اور ٹریفک کے ایک حادثے نے اسے مجھ سے جدا کر دیا۔

قدرت کا انصاف

جہیز میرے ماں باپ نے میرے لیے بنایا تھا۔ وہ میرا ہی تھا اور مجھے ہی ملنا چاہئے تھا۔ اللہ کی قدرت تھی کہ جہیز مجھے ہی ملا۔ اپنے ملک کا قانون نہ تو میری کوئی مدد کر سکتا تھا اور نہ مجھے جہیز دلا سکتا تھا لیکن اللہ کے بنائے ہوئے قانون کے خلاف کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔

یہ چند سال پہلے کا واقعہ ہے' لیکن کل کا لگتا ہے۔ میں اُس وقت تھرڈ ایئر کا امتحان دے چکی تھی اور بی اے کے فائنل ایئر میں تھی جب گھر میں میری شادی کی باتیں ہونے لگیں۔ میری ماں نے بھی کچھ عورتوں سے کہہ رکھا تھا کہ وہ میرے لئے کوئی مناسب سا لڑکا نظر میں رکھیں۔ مجھے جب پتہ چلا تو میں نے دبے لفظوں میں احتجاج کیا اور اپنی ماں سے اس خواہش کا اظہار کیا کہ میں ایم اے کر کے لیکچرار لگنا چاہتی ہوں۔ میری ماں نے مجھے ڈانٹ دیا۔ اس نے کہا کہ لڑکی کی شادی کی عمر یہی ہوتی ہے۔ یہ عمر گزر جائے تو پھر مناسب رشتہ نہیں ملتا اور پھر لیکچرار کے لئے تو پڑھا لکھا مناسب رشتہ ملنا اور بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ جب سے میں کالج میں داخل ہوئی تھی میرے دل میں لیکچرر شپ کی بہت خواہش تھی۔ میں نے ماں سے کہا کہ ابھی ایک دو سال اور ٹھہر جائیں۔

"لیکچرار بن کر تُو ملکہ تو نہیں بن جائے گی؟" —— میری ماں نے غصّے سے کہا —— "پھر بھی کام تو وہی کرے گی۔ کھانا پکانا' خاوند کے کپڑے استری کرنا' بچّوں کو پالنا' لڑکیاں چاہے کچھ بھی بن جائیں' ان کی قسمت میں یہی کچھ لکھا ہوتا ہے"۔

میں اپنی ماں کے ساتھ بحث نہیں کر سکتی تھی۔ میری ماں تھی ہی ایسی۔ ایسے لگتا تھا جیسے میری شادی کے معاملے میں وہ کچھ زیادہ ہی جنونی ہو گئی ہے۔ شاید جوان لڑکیوں کی مائیں ایسی ہی ہوتی ہوں گی۔ میری ماں نے جب مجھے آزردہ دیکھا تو

کہنے لگی کہ شادی کے بعد بی اے' ایم اے کر لینا اور اگر سسرال والے رضامند ہوئے یا انہیں ضرورت محسوس ہوئی تو نوکری بھی کر لینا۔

چونکہ ماں نے عورتوں کو پہلے سے کہہ رکھا تھا اس لئے دو چار رشتے آئے بھی۔ ان میں سے پہلے تین رشتے تو صرف اس بنا پر مسترد ہو گئے کہ لڑکے والے ہمارے ہم پلّہ نہیں تھے۔ ہم کوئی زیادہ امیر کبیر لوگ نہیں تھے' لیکن میرے والد صاحب کا خیال تھا کہ وہ اپنی بیٹی کو کسی ایسے گھر میں بیاہیں گے جو کم از کم ہمارے مقابلے کا ہو گا اور جہاں لڑکی خوش رہے گی۔ چوتھا رشتہ ایک ملازمت پیشہ نوجوان کا تھا جو ہمارے ساتھ والے محلے سے آیا تھا۔ یہ نوجوان کسی پرائیویٹ کمپنی میں برسرِ روزگار تھا اور اس کا عہدہ اور تعلیم بھی مناسب تھی۔ میرے ماں باپ نے اس رشتے پر غور کرنا شروع کر دیا اور ایک بار ان کے گھر بھی ہو آئے۔

ابا امی اس رشتے کے لئے ہاں کرنے ہی والے تھے کہ ایک اور رشتہ آ گیا۔ یہ رشتہ ایک عورت کے ذریعے آیا تھا۔ یہ عورت رشتے کرانے والی تھی۔ لڑکے کے بارے میں بتایا گیا کہ کسی سرکاری محکمے میں افسر لگا ہوا ہے۔ باپ کا کاروبار ہے اور گھر میں دولت کی ریل پیل ہے۔ ان لوگوں نے شہر کی ایک نئی آبادی میں کوٹھی بھی بنا رکھی تھی۔ بظاہر یہ رشتہ بھی اچھا تھا۔ میرے ماں باپ اب اس سوچ میں پڑ گئے کہ دونوں رشتوں میں سے کس کو جواب دیا جائے۔ دوسرا رشتہ ان کے دل کو بھلا لگتا تھا۔ رشتے کرانے والی نے ہماری ملنے والی ایک عورت کا بھی حوالہ دیا تھا کہ وہ بھی اس لڑکے کے گھر والوں کو جانتی ہے۔ وہ ایک معزّز سی عورت تھی۔ میری ماں نے جب اس سے پوچھا تو اس نے بھی لڑکے اور اس کے گھر والوں کی تعریفیں کیں۔ میری ماں نے رشتہ کرانے والی مائی سے کہہ دیا کہ لڑکے والوں کو بھیج دو۔

لڑکے والے گاڑی میں آئے۔ لڑکے کا باپ تھا' اس کی ماں تھی اور ایک چھوٹی بہن تھی۔ میرے ماں باپ ان سے متاثر ہوئے۔ انہوں نے ابا کو دعوت دی کہ آپ ہمارے گھر آئیں۔ ابا' امی اور بھائی گئے اور واپس آئے تو بہت متاثر تھے۔ انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ لڑکے والے آسودہ حال ہیں اور لڑکا باعزّت روزگار پر لگا ہوا ہے اس لئے میرا رشتہ اسی گھر میں دیا جائے گا۔ شگن ہوئے اور رشتہ طے

ہو گیا۔

یہ نہ سمجھیں کہ میرے ماں باپ لالچی تھے۔ والد صاحب کا اپنا کاروبار تھا۔ تین بھائی تھے اور تینوں برسرِ روزگار تھے۔ انہیں لالچ کی ضرورت نہیں تھی۔ انہیں اپنی بیٹی کے لئے مناسب رشتہ درکار تھا جو انہیں مل گیا تھا۔ دراصل آج کل لڑکی والدین کے لئے ایک ٹیڑھا مسئلہ بن گئی ہے اور ماں باپ کی خواہش ہوتی ہے کہ اچھا رشتہ مل جائے۔ اُدھر لڑکے والوں نے یہ کہا کہ ہمیں زیادہ پڑھی لکھی لڑکی کی ضرورت نہیں۔ ہمیں لڑکی کی شرافت اور گھریلو پن چاہئے۔ ہمیں خدا نے سب کچھ دے رکھا ہے۔ میرے چھوٹے بھائی نے کہا بھی کہ لڑکے کے بارے میں تفتیش کر لینی چاہئے لیکن سب گھر والوں نے یہی کہا کہ لڑکا خوبصورت ہے' افسر ہے اور گھر میں روپیہ پیسہ بھی ہے۔ آگے اللہ مالک ہے۔

مجھے جب کالج سے اٹھایا گیا تو مجھے بہت افسوس ہُوا لیکن ماں نے کہا کہ جب تیری نئی زندگی شروع ہو گی تو کالج یونیورسٹی سب بھول جائے گی۔

میری شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ اُدھر سے اشارہ ملا کہ ہم لوگ برادری سے باہر شادی کر رہے ہیں اور برادری والوں کو یہی بتایا ہے کہ لڑکی والے امیر کبیر لوگ ہیں۔ یہ ایک اشارہ تھا اور اس کا مطلب یہ تھا کہ جہیز کھل کر دینا اس پر میرے چھوٹے بھائی نے کہا کہ یہ لوگ لالچی معلوم ہوتے ہیں۔ میری ماں نے اسے جھڑک دیا اور کہا کہ یہ ان کی مجبوری ہے۔ امی کو اب صرف ایک جنون تھا کہ ایسا رشتہ ہاتھ سے نہیں جانا چاہئے۔

جہیز میرے ماں باپ کے لئے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ میں تین بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی۔ بھائی غیر شادی شدہ اور برسرِ روزگار تھے۔ باپ کا اچھا خاصا کاروبار تھا۔ انہوں نے میرے لئے بہت اچھا جہیز بنایا۔ اس میں فریج' ٹی۔ وی' وی سی آر' کپڑے' فرنیچر' سب کچھ تھا اور ہر چیز اعلیٰ کوالٹی کی تھی۔ میرے والدین اپنے ہونے والے داماد کی حیثیت کے پیشِ نظر جہیز میں گاڑی بھی دینا چاہتے تھے لیکن میں نے کہہ دیا کہ میں نقد لوں گی۔ والد صاحب نے کیش میں ستر ہزار روپے دے دیئے۔ مجھے معلوم تھا کہ انہیں تھوڑا سا قرض بھی لینا پڑ گیا ہے۔ بارات کے لئے

کھانا بھی بہت اچھا تھا۔ غرض یہ کہ انہوں نے لڑکے والوں کا یہ مطالبہ پورا کر دیا اور ان کی برادری اور بارات کو یہی تاثر ملا کہ لڑکی والے امیر کبیر لوگ ہیں۔

میری شادی ہو گئی اور میں سسرال چلی گئی۔ پہلی رات ہی میں نے خاوند کو کیش دے دیا اور اسے بتا دیا کہ یہ رقم گاڑی کے لئے ہے۔ میرا خاوند یہ رقم دیکھ کر بہت خوش ہُوا۔ ایسے لگتا تھا جیسے اسے توقع نہیں تھی کہ میں جہیز میں نقد رقم بھی لے کر آؤں گی۔ اگلے روز ولیمہ ہُوا جو بڑا ہی شاندار تھا۔ میں ایک روز کے لئے والدین کے پاس آئی اور پھر اپنے خاوند کے گھر چلی گئی۔

میں نے تین چار دنوں میں ہی محسوس کر لیا کہ اپنے سسرال کے جو ٹھاٹ باٹھ میں نے سنے تھے' وہ تو کہیں بھی نظر نہیں آئے۔ جب میں پہلی مرتبہ باورچی خانے میں گئی تو مجھے بہت مایوسی ہوئی۔ ہر طرف گندگی تھی اور گندے برتن بکھرے پڑے تھے۔ کہیں بھی کوئی سلیقہ نظر نہیں آتا تھا۔ میں نے ان دو تین دنوں میں اپنی نند کے ساتھ بے تکلفی پیدا کر لی تھی۔ وہ میری ہم عمر تھی۔ میں نے اس سے کہا کہ شاید گھر میں مہمانوں کی آمد کی وجہ سے اتنے برتن بکھرے پڑے ہیں۔ میں نے یہ بھی کہا کہ نوکرانی کو سمجھا دوں گی کہ باورچی خانے کو صاف رکھا کرے۔

میری نند کا نام فرزانہ تھا۔ میری بات سن کر وہ ہنس پڑی۔

"کیوں؟" ——میں نے کہا—— "ہنس کیوں رہی ہو؟"

"میری پیاری بھابی جان!" —— اس نے عجیب سے لہجے میں کہا—— "جو حکم دینا ہے ابھی دے لو۔ نوکرانی تمہارے سامنے کھڑی ہے"۔

یہ بات کہہ کر اس نے دھونے کے لئے برتن اکٹھے کرنے شروع کر دیئے۔ میں اس کا ہاتھ بٹانے کے لئے آگے بڑھی تو اس نے مجھے روک دیا۔

"ابھی دو چار دن مہمان ہو" —— فرزانہ نے کہا—— "اس کے بعد یہ کام تم نے ہی کرنا ہے"۔

پہلے تو میں سمجھی کہ فرزانہ مذاق کر رہی ہے لیکن دو دن بعد میں نے اسے گھر کی جھاڑ پونچھ کرتے دیکھا تو مجھے یقین ہو گیا کہ گھر میں نوکرانی صرف ایک ہے اور وہ بھی صرف جھاڑو لگانے کے لئے رکھی گئی ہے۔ میں نے اپنے گھر میں تو ایسے کام

کبھی نہیں کئے تھے' لیکن سسرال میں یہ کام کرنے کے لئے خود کو ذہنی طور پر تیار کرنے لگی۔ مجھے ایک بات کی تسلی تھی کہ فرزانہ میری ہم عمر تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ میری سہیلی بن جائے گی اور پھر ہم گپ شپ لگا کر اور ہنسی مذاق میں گھر کا کام کر لیا کریں گے۔

یہ میری خام خیالی تھی۔ فرزانہ تھی تو میری ہم عمر لیکن اس کی طبیعت میں عمر کے مطابق شوخی ذرا بھی نہیں تھی۔ مجھے بعض اوقات ایسے محسوس ہوتا تھا کہ میں نے اُس کے ساتھ ہنسی مذاق کیا تو برا مان جائے گی۔ میری ساس کا تو یہ حال تھا کہ اس کی تیوری چڑھی رہتی تھی۔

ایک ہفتے بعد میں گھر آئی تو ماں نے پوچھا کہ کیسی گزر رہی ہے۔ میں نے ماں کو بتایا کہ کس حال میں گزر رہی ہے۔

"آپ تو کہتی تھیں کہ ان کے گھر میں بڑا اعلیٰ فرنیچر ہے" —— میں نے ماں سے کہا—— "ابا نے بھی کہا تھا کہ ڈرائنگ روم میں قالین بچھا ہُوا ہے۔ آپ کے کہنے کے مطابق ان کے پاس کار بھی ہے۔ ان کے گھر میں تو مجھے ایک ڈیکوریشن پیس بھی نظر نہیں آیا۔ قالین بھی نہیں ہے اور صوفہ بھی پرانے زمانے کا ہے"۔

ماں پہلے تو حیران ہوئی پھر اس نے یہ سمجھ کر کہ میں اپنے سسرال سے خوش نہیں ہوں' مجھے سمجھانا شروع کر دیا۔ میں اتنی بچی تو نہیں تھی کہ مجھے چھوٹی چھوٹی باتیں سمجھانے کی ضرورت پیش آتی۔ میں تو اس بات پر حیران تھی کہ جس ٹھاٹ باٹھ پر میرے گھر والے مَر مٹے تھے' وہ کدھر گئی ہے۔

"نسرین بیٹی!" —— ماں نے کہا—— "تیرا خاوند سرکاری افسر ہے اور مجھے لگتا ہے کہ نوکری ایمانداری سے کرتا ہے۔ تجھے چیزوں کی کیا پروا ہے۔ ہم نے تجھے صوفے' ڈیکوریشن پیس سب کچھ دیا ہُوا ہے۔ کار کے لئے پیسے بھی دیئے ہیں۔ اگر تُو کہے گی تو تجھے قالین بھی لے دوں گی۔ تُو اس گھر کو اپنا گھر سمجھ۔ دوسری لڑکیوں کی طرح جہیز کی چیزوں کو سنبھال کر رکھنے کی ضرورت نہیں۔ اپنی چیزیں نکال کر گھر کو اپنی مرضی کے مطابق سیٹ کر لو۔ ساس' سسر اور خاوند خوش ہو جائیں گے"۔

میں نے ماں کی اس نصیحت کو پلے باندھ لیا اور سسرال واپس آ کر پہلا کام یہ کیا

کہ فرزانہ سے کہا کہ گھر کو سیٹ کرتے ہیں۔ پہلے تو اس نے میری طرف حیرانی سے دیکھا پھر میرے ساتھ کام میں لگ گئی۔

"میرا خیال ہے کہ تمہارا بھائی ایماندار افسر ہے" —— میں نے فرزانہ سے کہا —— "یہ اچھی بات ہے' حلال کی آمدنی سے گھر میں بڑی برکت ہوتی ہے"۔

وہ حیرانی سے میرے منہ کی طرف دیکھنے لگی۔ ہم نے بڑی محنت سے صوفے سیٹ کئے۔ میں اپنے ڈیکوریشن پیس نکال کر سجا رہی تھی کہ میری ساس آئی۔ اس نے پہلے ڈرائنگ روم کی طرف اور پھر میری طرف دیکھا۔ ایسے لگتا تھا جیسے اسے یہ سجاوٹ پسند نہیں آئی۔

"امی جان!" —— میں نے اس کا دل جیتنے کے لئے کہا —— "دیکھیں' میں نے اور فرزانہ نے کتنی محنت کی ہے۔ آپ کو پسند ہے؟ امی کہتی تھیں کہ نیا قالین بھی لے دوں گی"۔

"تم ہم پر اپنے ماں باپ کی دولت کا رعب نہ جماؤ" —— ساس نے بے رخی سے کہا —— "جو کچھ جہاں ہے پڑا رہنے دو اور اپنے جہیز کی چیزیں واپس رکھ دو۔ ہمیں یہ طور طریقے پسند نہیں"۔

یہ بات سن کر میرا دل ٹوٹ گیا اور میں اپنے کمرے میں جا کر خوب روئی۔ نذیر (میرا خاوند) آیا تو اس نے میری سُوجی ہوئی آنکھیں دیکھ کر پوچھا کہ کیا بات ہے۔ میں نے اسے بتا دیا کہ میں نے اور فرزانہ نے گھر کی آرائش بڑی محنت سے کی تھی' لیکن امی ناراض ہو گئی ہیں۔

"امی ٹھیک کہتی ہیں" —— نذیر نے کہا —— "تم اپنی چیزوں کو پڑا رہنے دو۔ ہمارے گھر میں کس چیز کی کمی ہے"۔

یہ صرف ایک واقعہ ہے۔ اگر میں ساری باتیں تفصیل سے سناؤں تو کہانی لمبی ہو جائے گی لیکن آپ یقین کریں کہ ان میں سے ہر ایک بات نہایت دلچسپ تھی۔ میں نے دو ہفتوں میں ہی محسوس کر لیا کہ میرے سسرال والے نہایت پسماندہ لوگ ہیں اور کسی وجہ سے گھٹن کا شکار ہیں۔ اُن کو گھر کی آرائش اور جدید طور طریقے پسند نہیں اور نہ ہی ان کا ذہن قبول کرتا ہے۔ میں حیران تھی کہ میرا خاوند کیسا افسر

ہے جو اپنے گھر سے پسماندگی اور گھٹن کو ختم نہیں کر سکتا۔

ان لوگوں نے ایک اور حرکت کی جو میرے نزدیک گھٹیا تھی۔ اڑوس پڑوس کی عورتیں آتی تھیں تو مجھے ان سے ملنے نہیں دیا جاتا تھا۔ میری ساس اور فرزانہ مجھے ان عورتوں سے چھپا کر رکھتی تھیں۔ میں نے ایک روز ہنستے ہوئے فرزانہ سے کہا کہ یہ عورتیں مجھے کھا تو نہیں جائیں گی۔

"انہیں تم نہیں جانتیں بھابی!" —— فرزانہ نے کہا —— "یہ شیطان عورتیں ہیں۔ ان کا کام ہی یہ ہے کہ ایک کی بات دوسرے کو لگاتی ہیں اور پھر سارے محلے میں پروپیگنڈہ کرتی ہیں۔ ان کا مشغلہ یہی ہے کہ ایک گھر کے افراد کے درمیان غلط فہمی پیدا کر دیتی ہیں"۔

میں نے یہ بات بھی اپنے خاوند کو بتائی تو اس نے کہا کہ ان عورتوں سے ملنے کی ضرورت نہیں۔ میں نے کہا کہ میں گھر میں بیٹھی بیٹھی بور ہو جاتی ہوں۔ کبھی کبھی پڑوس میں چلی جایا کروں تو کیا حرج ہے لیکن نذیر نے مجھے سختی سے منع کر دیا۔

ان لوگوں نے تو مجھے پڑوسیوں سے چھپانے کی کوشش کی لیکن ایک روز موقع مل ہی گیا۔ یہ اس طرح ہُوا کہ نذیر کے رشتہ داروں میں کسی نوجوان کا انتقال ہو گیا۔ سب گھر والے جانے کی تیاری کرنے لگے تو میں نے کہا کہ میں بھی چلوں گی۔ مجھے انہوں نے منع کر دیا۔ میری ساس نے مجھے کہا کہ تم گھر میں ہی رہو' میں شام کو فرزانہ کو کسی کے ساتھ واپس بھیج دوں گی۔

ان کے جانے کے تھوڑی دیر بعد پڑوسیوں کی بہو آ گئی۔ نوجوان اور شگفتہ مزاج لڑکی تھی۔ فوراً ہی میرے ساتھ بے تکلف ہو گئی اور مجھ سے پوچھنے لگی کہ سناؤ کیسی گزر رہی ہے۔ میں نے اسے کہا کہ اچھی گزر رہی ہے۔

"مجھے لگتا ہے تم کسی اچھے گھر کی ہو" —— اس نے اچانک کہا —— "تمہارے ماں باپ نے کیا دیکھ کر اس گھر میں تمہارا رشتہ دیا تھا؟"

میں نے اسے بتایا کہ میرے ماں باپ جب یہ گھر دیکھنے آئے تھے تو اس گھر میں سب کچھ تھا اس لئے وہ دھوکہ کھا گئے۔

"ان کی اصلیت مجھ سے سنو" —— اس نے کہا —— "جب یہ لوگ تمہارا

رشتہ دیکھنے گئے تھے تو گاڑی مانگ کر لے گئے تھے۔ جب تمہارے ماں باپ ان کے گھر آئے تھے تو میرے جہیز کا صوفہ ان کے گھر میں بچھا تھا۔ قالین میرے خاوند کے شو روم سے ادھار مانگ کر لائے تھے۔ خود تو یہ فقیر سے لوگ ہیں۔ دو تین سال پہلے ہی اس آبادی میں آئے تھے۔ کسی کا مکان بن رہا تھا جو انہوں نے ادھورا ہی خرید لیا پھر آہستہ آہستہ اس کو مکمل کرتے رہے"۔

"آپ ان کے بارے میں خاصی معلومات رکھتی ہیں" —— میں نے ہنس کر کہا۔

"ابھی تو میں تمہیں اور بھی بہت کچھ بتاؤں گی" —— اس نے کہا —— "میرے بھائی نے تمہارے خاوند کے بارے میں تفتیش کی تھی..... یہ نذیر کے لئے میری چھوٹی بہن کا رشتہ مانگنے گئے تھے۔ انہوں نے ان کے بارے میں باہر سے پتہ کرایا اور جواب دے دیا"۔

میں نے اسے بتایا کہ میں نے نذیر کو گاڑی کے لئے نقد پیسے بھی دے دیئے ہیں۔ میرے ماں باپ نے سوچا تھا کہ افسر ہے' اسے جہیز میں گاڑی ملنی چاہئے۔

"اب یہ بھی سنو" —— میری اس پڑوسن نے کہا —— "نہ تمہیں گاڑی ملے گی اور نہ پیسے واپس ملیں گے۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ پیسے انہوں نے ولیمے پر خرچ کر دیئے ہیں۔ انہوں نے میرے خاوند سے ادھار مانگا تھا۔ میرا خیال ہے کہ تمہارے ماں باپ نے پہلے انہیں اشارہ دے دیا تھا کہ وہ جہیز میں نقد رقم دیں گے۔ انہوں نے میرے خاوند سے کہا کہ ولیمے والے دن ادھار واپس کر دیں گے اور انہوں نے واپس کر دیا۔ لوگ ہمیں کہتے ہیں کہ تم خوش قسمت ہو کہ انہوں نے تمہارا قرض واپس کر دیا ہے۔ یہ تو باپ سے بھی پیسے لے کر واپس نہیں کرتے۔ تم کہتی ہو' تمہارا خاوند افسر ہے۔ تم نے کبھی اسے کسی دفتر میں جاتے دیکھا ہے؟"

میری پڑوسن ٹھیک کہتی تھی۔ میرا خاوند گھر میں ہی پھرتا رہتا تھا۔ میں نے ایک دو بار اس سے پوچھا تھا کہ دفتر سے چھٹی لے رکھی ہے؟ اُس نے مجھے جواب دیا تھا کہ میں افسر ہوں' جب جی چاہتا ہے دفتر چلا جاتا ہوں' مجھے کوئی پوچھنے والا نہیں۔

اب میری پڑوسن مجھے بتا رہی تھی کہ نذیر کسی سرکاری دفتر میں ملازمت ضرور کرتا ہے لیکن وہ افسر نہیں۔ اس کے بھائی نے نذیر کے بارے میں پتہ کرایا تھا۔ وہ کسی بڑے دفتر میں ملازم تھا اور کسی ساتھی کو تھوڑے سے پیسے دے کر اپنا کام ٹھیکے پر کرا لیا کرتا تھا اور خود اِدھر اُدھر چھوٹے موٹے کام کرتا رہتا تھا۔ پہلے اس کا کسی ریکروٹنگ ایجنسی کے ساتھ حساب چلتا تھا جو پیسے لے کر لوگوں کو باہر بھجواتی ہے۔ اس نے لوگوں کے پیسے مار لئے اور وہ کام چھوڑ کر پراپرٹی کا کام شروع کر دیا۔ یہ لوگ اپنے پہلے محلے سے اسی لئے بھاگے تھے کہ جن لوگوں کے انہوں نے پیسے دینے تھے' انہوں نے ان کا گھر دیکھ رکھا تھا اور ان کا جینا بھی حرام کر رکھا تھا۔ نذیر نے بہرحال اتنے پیسے کما لئے کہ انہوں نے اس آبادی میں بنا بنایا گھر خرید لیا۔

میں نے جب اپنی پڑوسن کو بتایا کہ ہماری ملنے والی ایک معزز سی عورت نے بھی ان کی تعریف کی تھی۔ پڑوسن نے بے پروائی سے کہا کہ وہ یا تو ان کی ٹاؤٹ ہو گی یا ان لوگوں کو اچھی طرح جانتی نہیں ہو گی۔

شام کو میری ساس فرزانہ کے ساتھ ہی واپس آ گئی۔ میں نے اسے بتایا کہ پڑوسیوں کی بہو آئی تھی تو میری ساس کی تیوری چڑھ گئی۔

"وہ یہاں کیا لینے آئی تھی؟" —— میری ساس نے کہا —— "تمہیں اس سے ملنے کی ضرورت نہیں۔ وہ ٹھیک لڑکی نہیں"۔

"لیکن امی جان!" —— میں نے کہا —— "وہ اچھی لڑکی تھی۔ خوش اخلاق اور خوش مزاج تھی....."

"میں جانتی ہوں تمہاری طرح کی خوش مزاج لڑکیوں کو" —— ساس نے غصے سے کہا —— "تم ہمارے پڑوسیوں کو ہم سے زیادہ جانتی ہو" —— پھر اس نے ذرا نرم لہجے میں کہا —— "اگر تم اسے زیادہ سر چڑھاؤ گی تو یہ تمہارا گھر برباد کر دے گی۔ یہ نذیر کی اور تمہاری شادی پر خوش نہیں ہے۔ اس نے نذیر کو اپنی بہن کا رشتہ دینے کی کوشش کی تھی جو ہم نے اس لئے قبول نہیں کیا کہ وہ بھی اپنی اسی بہن کی طرح خوش مزاج تھی"۔

میری زبان پر بہت سی باتیں آگئیں جو میں نے روک لیں۔ مجھے ان لوگوں کی اصلیت کا پتہ چل گیا تھا۔ تین ماہ میں ہی میں نے اپنی یہ حیثیت محسوس کی کہ ان لوگوں کو میرے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں۔ ان کو میرے جہیز کے ساتھ دل چسپی تھی جو ابھی پیک تھا اور یہ لوگ مجھے کھولنے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ میری ساس تو مجھے اپنے جہیز کے کپڑے بھی نہیں پہننے دیتی تھی۔ اگر کبھی پہن لیتی تو وہ زہر اگلنا شروع کر دیتی۔ اس کی زبان پر ایک ہی فقرہ ہوتا ——— "بن ٹھن کر کہاں جا رہی ہو؟"

صرف یہی نہیں وہ اور بھی بہت سی گھٹیا باتیں کرتی تھی۔ میں وہ باتیں دہرا نہیں سکتی۔ خاوند سے بات کی تو اس نے جھڑک دیا اور کہا کہ میں اپنی ماں اور بہن کے خلاف کوئی بات نہیں سنوں گا۔ ایک دو بار ان کے قریبی رشتہ دار آئے۔ غریبی امیری تو خدا کے اختیار میں ہے، لیکن ان کو دیکھ کر صاف پتہ چلتا تھا کہ کوئی ورکشاپ میں مکینک ہے اور کوئی کھوکھے خوانچے والا ہے۔ ان کے یہ رشتہ دار مجھے ایسے دیکھتے تھے جیسے میں کوئی عجیب و غریب چیز ہوں۔ میرے ماں باپ بھی دو تین دفعہ آئے، لیکن ان لوگوں نے انہیں کوئی توجہ نہیں دی۔ میں نے تنگ آکر خاوند سے شکوہ کیا تو اس نے مجھے بہت گالیاں دیں اور گندی گندی باتیں کیں۔ میں نے اُسی وقت اپنا ایک اٹیچی کیس لیا، دو چار جوڑے کپڑوں کے لئے اور ماں باپ کے پاس آگئی اور صاف کہہ دیا کہ واپس نہیں جاؤں گی۔

ماں باپ بھی محسوس کر چکے تھے کہ ان کا فیصلہ غلط تھا۔ مجھ پر کسی نے بھی زور نہ دیا کہ میں واپس جاؤں۔ میں نے غلطی یہ کی تھی کہ اپنا زیور بھی وہیں چھوڑ آئی تھی۔ بھائیوں سے بات کی تو انہوں نے کہا کہ غم نہ کرو۔ مجھے خاوند نے پلٹ کر پوچھا بھی نہیں نہ ہی ساس سسر لینے آئے۔ بھائیوں نے طلاق اور جہیز کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ طلاق چند روز بعد ہی آگئی، لیکن جہیز نہ آیا۔ میرے بھائیوں نے مطالبہ کیا لیکن انہوں نے ٹال دیا۔ میں نے بھائیوں سے کہا کہ وہ لوگ کسی کی چیز لے کر واپس دینے کے قائل نہیں۔ فیصلہ ہُوا کہ جہیز کی واپسی کے لئے سول کورٹ میں مقدمہ کیا جائے۔

مقدمہ تو دائر ہو گیا لیکن پہلی تاریخ ہی تین ماہ بعد کی پڑی۔ اس کے بعد لمبی لمبی تاریخیں پڑتی رہیں۔ میرے بھائیوں نے وکیل سے بات کی۔ اس نے کہا کہ سول کیسوں میں تو ایسے ہی ہوتا ہے۔ کم از کم دو سال لگ جائیں گے۔ بہتر ہے آپس میں طے کر لو۔ میرے بھائیوں نے کسی معزّز آدمی کے ذریعے نذیر کے باپ سے بات کی۔ اس نے کہا کہ جہیز واپس کر دیں گے لیکن مجھے معلوم تھا کہ وہ بے وقار اور بے غیرت لوگ ہیں۔ جہیز کی خاطر جوتے کھا لیں گے، لیکن واپس نہیں کریں گے۔ میرے بھائیوں نے کہا کہ اگر قانون ہماری مدد نہیں کرے گا تو ہم اپنی مدد آپ کریں گے۔ والد صاحب نے کہا کہ عدالت کا فیصلہ ہو لینے دو، پھر جو جی میں آئے کرنا۔

عدالت کا فیصلہ کیا ہونا تھا۔ ہم لوگوں نے جہیز دے کر کے کاغذ پر اس کی رسید تو نہیں لی تھی کہ ہمارا کیس مضبوط ہوتا۔ والدین نے بھائیوں کو بھی ٹھنڈا کر لیا کہ بھول جاؤ۔ اب استعمال شدہ جہیز لے کر کیا کرو گے۔

والدین تو بھول گئے، لیکن میں نہ بھول سکی۔ میرے اندر آگ لگی ہوئی تھی اور میں کڑھتی رہتی تھی۔ مجھے خدا سے بھی شکوہ ہونے لگا تھا کہ میرے ماں باپ کی حلال کی کمائی تھی، پھر اتنا قیمتی جہیز ہمارے ہاتھ سے نکل کیوں گیا۔ میری ماں نے مجھے تسلّی دی کہ فکر نہ کرو۔ جب تمہاری شادی کریں گے تو اس سے اچھا جہیز بنا دیں گے۔ مجھے تو وہ تسلّی دے رہی تھی لیکن مجھے مجھے پتہ تھا کہ میری ماں کا بھی دل ٹوٹ گیا ہے۔ وہ اکیلی بیٹھی روتی رہتی تھی۔ گھر کا ماحول ایسا بن گیا تھا جیسے کوئی مر گیا ہو۔

جہاں تک میرا تعلق ہے، مجھے تو شادی کے نام سے نفرت ہو گئی تھی۔ میں تصوّر بھی نہیں کر سکتی تھی کہ دنیا میں ایسے شیطان مرد بھی ہوتے ہوں گے۔ میرے اندر ایک آگ سی لگی ہوئی تھی اور کبھی کبھی میرا دل چاہتا تھا کہ دیواروں سے ٹکریں ماروں مجھے اپنی بے بسی پر غصہ بھی آتا تھا اور رونا بھی۔ میرے اندر انتقام کا جذبہ بیدار ہو گیا۔

میرے بھائی میری حالت دیکھ کر پریشان ہو رہے تھے۔ انہوں نے مجھے مشورہ

دیا کہ میں کالج جانا شروع کر دوں اور اپنی تعلیم مکمل کروں۔ یہ مشورہ اچھا تھا۔ میں نے اپنی ایک دو ہم جماعت سہیلیوں سے مشورہ کیا۔ انہوں نے کہا کہ وہ کالج سے معلوم کر کے مجھے بتائیں گی۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ ابھی میرا نام نہیں کٹا اور پچھلے چار مہینوں کی فیس ادا کر کے دوبارہ کالج جوائن کر سکتی ہو۔ اس طرح میں نے کالج جانا شروع کر دیا۔

میری یہ سہیلیاں اچھے خاندان کی شگفتہ مزاج لڑکیاں تھیں۔ انہوں نے مجھے طلاق ملنے پر پہلے تو افسوس کا اظہار کیا پھر جب میری ساری روداد سنی تو انہیں بھی غصہ آگیا۔ میری ایک سہیلی نے اعلان کیا کہ وہ نذیر کو چوک میں جوتے مارے گی۔ دوسری سہیلی نے کہا کہ وہ فرزانہ کو بدنام کرا دے گی۔ تیسری سہیلی نے مجھے مشورہ دیا کہ تم خود انتقام لو۔ یہ نوجوانی کی جذباتی کیفیت میں تھیں۔ ہم کر کچھ بھی نہیں سکتی تھیں۔ یہی تو عورت کی مجبوری ہے کہ وہ مردوں کی طرح غنڈہ گردی نہیں کر سکتی۔ میری بات تو دوسری ہے' میرا خاندان بھی غنڈہ گردی نہیں کر سکتا تھا لیکن جب مجھے اپنے لاکھوں کے جہیز کا خیال آتا تو میرے دل میں آگ بھڑک اٹھتی تھی۔

میں نے اس ذہنی کیفیت میں اپنی پڑھائی جاری رکھی۔ طلاق کے پانچ ماہ بعد کسی نے خبر دی کہ فرزانہ کی شادی ہو رہی ہے۔ شادی بھی ہمارے ساتھ والے محلّے میں اُس آدمی سے ہو رہی تھی جس کا رشتہ میرے لئے آیا تھا اور میرے ماں باپ نے نذیر کے ساتھ رشتہ طے کرنے کے لئے اس آدمی کو جواب دے دیا تھا۔ اس آدمی کا نام عظمت تھا۔ میں نے اسے دیکھا ہُوا تھا۔ شریف آدمی تھا اور اُس کا گھرانہ بھی معزّز تھا۔

میں نے اپنی سہیلیوں سے ذکر کیا تو ایک لڑکی نے ہنس کر کہا کہ ہمت ہے تو عظمت کو پھنساؤ۔ میں نے کہا کہ میں بُرے کام میں نہیں پڑنا چاہتی۔ میری سہیلیوں کو یہ آئیڈیا اتنا پسند آیا کہ انہوں نے مجھ پر زور دینا شروع کر دیا کہ بُرائی بے شک نہ کرو' لیکن عظمت کے ساتھ دوستی لگا کر اسے اپنے پیچھے پیچھے پھراؤ تاکہ وہ اپنی بیوی فرزانہ سے متنفّر ہو جائے۔ میرا دل بھی یہی چاہتا تھا کہ میں فرزانہ کے

خاوند کو گمراہ کروں اور شیطانی رول ادا کروں لیکن میرا دل نہیں مانتا تھا۔ میں کبھی کبھی سوچتی تھی کہ فرزانہ بھی آخر میری طرح کی بے بس لڑکی ہے۔ اگر اس کی ازدواجی زندگی تباہ ہوئی تو یہ گناہ میرے نام لکھا جائے گا لیکن ہونی ہو کر رہتی ہے۔

عظمت خود ہی میرے راستے میں آگیا۔ میں ایک روز کالج جانے کے لئے بس سٹاپ پر کھڑی تھی کہ بادل گھِر کر آگئے اور ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہو گئی۔ میں نے سوچا کہ رکشے میں کالج چلی جاتی ہوں۔ وہ صبح کا وقت تھا اور رکشہ مل نہیں رہا تھا۔ آخر ایک رکشہ بس سٹاپ سے ذرا آگے جا کر رکا۔ میں بھاگ کر گئی لیکن اس میں پہلے سے کوئی بیٹھا تھا۔ اس آدمی نے مجھے آواز دے کر کہا کہ نسرین صاحبہ' آجائیں۔

میں نے دیکھا تو وہ عظمت تھا۔ میں اسے پہچانتی تھی' لیکن یہ بات میں نے اس پر ظاہر نہ کی۔

"نسرین صاحبہ!" —— عظمت نے کہا —— "آپ مجھے نہیں جانتیں' لیکن میں آپ کو جانتا ہوں اس لئے لفٹ آفر کر رہا ہوں۔ میں آپ کو کالج اتار دوں گا۔ آپ مجھے غلط نہ سمجھیں"۔

ایک تو اوپر سے بارش ہو رہی تھی اور دوسرے میں بس سٹاپ پر اس سے بحث نہیں کر سکتی تھی۔ میں رکشے میں بیٹھ گئی۔

"میں آپ کے ساتھ والے محلے میں رہتا ہوں" —— اس نے بات شروع کرتے ہوئے کہا —— "کئی بار آپ کو کالج جاتے ہوئے دیکھا ہے۔ آپ کو شاید سن کر حیرت ہو کہ میری شادی اس گھر میں ہوئی ہے جہاں آپ کی شادی ہوئی تھی"۔

بے اختیار میرے منہ سے نکل گیا کہ فرزانہ کے ساتھ کیسی گزر رہی ہے۔ اس نے اداس سی مسکراہٹ سے کہا کہ سمجھ لو گزر رہی ہے۔ میں سمجھ گئی کہ اس بیچارے کی زندگی کیسی گزر رہی ہو گی۔ میں فرزانہ کو اچھی طرح جانتی تھی۔ نادانستہ طور پر میری نظر اس کے ہاتھ پر پڑی تو مجھے اپنی نظروں پر یقین نہ آیا۔ اس کے ہاتھ میں وہی انگوٹھی تھی جو میں نے نکاح کے وقت نذیر کو پہنائی تھی۔ اس انگوٹھی کو میں اچھی طرح پہچانتی تھی۔ یہ میری ماں مجھے ساتھ لے کر خریدنے گئی تھی۔ یہ

انگوٹھی دیکھ کر میرے دل میں پھر آگ سلگ اٹھی۔

اس نے کوئی فالتو بات نہ کی۔ بڑی شرافت سے مجھے کالج اتارا اور اپنے دفتر چلا گیا۔ اس کے بعد اس کے ساتھ بس سٹاپ پر تین چار ملاقاتیں ہوئیں۔ مجھے ایسے محسوس ہُوا جیسے وہ مجھ سے کوئی بات کرنا چاہتا ہے۔ مجھے اندازہ تھا کہ وہ بیوی کے ہاتھوں پریشان ہوگا اور یہی بات کرنا چاہتا ہوگا۔ میں نے سہیلیوں سے بات کی تو انہوں نے مشورہ دیا کہ اسے اور گمراہ کرو۔

میری اپنی حالت یہ ہو رہی تھی کہ یہ سوچ کر کہ وہ کن لوگوں میں جا پھنسا ہے' مجھے اس سے ہمدردی ہونے لگی۔ لڑکیوں کی حوصلہ افزائی سے میں نے اسے اشارہ دے دیا کہ میں اس سے باہر ملنے کو تیار ہوں۔ اس نے ایک باغ میں ملاقات کی دعوت دی جو میں نے تھوڑی سی ہچکچاہٹ کے بعد قبول کرلی۔

اس وقت مجھے ذرا ڈر نہیں تھا کہ کوئی دیکھ لے گا اور اس وقت میرے دل میں انتقام کا جذبہ بھی نہیں تھا۔

باغ میں اس نے کھل کر [illegible] کہ فرزانہ کے ساتھ اس کی زندگی کس طرح گزر رہی ہے۔ ابھی ان کی شادی [illegible]ن مہینے بھی نہیں ہوئے تھے کہ عظمت اس سے بیزار ہو گیا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ فرزانہ اس کی ماں کے ساتھ بدسلوکی کرتی ہے۔ گھر میں کوئی مہمان آجائے تو ان کے ساتھ صحیح طرح نہیں بولتی۔ عظمت کی شادی شدہ بہنیں آجائیں تو اس کی تیوری چڑھ جاتی ہے اور وہ اپنے کمرے میں بند ہو جاتی ہے۔ اس نے آدھے سے زیادہ زیور اپنی ماں کے پاس رکھوایا ہُوا ہے۔ عظمت کو اندازہ تھا کہ یہ گھٹے ہوئے ماحول کی پروردہ ہے اس لئے وہ کبھی اُس کو کھانا کھلانے کے لئے کسی ہوٹل میں لے جاتا' کبھی ویسے ہی کسی دوست کے گھر لے جاتا۔ اس کا خیال تھا کہ باہر کی فضا میں اس کی ذہنی گھٹن دُور ہو جائے گی' لیکن فرزانہ میں کوئی مثبت تبدیلی پیدا نہ ہوئی۔

"مجھے ایک بات کی سمجھ نہیں آتی" ___ عظمت نے کہا ___ "وہ مجھ سے پیسے بٹورتی رہتی ہے اور کہیں خرچ بھی نہیں کرتی۔ پتہ نہیں ان پیسوں کا وہ کیا کرے گی"۔

"یہ بات میں آپ کو سمجھاتی ہوں" ___ میں نے کہا ___ "وہ آپ سے پیسے لے کر اپنے ماں باپ کو دے آتی ہے۔ میں ان لوگوں کی فطرت کو بڑی اچھی طرح سمجھتی ہوں"۔

اگلی ملاقات میں مَیں نے عظمت کو تفصیل سے سنایا کہ شادی کے بعد میرے ساتھ کیا سلوک ہُوا تھا۔ ہم دونوں کا درد مُشترک تھا اس لئے ہم دونوں گھنٹوں بیٹھے باتیں کرتے رہتے تھے۔ اس کے بعد بھی کئی ملاقاتیں ہوئیں اور میں نے صاف طور پر محسوس کیا کہ میرے دل میں عظمت کے لئے چاہت کا جذبہ پیدا ہو رہا ہے۔ میں نے یہ بات اس پر ظاہر نہ کی' لیکن ہم دونوں محسوس کرتے تھے کہ ہم ایک دوسرے میں کشش محسوس کر رہے ہیں اور ایک ملاقات کے بعد دوسری ملاقات کے لئے تشنگی بڑھ جاتی ہے۔

ہمارے بی اے کے امتحان ختم ہوئے تو سہیلیوں نے تفریح کا پروگرام بنایا۔ ان دنوں ایک مزاحیہ ڈرامہ لگا ہُوا تھا۔ ہم ماں باپ سے اجازت لے کر وہ دیکھنے چلی گئیں۔ ابھی ہال کا دروازہ نہیں کھلا تھا اور سب لوگ باہر کھڑے تھے۔ اس ہجوم میں مجھے عظمت نظر آیا۔ اس کے ساتھ فرزانہ تھی۔ میں نے سہیلیوں کو بتایا تو وہ کہنے لگیں چلو ان کو گھیرتے ہیں۔ میں اس کے لئے تیار نہیں تھی لیکن میں نے غور سے فرزانہ کو دیکھا تو مجھے طیش آگیا۔ میں نے لڑکیوں کو کہا کہ اس نے میرا سُوٹ پہنا ہُوا ہے جو میرا بھائی باڑے سے لایا تھا۔ یہ میرا پسندیدہ سوٹ تھا جو میری ساس نے مجھے نہیں پہننے دیا تھا۔ میں ذرا آگے ہو گئی تو دیکھا کہ ہار اور جُھمکے بھی میرے ہی تھے۔ میں نے لڑکیوں سے کہا' چلو۔ ہم ان تک پہنچ گئیں۔ میں نے عظمت کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ فرزانہ کا حال احوال پوچھا۔ وہ بھی بڑے اچھے طریقے سے ملی۔

"اچھا!" ___ میں نے اس کے ہار پر انگلی رکھ کر کہا ___ "یہ تو وہی ہے میرے جہیز والا!..... اور یہ جُھمکے بھی میرے ہی ہیں"۔

میری یہ بات سن کر اس کا رنگ اُڑ گیا اور اُس نے اپنے خاوند کی طرف دیکھا۔ وہ دوسری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے ذرا زور سے کہا کہ یہ تو سوٹ بھی وہی ہے جو

میرا بھائی میرے جہیز کے لئے باڑے سے لایا تھا۔

"تمہارا کیا خیال ہے کہ میرے ماں باپ غریب ہیں؟" — فرزانہ نے کہا۔

میری ایک سہیلی بڑی شیطان تھی۔ وہ تیزی سے آگے بڑھی۔

"ہم نے کب کہا ہے کہ وہ غریب ہیں" — اس نے کہا — "لیکن وہ دوسروں کے مال پر رئیس بنے ہیں"۔

فرزانہ نے جب دیکھا کہ اس کا خاوند بھی متوجہ ہو رہا ہے تو اس نے گرمی دکھانے کی کوشش کی۔ مجھے بھی غصہ آگیا۔ میں نے اس کے خاوند کا بایاں ہاتھ پکڑ کر اسے کہا۔

"اور یہ دیکھو، یہ انگوٹھی!" — میں نے ذرا اونچی آواز میں کہا — "یہ بھی وہی ہے جو میرے ماں باپ نے تمہارے بھائی کو دی تھی"۔

ہم لوگوں نے اتنا شور مچایا کہ لوگ اکٹھے ہو گئے۔ فرزانہ نے اپنے خاوند کا ہاتھ پکڑا اور یہ کہہ کر تم مجھے کن بدمعاشوں میں لے آئے ہو، اسے وہاں سے لے گئی۔

ڈرامہ تو ہم نے اب کیا دیکھنا تھا۔ یہی تفریح کافی تھی۔ فرزانہ کو ذلیل کر کے میرے کلیجے میں ٹھنڈک پڑ رہی تھی۔

عظمت مجھ سے اگلے ہی روز ملا اور کہنے لگا کہ اس نے گھر جا کر فرزانہ کو خوب ڈانٹا ہے کہ تم نے مجھے سب کے سامنے ذلیل کروایا۔

"یہ بھی کوئی بے غیرت اور بدتمیز عورت ہے" — عظمت نے بتایا — "میری یہ بات سن کر شرمندہ ہونے کے بجائے میرے گلے پڑ گئی۔ ایسے لگتا تھا جیسے لڑائی کے لئے پہلے ہی تیار ہے۔ آج صبح ماں نے پوچھا کہ رات کو کیا شور تھا۔ میں نے انہیں بتایا تو وہ کہنے لگیں کہ عورتیں مجھے پہلے ہی بتا چکی ہیں کہ جو سامان فرزانہ لے کر آئی ہے۔ یہ سارے کا سارا نسرین کا جہیز تھا جو ان لوگوں نے ہضم کر لیا تھا"۔

میں نے عظمت کو اپنے سامان کی تفصیل بتائی تو وہ کہنے لگا کہ یہ بالکل وہی ہے۔

"اس عورت نے میری زندگی عذاب بنا دی ہے" — عظمت نے کہا — "مہینے میں ایک ہفتے کے لئے ماں باپ کے گھر چلی جاتی ہے اور بتاتی بھی نہیں کہ جا رہی ہوں۔ ایک ہفتہ رہ کر پھر فون کرتی ہے کہ آ کر لے جاؤ۔ میں تو اب اس کو طلاق دے دوں گا"۔

میں یہ بات سن کر خوش تو ہوئی لیکن میں نے اوپرے دل سے عظمت کو کہا کہ فرزانہ کو موقع دو، شاید سدھر جائے۔

"اب اس کا کوئی امکان نہیں" — عظمت نے کہا — "اب یہ میرے گھر میں رہی تو یا میں اُسے قتل کر دوں گا یا خودکشی کر لوں گا"۔

یہ اس کی بیزاری کی انتہا تھی۔ کوئی مرد اتنا خوش طبع اور زندہ دل ہو اور اسے کوئی تنگ نظر جھگڑالو بیوی مل جائے اور پھر اوپر سے ایسے سسرال مل جائیں تو وہ ایسے ہی بیزار ہُوا کرتا ہے۔ اب مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ عظمت میری طرف مائل ہو گا اور ایسے ہی ہوا۔ اُس نے اگلی ملاقات میں ایک بات تو یہ بتائی کہ اسے پتہ چلا تھا کہ فرزانہ اپنا سارا زیور ماں کے پاس چھوڑ آئی ہے۔ عظمت نے اسے کہا کہ زیور واپس لاؤ ورنہ طلاق دے دوں گا اور تمہارے ماں باپ کو سارے شہر میں بدنام کر دوں گا۔ وہ گئی اور سارا زیور لے آئی۔ عظمت نے زیور اپنے قبضے میں رکھ لیا۔

"میں اس کو طلاق دے رہا ہوں" — عظمت نے کہا اور پھر پہلی دفعہ میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہنے لگا — "مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے اور ایمانداری کی بات یہ ہے کہ میں اسے تمہاری وجہ سے طلاق دے رہا ہوں اور اگر تم نہ ملتیں تو شاید میں اس عذاب کو برداشت کرتا رہتا..... بولو میرے ساتھ شادی کرو گی؟"

میں نے سر جھکا لیا۔

پھر پتہ چلا کہ عظمت نے فرزانہ کو گھر بھجوایا اور بعد میں طلاق بھی بھیج دی۔

چار دن بعد عظمت کی ماں اور بڑی بہن ہمارے گھر میں آئیں۔ میں نے اپنی ماں کو پہلے ہی ساری بات بتا دی تھی۔ ماں کے ذریعے بھائیوں اور ابّا کو بھی پتہ چل گئی تھی۔ دو روز بعد میرا نکاح ہُوا اور نکاح کے وقت ہی رخصتی کی تاریخ طے ہونے لگی۔ میرے والد صاحب نے عظمت کے والد صاحب سے تھوڑی سی مہلت مانگی

تاکہ جہیز تیار ہو سکے۔

"اس کی ضرورت نہیں" — عظمت کے والد صاحب نے ہنس کر کہا — "نسرین کا جہیز پہلے ہی ہمارے گھر پہنچ گیا ہے"۔

بعد میں مجھے پتہ چلا کہ نذیر اور اس کا باپ عظمت سے جہیز کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ ایک روز عظمت کے محلے سے ایک لڑکا آیا اور کہنے لگا کہ نذیر اپنے دو تین رشتہ داروں کے ساتھ عظمت کے گھر بیٹھا ہے اور دھمکیاں دے رہا ہے۔ میرے تینوں بھائی گھر میں تھے۔ وہ بھاگتے ہوئے گئے۔

بھائیوں نے واپس آ کر بتایا کہ انہوں نے نذیر کا دماغ درست کر دیا ہے۔ انہوں نے اسے یہ کہا تھا کہ جس کا جہیز تھا اسے واپس مل گیا ہے۔ اس نے جب تیزی دکھانے کی کوشش کی تو میرے بڑے بھائی نے کہا کہ ابھی تو تُو نے ہماری نقد رقم بھی واپس کرنی ہے۔ انہوں نے اسے کہا کہ اب ہم تم سے وہ رقم بھی واپس لیں گے۔ میرے بھائی کا ایک دوست ان دنوں نیا نیا ایس ایس پی لگا تھا۔ بھائی نے جب اس کا نام لیا تو وہ لوگ ٹھنڈے پڑ گئے اور واپس چلے گئے۔

نکاح سے ٹھیک ایک ماہ بعد عظمت مجھے بیاہ کر لے گیا۔ میں نے جہیز کھلوا کر دیکھا۔ ہر چیز اپنی اصلی حالت میں تھی۔ قدرت کے قانون نے میرے ساتھ انصاف کر دیا اور مَیں نے خدا کی ذات سے جو شکوے کئے تھے وہ رائیگاں نہیں گئے تھے۔

✥

حادثے کے بعد

ہوائی جہاز کریش ہوتے ہیں، مسافر مارے جاتے ہیں اور بعض زخمی ہو کر بچ جاتے ہیں۔ ریل گاڑیاں ٹکراتی ہیں۔ ایسے ہی حادثے بسوں کے بھی ہوتے ہیں۔ اخباروں میں صرف یہ خبر آتی ہے کہ ہوائی جہاز گر پڑا یا ریل گاڑیوں کی یا بسوں کی ٹکر ہو گئی اور اتنے مسافر ہلاک، اتنے زخمی ہو گئے۔ اس خبر کے ساتھ ایک خبر اور ہوتی ہے کہ حکومت ہلاک شدگان کو معاوضہ دلوائے گی اور اس کے بعد یہ خبر اگلے روز کی سینکڑوں خبروں میں گم ہو جاتی ہے اور لوگ بھول جاتے ہیں کہ کوئی خوفناک حادثہ ہُوا تھا۔ اب تو یہ عالم ہے کہ جس روز ایسے کسی حادثے کی خبر نہ ہو تو لوگ حیران ہوتے ہیں۔

ہمارے ایک اخبار نویس بزرگ کہا کرتے ہیں کہ ہمارے لئے یہ بھی ایک خبر ہوتی ہے کہ گزشتہ روز کوئی حادثہ نہیں ہُوا۔ حادثے کی خبر تو اخبار میں پڑھنے والے پڑھ لیتے ہیں اور دوسروں کو سنا بھی دیتے ہیں اور یوں پتہ چلتا ہے کہ یہ کہانی یہیں پر ختم ہو جاتی ہے کہ زخمیوں کو فلاں ہسپتال تک پہنچا دیا گیا اور لاشیں وارثوں کے حوالے کر دی گئیں، لیکن اصل کہانی اُس وقت شروع ہوتی ہے جب لوگ ایک حادثے کی خبر کو ذہن سے اتار دیتے ہیں۔

کچھ عرصہ گزرا شاید "حکایت" میں ہی ان حادثوں کے بارے میں ایک مضمون پڑھا تھا کہ اصل کہانیاں تو حادثے کے بعد شروع ہوتی ہیں اور ان کہانیوں سے لوگ اس لئے بے خبر رہتے ہیں کہ یہ دردناک اور سنسنی خیز ڈرامے چار دیواری کے اندر ہوتے ہیں۔ مثلاً کسی کنبے کا کمانے والا فرد مر گیا یا حادثے میں بازوؤں یا ٹانگوں یا بینائی سے محروم ہو گیا تو اس کے کنبے کو زندہ رہنے کے لئے کیسے کیسے پاپڑ بیلنے پڑے۔

اُس نوجوان لڑکی کو ذہن میں لائیں جس کی شادی طے ہو چکی ہو اور بس یا ریل کے حادثے میں اسے ایسی چوٹیں آئی ہوں کہ اس کا چہرہ مسخ ہو گیا ہو یا صرف ایک آنکھ ہی ضائع ہو گئی ہو تو اس کا مستقبل کیا ہو گا۔ آپ ذرا تصوّر میں لاتے چلے جائیں تو ایک حادثے میں سے آپ کو درخت کی شاخوں کی طرح کئی حادثے نکلتے نظر آئیں گے۔ ان حادثات میں گورنمنٹ کا پچاس ہزار کا چیک ایسے ہی ہوتا ہے جیسے کہتے ہیں' اونٹ کے منہ میں زیرہ۔

میں سنی سنائی باتیں نہیں کروں گا۔ میں خود ایک حادثے کا شکار ہوں اور وہ کہانی سنانا چاہتا ہوں جس نے اس حادثے میں سے جنم لیا تھا۔ میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ یہ آپ بیتی صرف میری نہیں' چاردیواری کی دنیا میں حادثوں کے معذور کیے ہوئے لوگ معلوم نہیں کیسے کیسے مسائل میں سے گزرتے ہیں۔

مجھ سے یہ نہ پوچھیں کہ میرا حادثہ کب اور کہاں ہُوا تھا۔ میں جو بات سنانے لگا ہوں اس پر توجہ دیں۔ ہم دو بھائی ہیں۔ دونوں کی شادی ایک ہی روز ہوئی تھی۔ باپ دادا کی اپنی دو منزلہ حویلی ہے۔ والد صاحب بھی بڑے پائے کی ملازمت کرتے تھے۔ بھائی بھی ملازم تھا۔ میں نے ابھی ایف اے ہی کیا تھا کہ والد صاحب نے مجھے بھی ملازم کرا دیا۔ دونوں بھائیوں کی شادی ہوئی تو بڑے بھائی کو اوپر کی منزل دے دی گئی اور وہ آزادانہ زندگی بسر کرنے لگا۔ ان کا باورچی خانہ اوپر ہی تھا۔ ویسے ہمارا آپس میں بہت پیار محبت تھا۔ باورچی خانے الگ ہونے کے باوجود معلوم ہوتا تھا جیسے ہم اکٹھے ہی رہ رہے ہوں۔

شادی کے بعد میرا ایک بیٹا پیدا ہُوا۔ اسی کے لگ بھگ اللہ نے میرے بڑے بھائی کو بھی بیٹا عطا کر دیا۔ میرا ایک ہی بیٹا رہا اور کچھ عرصے بعد بھائی کے ہاں ایک بچی پیدا ہوئی۔ میرا بیٹا تقریباً" تین سال کا تھا جب مجھے بذریعہ بس پچاس ساٹھ میل کا سفر کرنا پڑا۔ میرے ایک دوست کی شادی تھی۔ میں بس میں بیٹھا۔ سواریاں تھوڑی تھیں۔ بس اڈے سے نکلی تو پیچھے سے ایک اور بس اس سے آگے نکل گئی۔ اس میں سواریاں مزید کم تھیں۔ ہماری بس کے ڈرائیور نے شوٹ ماری اور اس سے آگے نکل گئی' اور جب دونوں بسیں شہر سے نکلیں تو ان کی باقاعدہ ریس

لگ گئی۔

ہمارا ڈرائیور خاصا جوشیلا اور بیوقوف لگتا تھا۔ دونوں بسوں کی رفتار بلامبالغہ اسّی میل تھی۔ ایک جگہ ایسی تھی کہ سڑک کے ساتھ خاصا کیچڑ تھا۔ کیچڑ سے آگے بجری کا ڈھیر پڑا تھا۔ ہمارے ڈرائیوز نے اس طرح دوسری بس کو اوورٹیک کیا کہ پہلے بس کیچڑ میں گئی اور یوں دائیں بائیں ہلی جیسے پھسل کر الٹ جائے گی۔ اگلی بس والا راستہ دینے کی بجائے اور دائیں طرف ہو گیا۔ آگے بجری کا ڈھیر تھا۔ ہمارے ڈرائیور نے بس کو اس طرح نکالا کہ ایک طرف سے ٹائر بجری کے ڈھیر میں پھنسے اور بس کی دوسری سائیڈ دوسری بس کے ساتھ ٹکراتے ٹکراتے بچی۔ اتنا زیادہ خطرہ مول لے کر ہمارا ڈرائیور بس نکال کر لے گیا۔

مسافروں نے چیخ وپکار شروع کر دی۔ ڈرائیور نے اپنے کنڈکٹر کو آواز دے کر کہا —"انہیں چُپ کرا اوئے! میرا دماغ کھا رہے ہیں"۔

"او بھائیو!" — کنڈکٹر مسافروں سے مخاطب ہُوا — "ہم نے بس بھرنی ہے۔ تمہارا خیال رکھیں یا اپنے پیٹ کا"۔

ایک دو مسافر اس کے ساتھ جھک جھک کرتے رہے اور باقی سب نے اللہ کو یاد کرنا شروع کر دیا۔ ایک جگہ بس رکی کیونکہ دو تین سواریاں کھڑی تھیں۔ پیچھے والی بس آگے نکل گئی۔ ہمارے ڈرائیور نے کلی دبائی اور اس نے بس کو ہوائی جہاز بنا دیا۔ یہ تو صاف نظر آ رہا تھا کہ جس طرح یہ دونوں بسیں ایک دوسری کو اوورٹیک کر رہی ہیں' یہ کوئی تماشہ دکھا کر ہی رہیں گی۔ دونوں ڈرائیوروں کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ ایک دوسرے سے ریس جیتنا چاہتے ہیں اور سواریوں کے ساتھ انہیں کوئی ہمدردی نہیں۔ ایک بار دوسری بس ہماری بس کو اوورٹیک کر رہی تھی تو میں نے اُس کے ڈرائیور کا چہرہ دیکھا۔ اس کے چہرے پر قہر اور غضب تھا۔

شاید ہر مسافر دل میں دعا کر رہا تھا کہ اللہ ان ڈرائیوروں کو ٹھنڈا کرے اور حادثہ نہ ہو۔ ایسی ہی دعا میں بھی کر رہا تھا۔ لیکن کچھ ایسا یقین بھی تھا کہ حادثہ ضرور ہو گا۔ میں نے دل ہی دل میں ریہرسل شروع کر دی کہ حادثہ ہُوا تو میں اگلی سیٹ کو پکڑ کر یوں بیٹھوں گا تاکہ میرا سر یا سینہ وغیرہ اگلی سیٹ کی پشت کے ساتھ نہ

ٹکرائے، لیکن یہ توقع نہیں تھی کہ حادثہ فوراً" اور بغیر اطلاع ہو جائے گا۔ مجھے ایک خوفناک دھماکہ یاد ہے اور پھر یہ یاد ہے کہ جیسے کسی نے مجھے اٹھا کر بڑی ہی زور سے دیوار کے ساتھ پٹخ دیا تھا۔

ہوش آیا تو میں ایک ہسپتال میں تھا۔ میرے پاس میرے والد صاحب اور بڑا بھائی کھڑے تھے۔ یہاں میں یہ بتا دوں کہ میرا بڑا بھائی مجھ سے ڈیڑھ سال بڑا تھا۔ اسی لئے لوگ ہمیں جڑواں بھائی کہا کرتے تھے۔ مجھے ایسے محسوس ہُوا جیسے میں اپنے والد صاحب اور بھائی کو خواب میں دیکھ رہا ہوں۔ میں نے اپنے والد صاحب کی آنکھوں میں آنسو دیکھے۔

میں پوری طرح ہوش میں آیا تو میں نے دایاں ہاتھ اوپر اٹھانے کی کوشش کی۔ مجھے اپنا ہاتھ اٹھتا نظر نہ آیا بلکہ بازو میں کہنی کے مقام پر بڑا شدید درد ہُوا۔ میں نے اس طرف دیکھا تو کہنی پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ اس سے آگے بازو غائب تھا۔ میرا دایاں بازو حادثے میں کٹ گیا تھا اور ہسپتال میں ڈاکٹر نے کہنی سے کاٹ دیا تھا۔ بس ذرا سی کھال اٹکی ہوئی تھی۔

میں نے ہلنے جلنے کی کوشش کی تو پتہ چلا کہ بائیں طرف کا سارا جسم یا شاید کولہے سے پاؤں تک پوری ٹانگ بیکار ہو گئی ہے۔ میں نے یہ تو صاف طور پر محسوس کیا کہ میرا دماغ کام نہیں کر رہا۔ کبھی دماغ بالکل بے حِس ہو جاتا تھا اور کبھی میں پوری طرح بیدار ہو جاتا اور اپنے جسمانی نقصان کو دیکھ کر رو پڑتا تھا۔

"ابا جان!" —— میں نے اُسی روز یا ایک دو روز بعد والد صاحب سے کہا —— "مجھے صحیح صحیح بتا دیں کہ مجھے جسمانی نقصان کتنا پہنچا ہے"۔

والد صاحب اس کے جواب میں بول ہی نہ سکے۔ پھر وہ سِسک سِسک کر رونے لگے۔

"ابا جان!" —— میرے بھائی نے والد صاحب کو ذرا غصیلی سی آواز میں کہا —— "کیا کر رہے ہیں آپ؟ ہمارا فرض ہے کہ اس کا دل مضبوط کریں اور حوصلہ بڑھائیں۔ آپ تو اس کا دل توڑ رہے ہیں" —— بھائی مجھ سے مخاطب ہُوا اور حوصلہ افزا لہجے میں کہنے لگا —— "میری بات سن نذیر بھائی! اللہ کو ایسے ہی منظور

تھا۔ اس حقیقت کو اب قبول کر لو کہ تمہارا دایاں بازو کہنی سے کٹ گیا ہے۔ تمہاری بائیں ٹانگ کے بارے میں ڈاکٹر نے بتایا ہے کہ وقتی طور پر بیکار سی ہو گئی ہے کیونکہ اس کی کسی رگ پر بڑی سخت چوٹ لگی ہے۔ بڑے ڈاکٹر نے بھی تسلّی دی ہے کہ چار پانچ مہینے تک ٹھیک ہو جائے گی۔ اس کے علاوہ تمہارے سر میں ایک چوٹ آئی ہے۔ تم جو تھوڑی تھوڑی دیر کے لئے غنودگی یا غشی یا غوطے میں چلے جاتے ہو، یہ اسی کی وجہ سے ہے اور ڈاکٹر نے کہا ہے کہ یہ ٹھیک ہو جائے گا"۔

مفلوج یا معذور ہو جانے کی حقیقت کو کون قبول کر سکتا ہے۔ اپنے وطن کی خاطر لڑنے والے شاید بخوشی قبول کر لیتے ہوں گے۔ میری حالت بچّوں جیسی ہو گئی اور رو رو کر میں نے اپنی حالت بہت بُری کر لی۔ سر کی چوٹ کے بارے میں ڈاکٹروں نے ٹھیک کہا تھا۔ میں کچھ دیر کے لئے بے حِس ہو جاتا تھا جیسے کچھ ہُوا ہی نہیں۔ کبھی تو میں بھول ہی جاتا تھا کہ میرے اِرد گِرد جو لوگ کھڑے ہیں وہ میرے قریبی رشتہ دار ہیں۔ میں اپنے شہر کے ایک ہسپتال میں تھا۔ بعد میں پتہ چلا کہ مجھے اور دوسرے زخمیوں کو بھی سات آٹھ گھنٹوں بعد اس ہسپتال میں پہنچایا گیا تھا۔ تیرہ مسافر زخمی ہوئے تھے۔ ہماری بس تیز رفتاری سے اوورٹیک کرتے ہوئے پہلے بائیں طرف دوسری بس کی سائیڈ سے ٹکرائی۔ ہمارے ڈرائیور نے دائیں طرف کی تو ایک درخت سے ٹکرا گئی۔ میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ اس وقت دونوں بسوں کی رفتار پچاس میل فی گھنٹہ سے کم نہیں ہو گی۔ بعد میں پتہ چلا کہ ہمارا ڈرائیور موقع پر ہی ہلاک ہو گیا تھا۔

میں شہر کے ایک سرکاری ہسپتال میں تھا جہاں مریضوں کا علاج کہنے کو تو مفت کیا جاتا ہے اور جو مفت کی خوش فہمی میں مبتلا رہتے ہیں، ان کی طرف نہ ڈاکٹر توجہ دیتے ہیں نہ دوسرا عملہ۔ میرے والد صاحب اور بھائی نے وارڈ کے بھنگی سے لے کر بڑے ڈاکٹر تک کی مُٹھی گرم کرنی شروع کر دی تھی جس کے نتیجے میں مَیں اپنے آپ کو وی آئی پی سمجھنے لگا تھا۔ ڈاکٹر وارڈ میں آ کر سب سے پہلے مجھے دیکھتے اور خاصا وقت صرف کر کے دوسرے مریضوں کی طرف رسمی سی توجہ دیتے تھے۔

میرا خیال ہے کہ میرے والد صاحب نے بڑے ڈاکٹر کی مُٹھی کچھ زیادہ ہی گرم

کردی تھی کیونکہ دس بارہ دنوں بعد ڈاکٹر نے خود ہی آکر کہا کہ مجھے الگ کمرے میں شفٹ کیا جا رہا ہے۔ الگ کمرے میں یہ سہولت ملی کہ کبھی میری بیوی رات میرے پاس رہتی تھی کبھی ماں آجاتی تھی اور کبھی ایک بہن۔ باقی رشتہ دار مثلاً میری بھابی اور اس کے والدین وغیرہ جب چاہتے آتے اور جتنی دیر چاہتے بیٹھے رہتے تھے۔

میں نے آہستہ آہستہ اس حقیقت کو قبول کرنا شروع کردیا تھا کہ میں آدھا رہ گیا ہوں اور باقی زندگی ایک بازو کے سہارے گزرے گی۔ سر میں جو چوٹ آئی تھی' اس کے اثرات پریشان کرتے تھے کیونکہ بعض اوقات بات کرتے کرتے میں گم ہو جاتا تھا۔ بائیں ٹانگ کا بھی کچھ فکر تھا کیونکہ ابھی میں اس ٹانگ کو ہلا نہیں سکتا تھا۔ میں ہر وقت اس سوچ میں گم رہتا تھا کہ جوانی کی ابتدا میں ہی معذور ہو گیا ہوں۔ اتنی لمبی زندگی کس طرح گزرے گی۔ یہ سوچ کر بہت صدمہ ہوتا تھا کہ میں دوسروں کا محتاج نہ بن جاؤں۔ نوکری کے قابل تو میں رہا ہی نہیں تھا۔

ہسپتال میں ایک مہینہ گزر گیا۔ کٹے ہوئے بازو کا زخم بہتر ہونا شروع ہو گیا تھا۔ بائیں ٹانگ میں بھی جان پڑتی جا رہی تھی لیکن اتنی ہی کہ میں بستر پر بیٹھ سکتا تھا۔ دماغی حالت کچھ سُدھرنی شروع ہو گئی تھی۔

میں نے ایک خاص بات دیکھی۔ میرا بھائی تو ہر شام میرے پاس آتا ہی تھا' لیکن جس رات میری بیوی نے میرے ساتھ رہنا ہوتا تھا' اُس روز بھائی رات کو بھی آجاتا اور میری بیوی اور وہ یوں خوش گپیوں میں لگ جاتے جیسے پکنک پر آئے ہوں۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ رات کو جب بھائی گھر جانے کے لئے نکلتا تو میری بیوی اسے رخصت کرنے کے بہانے اس کے ساتھ چلی جاتی اور کچھ دیر بعد واپس آتی۔ ایک رات بھائی کو رخصت کر کے آئی تو اس کے ہاتھ میں آئس کریم کا کپ تھا۔ کہنے لگی کہ بھائی نے لے کر دی ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ آدھی تم کھاؤ۔

"میں کھا آئی ہوں" —— میری بیوی نے جواب دیا —— "بھائی نے مجھے وہیں کھلا دی ہے"۔

نے کہا ہو گا کہ آئس کریم کھانی ہے"۔

"اللہ قسم! میں نے نہیں کہا" —— بیوی بولی —— "آئس کریم والا اتفاقیہ سامنے آگیا تھا"۔

میں ظاہری طور پر بات گول کر گیا' لیکن ایک خلش سی دل میں بیٹھ گئی کہ میری بیوی نوجوان ہے اور اگر اس نے سوچا ہے کہ میں اس کے قابل نہیں رہا تو ٹھیک ہی سوچا ہو گا۔ میں جسمانی طور پر معذور ہو گیا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو تسلّی دینے کی بھی کوشش کی کہ میری دماغی حالت ٹھیک نہیں' شاید اس وجہ سے مجھے الٹی سوچیں آرہی ہیں۔ یہ بات خاص طور پر سامنے رکھنے والی ہے کہ میری بیوی کی فطرت ہنسی مذاق اور کھل کر بات کرنے والی تھی۔ مطلب یہ کہ اس میں کسی طرح کی بھی گھُٹن نہیں تھی۔ اپنے عزیزوں کے ساتھ بے تکلفی سے بات کرتی تھی۔

میں تعلیم یافتہ تھا۔ اس قسم کی باتوں کو میں سمجھتا تھا کہ جسمانی طور پر معذور ہو جانے والے شخص احساسِ کمتری میں مبتلا ہو جایا کرتے ہیں۔ یہ سوچ کر میں نے اپنے آپ کو سمجھانا شروع کر دیا کہ مجھے اپنے سگے بھائی اور اچھی بھلی نیک بیوی پر شک نہیں کرنا چاہیے۔ وہ تو میری بہت ہی خدمت کرتی تھی۔ اپنا بچّہ جس کی عمر اُس وقت تین سال تھی' ہمارے ساتھ ہوتا تھا۔ اس کا اتنا خیال نہیں رکھتی تھی جتنا اسے میرا خیال ہوتا تھا۔ رات ذرا سی کروٹ بدلوں تو اس کی آنکھ کھل جاتی اور دوڑ کر مجھ تک پہنچتی تھی' لیکن جب میرا بھائی آجاتا تو اس کے ساتھ وہ ضرورت اور معمول سے کچھ زیادہ ہی بے تکلف ہو جاتی تھی۔

میں اس آگ کو اچھی طرح بیان نہیں کر سکتا جو میرے اندر کبھی تو بھڑک اٹھتی تھی اور کبھی سرد ہو جاتی۔ بیوی جب میرے ساتھ اکیلی ہوتی تھی تو میں کہتا تھا کہ اس سے اچھی تو میری ماں بھی نہیں' لیکن بھائی کے آجانے سے مجھے صاف پتہ چلتا کہ بیوی کے رویّے میں میرے لئے بیگانگی سی آگئی ہے۔

پھر میں نے ایک بات اور دیکھی۔ بھابی بھی ایک آدھ دن چھوڑ کر بھائی کے ساتھ آتی تھی۔ وہ بھی خوش طبع تھی' لیکن میری بیوی اور بھائی آپس میں جب بے تکلفی کی باتیں اور مظاہرے کرتے تھے تو میری بھابی انہیں گھُور گھُور کر

دیکھتی۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ اسے یہ سلسلہ ناگوار گزر رہا ہے۔ کچھ دن تو اس نے برداشت کیا۔ پھر یہ اس کا معمول بن گیا کہ تھوڑی ہی دیر بعد میرے بھائی سے کہتی کہ چلو چلیں، بچے تنگ کر رہے ہیں۔

میرے بھائی نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ اپنی بیوی کو دوسرے تیسرے دن لانے کی بجائے ہفتے بعد لانے لگا اور وہ بھی اُس دن لے کر آتا جس رات ماں نے یا میری بہن نے میرے ساتھ رہنا ہوتا تھا۔ اس رات میری بھابی کا مُوڈ بھی ٹھیک رہتا تھا اور بچے بھی گھر جانے کی ضد نہیں کرتے تھے۔

میں اپنے آپ کو تسلیاں تو دیتا تھا، لیکن حالات میری تسلیوں پر پانی پھیر دیتے تھے۔ ایک روز اچانک مجھے یاد آگیا کہ جب ہمارے والدین ہم دونوں بھائیوں کے لئے رشتے تلاش کر رہے تھے تو میرے بھائی نے اس لڑکی کو اپنے لئے پسند کیا تھا جو میری بیوی بن گئی۔ بھائی کے ساتھ میری بے تکلفی تھی۔ اُس نے کئی بار اس لڑکی کے بارے میں کہا تھا کہ اس لڑکی کے لئے وہ ہر قیمت دینے کے لئے تیار ہے، لیکن ہُوا یہ کہ اس لڑکی کی ماں معلوم نہیں مجھے کیوں پسند کرتی تھی۔ اس نے اس لڑکی کا رشتہ دینے کی ہامی تو بھر دی لیکن ساتھ یہ بھی کہہ دیا کہ میں اپنی بیٹی چھوٹے کو دوں گی۔ اس طرح یہ لڑکی میرے حصے میں آگئی۔ مجھے یاد ہے کہ جب اس لڑکی کا رشتہ مجھے مل گیا تو میرا بھائی ایک دو دن چپ چاپ سا رہا تھا۔

پھر ایک اور بات میرے ذہن میں اٹک گئی کہ میری بیوی اُس کی بیوی سے زیادہ خوبصورت تھی۔ اس کی بیوی میں کچھ گھُٹن سی بھی تھی۔ میرا دل کہتا تھا کہ میرے بھائی کو میری بیوی کے ساتھ بے تکلف ہونے کا موقع اب ملا ہے۔ میں کوئی مُردہ دل اور خاموش طبع آدمی نہیں تھا، لیکن میرا بھائی زیادہ زندہ دل تھا اور وہ سنجیدہ باتیں بھی مزاحیہ انداز میں کرتا تھا جس سے ہر کوئی اسے پسند کرتا تھا۔ اب میں نے اپنی بیوی اور بھائی کو بے تکلفی کی حالت میں دیکھا تو مجھے اپنے آپ میں معذوری کے علاوہ بھی کئی نقص نظر آنے لگے۔

ہسپتال میں دو مہینے گزر گئے تو مجھے چھُٹی ملی۔ بائیں ٹانگ بس اتنی سی بہتر ہوئی تھی کہ میں اب ٹانگ پر کھڑا ہو سکتا تھا اور ایک دو قدم اٹھا بھی سکتا تھا۔ ڈاکٹر نے

دوائیوں کے علاوہ مالش کا ایک خاص طریقہ بتایا تھا جو صبح اور شام کرنی ہوتی تھی۔ بازو کا زخم بالکل ٹھیک ہو گیا تھا، لیکن اس معذوری کا اثر جو میں نے نفسیاتی طور پر محسوس کیا وہ ایک گہرے زخم کی مانند تھا جس کا ٹھیک ہونا ناممکن نظر آتا تھا۔

ہسپتال کے کمرے سے نکل کر میری زندگی گھر کے کمرے سے شروع ہوئی یا یوں کہہ لیں کہ گھر کے کمرے میں قید ہو کر رہ گئی۔ ڈاکٹر نے کہا تھا کہ کبھی کسی وقت اٹھ کر دو چار قدم چلنے کی کوشش کیا کرو۔ میں یہ کوشش کرتا تھا۔ میری بیوی صبح اور شام ڈاکٹر کے بتانے کے مطابق میری ٹانگ کی مالش کرتی تھی۔ پھر میرے بھائی نے یہ ڈیوٹی اس طرح تقسیم کر لی کہ صبح بیوی مالش کرتی اور شام کو بھائی کرتا۔ یہاں پھر میں نے نوٹ کیا کہ جب بھائی میرے کمرے میں ہوتا تھا تو میری بیوی بار بار میرے کمرے میں آتی اور بھائی کے ساتھ بڑی بے تکلفی سے باتیں کرتی تھی۔

ان کی بے تکلفی بڑھتی جا رہی تھی۔ کبھی تو میں اس طرح محسوس کرتا جیسے انہیں احساس ہی نہیں ہوتا کہ میں بھی اس کمرے میں موجود ہوں۔ میں نے یہ بھی سوچا کہ اپنی بیوی سے کہوں کہ وہ میرے بھائی کے ساتھ اتنی زیادہ بے تکلفی کا مظاہرہ نہ کرے اور میں اسے صاف بتا دوں کہ اس کے اس رویّے سے میرے دل میں اپنی معذوری کا احساس بڑھ جاتا ہے جو میرے مستقبل کے لئے اچھا نہیں، لیکن مجھے اتنی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ میں واقعی احساسِ کمتری میں مبتلا ہو گیا تھا۔

ایک شام اوپر سے ایسی آوازیں آنے لگیں جیسے میرے بھائی اور بھابی میں لڑائی جھگڑا ہو رہا ہے۔ زیادہ اونچی آواز میرے بھائی کی تھی۔ کچھ دیر بعد میری بہن میرے کمرے میں آئی تو میں نے اس سے پوچھا کہ اوپر کیا ہو رہا ہے۔

"لڑائی ہو رہی ہے" ——— بہن نے بڑے ہی سنجیدہ سے لہجے میں جواب دیا۔

"کس بات پر؟"

"بھائی میرے!" ——— بہن نے تلخ سے لہجے میں جواب دیا ——— "میں تمہارا دل دُکھانا نہیں چاہتی تھی۔ تم پہلے کون سے سُکھی ہو۔ بات یہ ہے کہ تمہاری بیوی ہمارے بڑے بھائی کے ساتھ اتنی زیادہ کھُل گئی ہے جو نہ کوئی خاوند برداشت کرتا ہے نہ کوئی بیوی۔ بھابی کبھی کی دیکھ رہی تھی اور برداشت کر رہی تھی۔ آج پھٹ

پڑی ہے"۔

میں نے کہا کہ وہ میری بیوی کو میرے پاس بھیج دے۔

"بھائی اور بھابی کیوں لڑ رہے ہیں؟" ___ میں نے اپنی بیوی سے پوچھا۔

"سٹریل سی عورت ہے" ___ بیوی نے ناک چڑھا کر جواب دیا ___ "اپنے خاوند کو ہنستا کھیلتا نہیں دیکھ سکتی"۔

"یہ بات نہیں" ___ میں نے کہا ___ "یوں کہو کہ وہ اپنے خاوند کو کسی اور کی بیوی کے ساتھ ہنستا کھیلتا نہیں دیکھ سکتی"۔

"میں بچی تو نہیں" ___ بیوی نے کہا ___ "میں جانتی ہوں کہ آپ کے بھائی صاحب میرے ساتھ فری ہوتے ہیں تو یہ عورت اتنا بھی نہیں سوچتی کہ میں اس کے خاوند کے بھائی کی بیوی ہوں"۔

"میری ایک بات مانو" ___ میں نے کہا ___ "ہمارے گھر میں ہمیشہ سکون رہا ہے۔ ہمارے ابا اور امی آپس میں کبھی اونچی آواز میں بھی نہیں بولے۔ میرا خیال ہے کہ ہمارے خاندان کی ہسٹری میں یہ پہلی لڑائی ہے جو اوپر ہو رہی ہے"۔

"خدا کے لئے" ___ بیوی نے کہا ___ "آپ کوئی وہم دل میں نہ بٹھا لینا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ایک لڑائی اوپر ہو رہی ہے اور دوسری نیچے شروع ہو جائے"۔

میں لڑائی کے موڈ میں نہیں تھا یا شاید مجھ میں اتنی جرأت ہی نہیں تھی۔ میں نے بات وہیں ختم کر دی لیکن یہ ضرور محسوس کیا کہ میری بیوی کو یہ بات اچھی نہیں لگی اور یہ بھی میں نے محسوس کیا کہ میرے اندر ایک تلخی سی پیدا ہو گئی ہے۔ پھر جب بھائی نیچے آیا تو اسے بھی پریشان حال دیکھا' لیکن جس بات پر لڑائی ہوئی تھی وہ بدستور موجود تھی۔ وہ اس طرح کہ میری بیوی نے پہلے سے زیادہ اس کی دلجوئی کی اور خاص طور پر اس کے لئے چائے بنائی۔ میں نے بھائی سے پوچھا کہ بھابی کیوں ناراض ہو رہی تھی تو بھائی نے نفرت سے جواب دیا کہ تنگ نظر عورت ہے' کہتی ہے کہ میں اس کے سوا کسی اور کے ساتھ بات ہی نہ کروں۔

اس کے بعد میری بیوی اور میرے بھائی کی بے تکلفی اور باہمی میل ملاپ ہمارے پورے گھر کا ایک موضوع ہی نہیں بلکہ ایک مسئلہ بن گیا۔ دراصل یہ

مسئلہ میرے لئے بنا تھا جو یہ نہیں تھا کہ میری بیوی کسی اور کے ساتھ تعلق قائم کر رہی ہے بلکہ یہ میرے لئے ایک نفسیاتی مسئلہ بن گیا تھا۔ ہسپتال سے آئے ہوئے دو مہینے گزر گئے تھے' لیکن میری ٹانگ پوری طرح ٹھیک نہیں ہو رہی تھی اور میری دماغی حالت بھی بہت آہستہ آہستہ رُو بصحت ہو رہی تھی۔ جس ڈاکٹر کے میں زیر علاج تھا اس نے حیرت کا اظہار کیا کہ میں ذہنی طور پر یا دماغی طور پر تیزی سے رُو بصحت کیوں نہیں ہو رہا۔ اس ڈاکٹر نے راولپنڈی کے ایک نیورو سرجن کے پاس جانے کا مشورہ دیا۔

والد صاحب اپنے ایک دوست کی گاڑی لے آئے جس میں بٹھا کر مجھے راولپنڈی لے جایا گیا۔ نیورو سرجن نے بہت دیر صرف کر کے مجھے اعصابی طور پر چیک کیا اور پھر ماہرِ نفسیات کی طرح مجھ سے بے شمار باتیں پوچھیں۔

"جسمانی طور پر تم اب صحت مند ہو" ___ ڈاکٹر نے فیصلہ دیا ___ "تمہارا دماغ نارمل حالت میں آ گیا ہے اور ٹانگ میں بھی کوئی ایسا نقص نہیں رہ گیا جو تمہیں چلنے نہ دے۔ اب اگر کوئی خرابی ہے تو وہ تمہارے ذہن میں ہے۔ تم اپنی معذوری کے بارے میں بہت سوچتے ہو اور اپنے آپ کو ٹینشن میں رکھتے ہو۔ یہ ذہنی ٹینشن ہے۔ جب تک ذہن کو آسودگی نہیں دو گے' نہ تمہارا دماغ ٹھیک ہو گا نہ ٹانگ۔ یہ سوچ لو کہ ٹانگ کو چلانے والے جو اعصاب تھے ان پر ضرب پڑی تھی۔ اس ضرب کے اثرات ختم ہو چکے ہیں اور اب ٹانگ کو اپنا کام کرنا چاہیے لیکن تمہارا ذہن تمہارے اعصاب پر اس قدر زیادہ اثر انداز ہو رہا ہے کہ تمہاری ٹانگ کو حرکت میں نہیں آنے دیتا۔ اس جسمانی معذوری کو قبول کر لو۔ اس کے سوا اس کا کوئی علاج نہیں۔ میں تمہیں ذہنی سکون والی دوائیں نہیں دینا چاہتا کیونکہ تم اس کے عادی نہ ہو جاؤ اور پھر ڈیپریشن کا مرض شروع ہو جائے گا۔ میں تمہارے گھر والوں کو سختی سے ہدایات دے رہا ہوں کہ تمہیں معذوری کا احساس نہ ہونے دیں اور تم خود بھی اس احساس سے بچنے کی کوشش کرو"۔

حقیقت یہ ہے کہ میں نے معذوری کو قبول کر لیا تھا مگر جو ٹینشن مجھ پر سوار تھی وہ میں ڈاکٹر کو بتانا نہیں چاہتا تھا نہ میں نے گھر میں کسی کو بتانا تھا۔ ٹینشن یہ تھی

کہ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ میری بیوی اور میرے بھائی میں قابلِ اعتراض دوستی پیدا ہو چکی ہے اور میں بے بس اور مجبور ہوں۔ مستقبل کی پریشانی بھی تھی۔ میں نے بائیں ہاتھ سے لکھنے کی مشق شروع کر دی تھی۔ مستقبل کے بارے میں والد صاحب اور بھائی اتنی تسلّیاں دیتے تھے کہ مجھے پریشان نہیں ہونا چاہیے تھا۔ سُسر اور دو سالوں نے مجھے کہا تھا کہ وہ مجھے اپنے سرمائے سے اعلیٰ قسم کا جنرل سٹور یا جدید قسم کی بیکری یا نہایت اچھی قسم کی کتابوں رسالوں کی دکان کھول دیں گے۔

مجھے بہت ہی زیادہ سپورٹ حاصل تھی۔ بیوی بھی مجھے کہتی تھی کہ مستقبل کے بارے میں سوچنا چھوڑ دوں۔ میرے سُسر کی مہربانی یہ تھی کہ ہر مہینے دو ہزار روپیہ میری بیوی کو دے جاتے تھے مگر جس مسئلے نے مجھے پریشان کر رکھا تھا وہ میری بیوی اور میرے بھائی کا مسئلہ تھا۔ ان کی آپس کی بے تکلفی پہلے سے زیادہ ہو گئی تھی۔ اس دوران بھابی سات آٹھ دنوں کے لئے اپنے والدین کے گھر چلی گئی۔ میں نے دیکھا کہ میری بیوی بار بار اوپر جاتی تھی۔ میرے بھائی کے کپڑے استری کرتی اور پتہ چلا کہ اس کے کمرے کی جھاڑ پونچھ کرتی اور اس کے سارے کام کرتی تھی۔

میں تو تلخی محسوس کرتا ہی تھا' ایک نقصان یہ بھی ہُوا کہ ہمارے اتنے پیارے گھر کی فضا مکدر رہنے لگی۔ کھچاؤ سا پیدا ہو گیا۔ میں تو بڑی تیزی سے ذہنی مریض بنتا جا رہا تھا۔ اس کا یہ اثر بھی ہوا کہ میرے سر کو جو ضرب لگی تھی' اُس کے اثرات کم ہونے کی بجائے زیادہ ہونے لگے اور مجھے غشی کے دورے پڑنے لگے۔ اس کے ساتھ ہی ڈیپریشن بھی رہنے لگی۔ اس کیفیت کا یہ اثر ہُوا کہ مجھ میں اخلاقی جرأت نہ رہی کہ میں بیوی کو یا بھائی کو بتا سکتا کہ میں کیا محسوس کر رہا ہوں۔

ڈاکٹر حیران ہوتے تھے کہ میں ٹھیک ہوتے ہوتے پھر کیوں دماغی طور پر بیمار ہو گیا ہوں۔ میری حالت دیکھ کر میرے والدین بھی پریشان رہنے لگے۔ میں جب انہیں پریشانی کی حالت میں دیکھتا تھا تو میری ڈیپریشن اور بڑھ جاتی تھی۔ ایک ڈاکٹر نے مجھے ٹرانکولائزر دینے شروع کر دیے۔ ان کا وہی اثر ہُوا جو راولپنڈی کے نیورو سرجن نے بتایا تھا۔ وہ یہ کہ میں سویا رہتا اور جب بیدار ہوتا تو ڈیپریشن ہو جاتی۔ پھر

ذہنی سکون اور نیند کی ان گولیوں نے اور میرے اصل مسئلے نے مجھے اس مقام تک پہنچا دیا جہاں انسان کو موت میں ہی پناہ نظر آتی ہے یعنی خودکشی کا رجحان پیدا ہو جاتا ہے۔

ایک روز میں نے خودکشی کا بڑا پکّا ارادہ کر لیا' لیکن کوئی ذریعہ نہیں بنتا تھا۔ میرے دوست مجھے ملنے آیا کرتے تھے' لیکن کوئی ایسا دوست نہیں ہوتا جو دوست کو زہر لا کر دے دے۔ میں نے بیوی کے ساتھ بات چیت اتنی ہی رہنے دی تھی کہ مطلب کے سوا کوئی اور بات نہیں کرتا تھا۔ میں یہ اعتراف کرتا ہوں کہ اس نے شاید محسوس کر لیا تھا کہ میں اس پر شک کر رہا ہوں' لیکن اس نے میری خدمت اور دیکھ بھال میں کوئی فرق نہ آنے دیا۔

ٹانگ کو میں اب اتنا استعمال کر لیتا تھا کہ کمرے سے نکل کر اور صحن میں سے گزر کر بیت الخلاء تک چلا جاتا تھا۔ وہاں میرے لئے لکڑی کا کموڈ رکھا گیا تھا۔ ایک رات میری آنکھ کھلی۔ دیکھا کہ بیوی کمرے میں نہیں تھی اور بچّہ بھی نہیں تھا۔ میں پریشان ہو گیا۔ میں آہستہ آہستہ اٹھا۔ دبے پاؤں کمرے سے نکلا۔ صحن کے ایک طرف ایک کمرہ تھا جسے ہم بیٹھک یا ڈرائنگ روم کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ بیٹھک کے دونوں دروازے اندر سے بند تھے اور اندر ہلکی ہلکی روشنی تھی۔ میں دبے پاؤں ایک دروازے تک پہنچا۔ اندر سے میری بیوی کی ہلکی ہلکی آواز آ رہی تھی۔ وہ کسی کے ساتھ باتیں کر رہی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ یہ میرے بھائی کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ گھر کے باقی افراد دوسرے کمرے میں سوئے ہوئے تھے۔ میرے دماغ کو خون چڑھ گیا۔ میں نے اپنے آپ سے کہا کہ خودکشی کیوں کروں۔ صرف اپنے آپ کو سزا کیوں دوں۔ پہلے ان گناہ گاروں کو ختم کر دوں' پھر اپنا خاتمہ کر لوں گا۔

میں اپنے کمرے میں واپس آیا۔ میری میز کی دراز میں ایک لمبا چاقو رکھا رہتا تھا۔ میں نے چاقو اٹھایا اور پھر کمرے سے نکل گیا۔ وہ جو کہتے ہیں کہ قتل یا خودکشی ایک لمحے کا پاگل پن ہوتا ہے' وہ پاگل پن مجھ پر سوار ہو چکا تھا۔ وہی ٹانگ جو پہلے سے معذور تھی' بالکل ٹھیک ٹھاک حرکت کر رہی تھی۔ میں اس ٹانگ پر اُچھل کُود

بھی سکتا تھا۔

میں نے بیٹھک کے دروازے پر اس توقع پر ہاتھ رکھا کہ دروازہ اندر سے بند ہو گا' لیکن دروازہ کھل گیا جو میں نے پورا نہ کھلنے دیا۔ میں پہلے دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ دونوں کس حالت میں ہیں۔ بچے کے متعلق مجھے یہ خیال آیا کہ بیوی میری اس لئے بچے کو ساتھ لے آئی ہے کہ بچہ اس کی غیر موجودگی میں جاگ نہ پڑے۔ میں نے چاقو کو مضبوطی سے ہاتھ میں پکڑ لیا اور ذرا سے کھلے ہوئے دروازے میں سے اندر جھانکا۔

مجھے جو منظر نظر آیا اس نے اور زیادہ پریشان کر دیا۔ میری بیوی مصلے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں قرآن مجید تھا۔ بچے کو اپنے پاس بٹھایا ہوا تھا اور ماں نے بچے کے دونوں ہاتھ دعا کی پوزیشن میں کر رکھے تھے۔

"اب کہو" ---- میری بیوی بچے سے کہہ رہی تھی ---- "یا اللہ! میرے ابو کو جلدی ٹھیک کر دے" ---- میرے بچے نے توتلی زبان میں یہی الفاظ دھرا دیئے۔

میں وہیں سے واپس اپنے کمرے میں آ گیا۔ چاقو بند کر کے دراز میں رکھ دیا اور لیٹ گیا۔ اتنے میں میری بیوی اور بچہ آ گئے۔ انہوں نے مجھے جاگتے دیکھا۔

"ابو جی' ابو جی" ---- میرے بچے نے بے تابی سے کہا ---- "اب آپ جلدی ٹھیک ہو جائیں گے۔ میں نے اللہ میاں سے کہا ہے..... ابو جی! امی اللہ میاں کے آگے روتی تھیں"۔

میں اپنی بیوی کی آنکھیں اور چہرہ دیکھ رہا تھا۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ بہت ہی روتی رہی ہے۔

دوسرے دن میرے استاد مولوی صاحب آ گئے۔ لڑکپن میں انہوں نے ہی مجھے قرآن پاک ختم کرایا تھا۔ جب سے میں گھر آیا تھا' وہ تین چار مرتبہ آ چکے تھے۔ اب بھی وہ بچوں کو قرآن پڑھاتے تھے۔ انہوں نے کچھ عرصے سے لوگوں کو تعویذ وغیرہ بھی دینے شروع کر دیئے تھے۔ بڑے دانشمند بزرگ تھے۔ لوگوں کو ان پر یقین تھا۔ وہ میرا حال احوال پوچھنے آئے تو میں نے اپنے دل کا یہ مسئلہ بتا دیا۔ پھر یہ بھی بتایا کہ رات کو میں نے کیا دیکھا ہے۔ میں نے انہیں یہ بھی بتا دیا کہ میں خودکشی

اور قتل تک اتر آیا تھا۔

"اسے اللہ کا کرم سمجھو" ---- انہوں نے کہا ---- "کہ میں آج تمہارے پاس آ گیا ہوں۔ میرا عقیدہ ہے کہ مجھے اللہ نے تمہارے پاس بھیجا ہے۔ یہ وہم کہ تمہاری بیوی خدانخواستہ تمہارے بھائی کے ساتھ خراب ہے' ابھی دل سے نکال دو۔ تمہاری بیوی اپنے بچے کے ساتھ کوئی دس دفعہ میرے پاس آ چکی ہے اور تم نہیں جانتے کہ میرے دیئے ہوئے تعویذ پانی یا دودھ وغیرہ میں گھول کر تمہیں پلا چکی ہے۔ وہ ہر بار مجھے دو مرادیں بتاتی تھی۔ ایک تمہاری صحت یابی اور دوسری یہ کہ تمہارے بھائی کو وہ بھائی جان کہتی تھی اور مجھ سے یہ سوال کرتی تھی کہ یہ دعا کریں کہ میرے اس بھائی کو خدا اتنا اجر دے کہ یہ سنبھال نہ سکے۔ اس نے ہمیں بہت سہارا دیا ہے۔ دو مرتبہ تمہارا بھائی تمہاری بیوی کے ساتھ آیا اور اس نے یہ الفاظ کہے کہ اس کے لئے یعنی تمہاری بیوی کے لئے دعا کریں..... جو میں جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے۔ یہ وہم دل سے نکال لو اور اپنے آپ کو سنبھالو"۔

اللہ مغفرت کرے' یہ مولوی صاحب دو سال ہوئے فوت ہو گئے ہیں' میرے لئے رحمت کا فرشتہ ثابت ہوئے جو میرے ذہن اور دل سے بوجھ اتار گئے۔ یقین جانیں کہ پندرہ سولہ دنوں میں میری بائیں ٹانگ بالکل نارمل حالت میں آ گئی اور ذہن بھی بالکل نارمل ہو گیا۔

وہ پاگل ہو گئی

آج وہ ایک مقامی ہسپتال میں چل بسی ہے۔ وہ میری بیوی تھی۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کی رفاقت میں دس سال کا عرصہ بڑے خوشگوار طریقے سے گزارا تھا۔ میں نے تو کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ میری پیاری اور وفا شعار بیوی ایک روز پاگل پن کی حالت میں مجھے اکیلا چھوڑ کر اس دنیا سے رخصت ہو جائے گی۔ وہ ایک پڑھی لکھی اور باشعور خاتون تھی جس کی پورا خاندان تعریف کرتا تھا۔ شادی کے بعد ابتدا میں جب اوپر تلے ہماری تین بیٹیاں ہو گئی تھیں تو وہ کچھ پریشان سی ہو گئی تھی۔ اُس کا خیال تھا کہ اگر بیٹا نہ ہوا تو شاید میں دوسری شادی کر لوں گا مگر میں نے اُسے یقین دلا دیا تھا کہ میں زندگی بھر اسی کا ہو کر رہوں گا۔

سچ کہتا ہوں میں کہ میری بیوی روزینہ آج جبکہ اس دنیا سے رخصت ہو چکی ہے اب بھی اس کی یادیں میری زندگی کا سہارا ہیں۔ میں ابھی ایسا بوڑھا بھی نہیں ہُوا کہ دوسری شادی نہ کر سکوں۔ میری تین معصوم بچّیاں ہیں جن کے سر پر اب ماں کا سایہ نہیں رہا۔ مجھے عزیز رشتہ دار اور دوست اکثر مشورہ دیتے رہتے ہیں کہ میں اپنی خاطر نہیں تو کم از کم بیٹیوں کی خاطر ہی دوسری شادی کر لوں مگر میں اس کے بارے میں سوچ ہی نہیں سکتا۔

میں یہ کہہ رہا تھا کہ میری بیوی پاگل پن کی حالت میں آج ایک مقامی ہسپتال میں چل بسی ہے۔ روزینہ جیسی باشعور پڑھی لکھی اور سُلجھی ہوئی عورت پاگل کیوں ہوئی یہ ایک درد بھری داستان ہے جس کا خود میں بھی ایک کردار ہوں۔

میری یا میری بیوی روزینہ کی بربادی کی داستان کا آغاز اُس روز ہُوا جب تین بیٹیوں کی پیدائش کے کچھ عرصہ بعد کافی منتوں اور مرادوں کے بعد اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایک بیٹے سے نوازا۔ یہ بیٹا اس لئے بھی ہماری آنکھوں کا تارا تھا کہ وہ پورے

خاندان کا واحد وارث تھا۔ میرے بڑے اور چھوٹے سبھی بھائی شادی شدہ تھے مگر ان میں سے کسی کے ہاں ابھی تک کوئی بیٹا پیدا نہیں ہُوا تھا' بلکہ بعض عاملوں نے اس طرف اشارہ دیا تھا کہ ہمارے خاندان کے خلاف ہمارے کسی دشمن نے ایسا عمل کروا رکھا ہے کہ اس خاندان میں بیٹا پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ میں اور میری بیوی روزینہ اگرچہ پڑھے لکھے اور روشن خیال تھے مگر اس قسم کی باتوں نے ذہنی طور پر بہت پریشان کر رکھا تھا۔ ہم یہی سمجھ رہے تھے کہ اولاد نرینہ ہماری قسمت میں ہی نہیں ہے لیکن ان حالات میں جب اللہ تعالیٰ نے طارق کے روپ میں ہمیں ایک گول مٹول سا مُنا دیا تو نہ صرف ہماری بلکہ پورے خاندان کی خوشیاں دیدنی تھیں۔ وہ خاندان جہاں پچھلے کئی سالوں سے بیٹیاں ہی بیٹیاں پیدا ہو رہی تھیں وہاں بیٹے کی آمد کی خبر نے پورے خاندان کو خوشیوں سے نہال کر دیا۔

ابھی میرے بیٹے طارق نے پاؤں پر چلنا بھی نہ سیکھا تھا کہ میری بیوی پھر امید سے ہو گئی۔ اگرچہ ہم اتنی جلدی مزید بچہ نہیں چاہتے تھے مگر قدرت کی مرضی میں کوئی دخل بھی تو نہیں دے سکتا۔ ایک بار میرے جی میں آئی کہ ہم آنے والے کو روکنے کی غیر فطری کوشش کریں مگر پھر نہ جانے کیا سوچ کر ہم اپنے اس ارادے سے باز رہے۔

میرا بیٹا طارق ابھی ڈیڑھ برس کا بھی نہیں ہُوا تھا کہ جب اللہ تعالیٰ نے مجھے ایک اور بیٹا عطا کر دیا لیکن اسے گود میں لیتے ہی میری اور میری بیوی کی ساری خوشیاں خاک میں مل گئیں۔ وجہ یہ تھی کہ وہ پیدائشی طور پر معذور تھا۔ معذور سے مراد یہ ہے کہ اس کی ذہنی اور جسمانی حالت نارمل نہ تھی۔ دوسرے بیٹے کی پیدائش پر میری بیوی بڑی خوش ہوئی تھی کہ چلو اللہ تعالیٰ نے چاند سورج کی جوڑی ملا دی ہے مگر اس کی معذوری دیکھ کر ہمارے دل کے ارمان دل ہی میں رہ گئے۔ اپاہج بیٹا دے کر قدرت نے ہمیں کس جرم کی سزا دی تھی۔ یہ میں جانتا تھا اور نہ میری بیوی۔

بہرحال یہ ایک ایسا دائمی روگ تھا کہ جس نے ہمارے ہونٹوں سے مسکراہٹ چھین لی ہمارے گھر کا سکون برباد کر دیا۔ اس درد کو وہی لوگ محسوس کر سکتے ہیں جو

خود ایسے ناگزیر حالات کا شکار رہے ہوں۔ ہمارا یہ معذور بیٹا زاہد بچپن ہی سے بہت صحت مند مگر تشدّد پسند تھا۔ بعض اوقات وہ ایسی عجیب و غریب حرکتیں کرتا کہ ہم دونوں لرز کر رہ جاتے تھے۔ ہم تو جیسے تیسے گزارا کر لیتے مگر ہمارے اس معذور بیٹے کا سلوک ہمارے بڑے بیٹے طارق اور دوسری بہنوں کے ساتھ ایک طرح سے ناقابلِ برداشت تھا۔ خاص طور پر اپنے بڑے بھائی کو دیکھ کر تو ہمارا معذور بیٹا زاہد آپے سے باہر ہو جاتا تھا۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ طارق کو بھنبھوڑ کر رکھ دے۔ ضرورت سے زیادہ خوراک نے اسے بہت فربہ کر دیا تھا۔ ہر ایک گھنٹے کے بعد دودھ مانگتا اور نہ ملنے پر چیخ چیخ کر سارا گھر سر پر اٹھا لیتا۔

میری بیوی روزینہ جو اس کی ماں تھی وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی ساری ضرورتیں پوری کرنے اور اس کی حرکتیں برداشت کرنے پر مجبور تھی۔ جب وہ ذرا اور بڑا ہُوا اور اس نے باقاعدہ کھانا شروع کیا تو ایک اور عذاب گلے پڑ گیا۔ زاہد بارہ بارہ کیلے ایک ہی وقت میں کھا لیتا۔ کھیر کا پورا ڈونگا خالی کر دیتا۔ نہ جانے کیسا دوزخ تھا جو بھرنے میں ہی نہیں آتا تھا۔ فرج میں کوئی بھی چیز سلامت نہیں رہتی تھی۔ حد سے زیادہ خوراک نے اسے بہت زیادہ مضبوط اور طاقتور بنا دیا تھا۔ جبکہ ہمارا بڑا بیٹا طارق اس کے سامنے کمزور اور سہمی ہوئی بکری دکھائی دیتا تھا۔ اس معذور بیٹے زاہد نے مجھے اور میری بیوی کو اپنے گرد ایسا اُلجھایا ہُوا تھا کہ ہم اپنے بڑے معصوم اور پیارے سے بیٹے طارق پر پوری توجہ ہی نہیں دے سکتے تھے۔ وہ بیچارہ تو اپنی جان کی حفاظت کرنے سے بھی قاصر تھا۔ کسی اَن دیکھے خدشے اور خوف کے تحت ہر وقت میرا اور میری بیوی کا دل جکڑا رہتا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے کچھ ہونے والا ہے۔ سوتے ہوئے میری بیوی اچانک ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتی اور اپنے بڑے بیٹے طارق کو ٹٹولنے لگتی۔ اسے وہم سا لگ گیا تھا کہ جیسے اس گھر میں کچھ ہونے والا ہے۔ میں اسے اکثر حوصلہ بھی دلاتا رہتا تھا کہ سب معاملہ رفتہ رفتہ ٹھیک ہو جائے گا مگر وہ ایک ماں تھی اس لئے اولاد کے معاملے میں وہ مجھ سے زیادہ حساس تھی۔

طارق جب چار سال کا ہُوا تو اسے نرسری میں داخل کروا دیا گیا۔ اب کم از کم

اتنا ہُوا کہ وہ دوپہر بارہ بجے تک اپنے معذور بھائی زاہد کی دست بُرد سے محفوظ رہتا مگر جب وہ پتلا دبلا اور کمزور سا لڑکا واپس گھر آتا تو میری بیوی کو پھر یہی فکر دامن گیر ہونے لگتی کہ کہیں زاہد اپنے بڑے بھائی کو کوئی نقصان نہ پہنچا دے۔

وقت گزرتا رہا۔ طارق کے صبر اور زاہد کی تشدّد پسندی میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ ہر روز جب میں دفتر سے آتا تو مجھے زاہد کے بارے میں کئی کئی باتیں معلوم ہوتیں۔ تشدّد اور بے رحمی کا جذبہ اس میں کُوٹ کُوٹ کر بھرا ہُوا تھا۔ میری بیوی کے بقول وہ صرف طارق کو اذیت دینے میں تامّل نہیں کرتا تھا بلکہ بعض اوقات تو اپنی جان کو بھی خطرے میں ڈال لیتا تھا مگر میری بیوی ماں ہونے کے ناطے سے اس معذور کو سمجھانے یا ڈانٹنے سے بالکل قاصر تھی۔ کئی بار زاہد نے نہ صرف اپنے آپ کو بلکہ طارق کو بھی بُری طرح سے زخمی کیا۔ ایک دفعہ مالی باغ میں کام کر رہا تھا۔ جمعے کا دن تھا میں بھی باغ کے ایک گوشے میں بیٹھا دھوپ سینک رہا تھا۔ مالی کام میں مشغول تھا۔ رمبا اس کے پاس دھرا تھا۔ زاہد نہ جانے کیسے ماں کی نظر سے بچ کر یہاں باغ میں پہنچ گیا تھا۔ طارق نے اچک کر رمبا اٹھایا اور مالی کے سر پر دے مارا۔ غریب آدمی چشمِ زدن میں لہولہان ہوگیا۔ ایسے واقعات نے مجھے اور روزینہ کو بہت دل گرفتہ کر دیا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے ہم نے زندگی میں کوئی بہت بڑا جرم کیا ہے۔ قدرت نے جس کی سزا زاہد بیٹے کی صورت میں ہمیں دی تھی۔

ایک روز زاہد کتابوں کی الماری کا ہینڈل پکڑ کر لٹک گیا۔ الماری کے نیچے دب جانے سے اس کی کہنی کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ ہم نے کیسے اس صورتِ حال کا مقابلہ کیا اور اس کا کس طرح سے علاج کروایا' یہ ایک الگ داستان ہے۔ زاہد کی وجہ سے گھر کی حالت بہت ابتر تھی۔ کوئی چیز بھی اپنی اصلی حالت میں نہ رہی۔ ٹوٹ پھوٹ کا یہ عالم تھا کہ الامان الحفیظ۔ عقل کام نہیں کرتی تھی کہ کیا کریں۔ کئی دفعہ عزیز و اقارب نے سمجھایا کہ زاہد کو دماغی امراض کے ہسپتال میں داخل کروا دیں۔ میں تو اس پر آمادہ بھی ہوگیا تھا مگر میری بیوی ایسی کوئی تجویز سننے کو بھی تیار نہ تھی۔ حالانکہ ہر وقت کی توڑ پھوڑ اور مار دھاڑ سے بھرپور وارداتوں کی وجہ سے اس کا دل بہت کمزور پڑ چکا تھا۔ آخر ہر روز کی کِل کِل سے تنگ آکر ایک روز میں نے او،

میری بیوی نے فیصلہ کیا کہ زاہد کو کمرے میں بند کر کے رکھا کریں مگر اس میں یہ قباحت تھی کہ کمرے میں بند ہونے کے بعد وہ اتنا شور مچاتا کہ جان منہ کو آجاتی۔ ہم اس کو تالے میں بند رکھتے تھے لیکن وہ ہر وقت دروازہ پیٹتا رہتا۔ اس دن رات کی بے سکونی نے رفتہ رفتہ میری بیوی کی صحت کو متاثر کرنا شروع کر دیا اور ہائی بلڈ پریشر کی شکایت میں مبتلا ہوگئی۔

اس صورتِ حال سے تنگ آکر آخر ایک روز ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ زاہد کو ہسپتال میں داخل کروا دیا جائے۔ پورے خاندان کو برباد کرنے سے بہتر ہے کہ اسے اس کے مقدّر کے سپرد کر دیا جائے۔ میری بیوی بھی میرے مجبور کرنے پر بادلِ نخواستہ رضامند ہوگئی۔

ایک روز جب میں دفتر گیا ہُوا تھا میری بیوی ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق سکون آور دوا لے کر سونے چلی گئی مگر اس سے پہلے حسبِ معمول اس نے زاہد کو کمرے میں بند کر کے تالا لگا دیا اور چابیاں اپنے تکیئے کے نیچے رکھ کر سو گئی۔ ان ادویات کی وجہ سے وہ اتنی گہری نیند سوئی کہ اسے یہ پتہ ہی نہ چل سکا کہ اس گھر پر کیا قیامت بیت گئی ہے۔ دراصل ہوا یہ تھا کہ جب روزینہ سکون آور دوا لے کر گہری نیند سو رہی تھی تو میرے معذور بیٹے زاہد نے جو کمرے میں بند تھا اس نے بے تحاشا شور مچانا شروع کر دیا اور وہ اس زور سے دروازہ پیٹنے لگا کہ میرے بڑے بیٹے طارق سے چھوٹے بھائی کا چیخنا چلاّنا برداشت نہ ہو سکا۔ اس نے چپکے سے ماں کے تکیئے کے نیچے سے کمرے کی چابیاں نکالیں اور نہ جانے کیسے صحیح نمبر کی چابی ڈھونڈ کر اس کمرے کا دروازہ کھول دیا جس میں زاہد بند تھا۔ پھر اس کے بعد کچھ پتہ نہ چلا کہ کیا ہُوا۔ میری بڑی بیٹی صائمہ جو اپنے کمرے میں اسکول کا کام کر رہی تھی اس نے جب یہ دلدوز چیخ سنی تو وہ دیوانہ وار کمرے کی طرف دوڑی۔ اس نے دیکھا کہ طارق یعنی میرا بڑا بیٹا زمین پر گرا ہُوا ہے اور زاہد اس کی چھاتی پر بیٹھا دونوں ہاتھوں سے اس کا گلا دبا رہا ہے۔ بمشکل تمام میری بیٹی نے زاہد کو پیچھے ہٹایا۔ نہ جانے اس میں ایک ناقابلِ یقین جنّاتی قوت کہاں سے عود کر آئی تھی۔ صائمہ نے طارق کو اٹھایا اور بستر پر لٹا دیا۔ بھائی کو بے حس و حرکت دیکھ کر وہ گھبرا گئی اور دوڑی دوڑی

اپنی ماں کے پاس گئی اور اسے جھنجوڑ کر جگایا۔ ماں کو صائمہ نے بتایا کہ طارق بیہوش ہو گیا ہے۔ میری بیوی یہ سن کر دیوانی ہو گئی اور بے اختیار طارق کی طرف لپکی۔ اس نے طارق کو جب بغور دیکھا تو اس کی بے جان آنکھیں ایک ہی سمت رکی ہوئی تھیں۔ فرشتوں جیسا تقدّس اور پاکیزگی اس کے چہرے پر تھی۔ اسے یوں لگا جیسے ننھا طارق کہہ رہا ہو کہ امی آپ میری حفاظت کا بھاری بوجھ نہیں اٹھا سکی تھیں اس لئے میں نے آپ کو اس بوجھ سے آزاد کر دیا ہے۔

میرا پیارا اور لاڈلا بیٹا طارق مر چکا تھا۔ میری بیوی اسے دیکھ کر اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھی۔ غم کی شدت انسان کو عقل و خرد سے بیگانہ کر دیتی ہے۔ زاہد بھی اگرچہ اس کا بیٹا تھا۔ اس نے اسی کی کوکھ سے ہی جنم لیا تھا مگر بڑے بیٹے کی موت جو کہ اس کے ہاتھوں واقع ہوئی تھی۔ اس وجہ سے وہ زاہد کے وجود کو برداشت نہ کر سکی۔ نہ جانے اُس وقت اُس کی ممتا کہاں جا کر سو گئی تھی۔ اس نے بے قابو ہو کر زاہد کو مار مار کر ادھ مُوا کر دیا۔ اسے دو دن تک بھوکا پیاسا کمرے میں بند رکھا۔ خود اس صدمے سے وہ اس قدر نڈھال تھی کہ اسے اپنے آپ کا ہوش بھی نہ رہا مگر جب ہوش آیا تو زاہد بھی اس دنیا میں نہیں تھا۔ اِدھر دونوں بیٹوں کی موت نے میری بیوی کو اس قدر ذہنی صدمہ پہنچایا کہ وہ دوبارہ اپنے ہوش میں نہ آ سکی اور آج اس پاگل پن کی کیفیت میں ہی وہ مجھے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تنہا چھوڑ گئی ہے۔

میرے دونوں بچّوں نے دنیا میں اتنے ہی سانس پورے کئے جتنے میرے ربّ نے ان کے لئے مقرر کئے تھے لیکن میری بیوی سے جو کچھ بھی دانستہ یا غیر دانستہ طور پر ہُوا اس کی وجہ سے وہ احساسِ جرم میں مبتلا ہو گئی اور بیٹوں کی موت کے صدمے نے اسے الگ پاگل کر دیا۔ اب میں اپنی تین معصوم بچیوں کے ساتھ زندگی بسر کر رہا ہوں۔ میں ان کا باپ بھی ہوں اور ماں بھی۔ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ مجھے ہر ملنے جلنے والا دوسری شادی کا مشورہ دیتا ہے مگر میں ایسا نہیں کر سکتا۔ اس کی

دو وجوہات ہیں ایک تو یہ کہ مجھے روزینہ سے سچا پیار تھا اب اگر میں نے کسی اور کو اپنی زندگی کا ساتھی بنا بھی لیا تو میں اسے اس کا حق نہ دے سکوں گا۔ شادی نہ کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اگر پھر خدانخواستہ میرے گھر میں زاہد جیسا ابنارمل بچّہ پیدا ہو گیا تو دوبارہ ایسی صورتِ حال سے عہدہ برآ ہونے کی ہمت کہاں سے لاؤں گا۔ اب تو یہی فکر ہے کہ جیسے تیسے ہو یہ زندگی گذر جائے۔

انگلستان سے اللہ تک

یہ کہانی ایک دوست نے سنائی تھی۔ میں مقام اور نام مصلحت کی بنا پر فرضی لکھ رہا ہوں۔ کہانی سو فیصد سچی ہے۔

ہم گجرات کے رہنے والے ہیں اور جن لوگوں کا اور جس مصیبت زدہ خاتون کا ذکر کرنے لگا ہوں' ان کا تعلق گوجر خان سے ہے۔ یہ تو ہمیں معلوم تھا کہ ہماری برادری گوجر خان میں بھی رہتی ہے اور بزرگوں کی کسی پرانی لڑائی کی وجہ سے وہاں آنا جانا ختم ہو گیا ہے۔ ہمیں اپنی نانی صاحبہ سے پتہ چلا کہ میری خالہ زاد بہن بھی گوجر خان رہتی ہے..... گوجر خان سے آگے کوئی دس میل ایک گاؤں میں..... یہ بھی معلوم ہو گیا کہ میری اس خالہ زاد بہن کا وہاں نہ چچا ہے نہ ماموں' والد اور والدہ فوت ہو چکے ہیں۔ بہن بھائی بھی کوئی نہیں۔ اس کی رشتہ داری اپنی اولاد یعنی چھ بیٹیوں اور ایک بیٹے سے ہے۔ خاوند اور دیور تو صرف حکمرانی کرنے کے لئے وہاں اس کے سر موجود رہتے ہیں۔ یہ بھی معلوم ہُوا کہ اس خالہ زاد بہن کو ہمارے بارے میں بھی سب کچھ معلوم ہے اور ہمیں یاد کر کے بہت روتی ہے۔ مسئلہ یہ تھا کہ کسی طرح خالہ زاد بہن سے ملا جائے۔

پہلے میں نے پتہ معلوم کر کے اپنے چھوٹے بھائی کو وہاں بھیجا کہ دیکھے کہ وہ لوگ ہمیں کچھ اہمیت دیتے ہیں تو پھر ہم آگے بڑھیں گے۔ چھوٹا بھائی سلطان وہاں سے واپس آیا اور اس نے بتایا کہ وہ لوگ اسے مل کر بہت خوش ہوئے ہیں۔ ہماری خالہ زاد بہن تقریباً" بوڑھی ہو چکی ہے دو بیٹیاں اس کی جوان ہیں۔ وہاں ان کا خون کا رشتہ دار بھی کوئی نہیں۔ وہ سلطان سے مل کر روتی رہی اور اس نے کہا کہ بڑے بھائی کو کہنا کہ ایک دفعہ مجھے مل جائے۔

جب یہ خبر ہم نے نانی صاحبہ کو جن کو ہم بڑی والدہ کہتے ہیں سنائی تو وہ

دوسرے کمرے میں گئیں' جب واپس آئیں تو ان کے ہاتھ میں ایک سو روپے کا نوٹ تھا۔ انہوں نے مجھے کہا کہ میں نے عرصہ سے منت مانی تھی کہ جس دن مجھے ان کی طرف سے کوئی خیریت کی خبر لا کر دے گا' یہ اُسی کو دوں گی۔ یوں سو روپے کا انعام سلطان کو مل گیا۔ اس دن نانی صاحبہ پُر سکون نظر آ رہی تھیں لیکن عصر کی نماز کے بعد اچانک ان کی طبیعت بگڑ گئی۔ ہم نے کوئی خاص محسوس نہ کیا۔ میری چھٹی دوسرے دن ختم تھی اور میں کوئٹہ روانہ ہو گیا۔ تقریباً" ہفتہ بعد مجھے اطلاع ملی کہ نانی صاحبہ فوت ہو گئی ہیں۔ ہُوا یوں تھا کہ میرے جانے کے کوئی تیسرے چوتھے دن بعد گوجر خان سے میری خالہ زاد بہن اور ان کی ایک بیٹی اپنے خاوند کے ساتھ ہمارے گاؤں آئیں۔ نانی صاحبہ جیسے ان کے انتظار میں ہوں۔ ان لوگوں سے مل رہی تھیں تو بڑا ہی دردناک منظر تھا۔ جب نانی صاحبہ اپنی نواسی کو یعنی جو ہماری خالہ زاد بہن ہے اس کو مل رہی تھیں تو پیچھے ہٹنے کا نام ہی نہیں لیتی تھیں۔ کچھ دیر بعد جب میری بڑی بہن نے نانی صاحبہ کو پکڑ کر علیٰحدہ کرنا چاہا تو ان کا سر ایک طرف ڈھلک گیا' اور یوں والدہ صاحبہ نے اپنی بچھڑی ہوئی اولاد سے آخری ملاقات کر لی۔

میری خالہ زاد بہن کے غموں کی داستان ابھی تک چل رہی ہے۔ میں دوبارہ گھر چھٹی آیا۔ کچھ دن گھر رہا اور ارادہ کیا کہ اب میں گوجر خان ضرور جاؤں گا۔ اگلی چھٹی پر میں سیدھا گھر کی بجائے گوجر خان پہنچا۔ وہاں سے گاؤں کی طرف جانے والی ایک سوزوکی پک اَپ پر بیٹھا اور اُس گاؤں پہنچ گیا۔ وقت تقریباً" ظہر کا تھا۔ میں نے سوچا کسی سے معلوم کر لوں کہ میری خالہ زاد بہن کا گھر کدھر ہے۔ بہنوئی کا نام محمد خان تھا۔ سامنے آٹھ دس سال کی عمر کے چند لڑکے کھیل رہے تھے۔ ایک لڑکا جو دس بارہ سال کا ہو گا' بڑا خوبصورت اور نرم و نازک بھی تھا' ایک طرف بیٹھا تھا۔ میں نے اس سے ہاتھ ملایا اور پوچھا کہ محمد خان کا گھر کہاں ہے۔ اتنا کہنا تھا کہ لڑکا بے اختیار مجھ سے چمٹ گیا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ مدثر ہے یعنی میرا بھانجا۔

ہم گھر پہنچ گئے۔ وہاں سب نے میرا فوٹو پہلے دیکھ رکھا تھا اس لئے انہوں نے بھی پہچان لیا۔ جوں جوں گاؤں کے لوگ سنتے گئے کہ اتنی دور سے دوسری دفعہ کوئی

بھائی اپنی بہن سے ملنے کے لئے آیا ہے اور کئی سالوں کا طلسم ٹوٹا ہے تو لوگ آتے گئے اور گھر میں تِل دھرنے کی جگہ نہ رہی۔ میری خالہ زاد بہن اور ان کی اولاد خوشی کے آنسو بہا رہے تھے۔ ایک اَن دیکھی دولت خوشی کے روپ میں نچھاور ہو رہی تھی۔ جب لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے تو خوب جی بھر کر باتیں ہوئیں۔ میں نے دیکھا کہ خالہ زاد بہن کی دو بیٹیاں ہیں۔ بڑی میری عمر کی اور دوسری دو سال کم عمر کی ہو گی۔ پھر رات گئے ہم سوئے۔ صبح ہر کوئی اپنے اپنے کام کاج میں لگ گیا۔ جب میں اور خالہ زاد بہن اکٹھے اکیلے بیٹھے تو اس نے کئی سالوں کے غم ایک ایک کر کے میرے سامنے رکھنے شروع کر دیئے جیسے کئی سالوں سے میرا انتظار کر رہی تھی۔ اس نے کہا کہ اپنی زندگی میں کانٹوں کے سوا کچھ نہیں دیکھا۔ ماں باپ کی جدائی دیکھی۔ بھائی کوئی نہیں دیکھا' بہن بھی نہیں ہے۔ ماموں اور چچا بھی نہیں تھے کہ کبھی شفقت کا ہاتھ میرے سر پر رکھتے۔ اپنے خاوند اور دیور کی مار کھا کھا کر زندہ لاش کی طرح زندگی گزارتی آ رہی ہوں۔ پھر اولاد ہو گئی تو اس کے سہارے چلنے لگی۔ اب تم آ گئے ہو تو ایک دفعہ پھر زندہ ہو گئی ہوں لیکن ایسے وقت میں آئے ہو کہ اتنے عرصہ کی جدائی کے زخم ابھی بھر نہیں سکتے۔

اس نے کہا کہ میری بڑی بیٹی کا رشتہ اپنی برادری کے ایک بزرگ نے اپنے اکلوتے بیٹے کے لئے مانگا تھا۔ بزرگ صاحبِ حیثیت اور باکردار تھے۔ وہ ہمارے گھر والوں کے پاس اپنے بیٹے کے لئے رشتہ لینے کے لئے آئے تو میرے خاوند نے کہا کہ بزرگو! بہتر ہے کہ ہمیں فی الحال سوچنے کا موقع دیں۔ ان بزرگوار نے کہا کہ سوچنا کیا ہے۔ آپ کی بڑی بیٹی عذرا ہماری بیٹی ہے۔ بس ہاں کر دو۔ اس طرح اُسی وقت ہاں ہو گئی۔ بزرگ واپس گئے۔ گھر والوں کو بتایا کہ عذرا کا رشتہ لے لیا ہے۔ گھر والے بہت خوش ہوئے' اس لئے کہ عذرا انتہائی خوبصورت تھی۔ دراز قد اور بہترین سیرت کی مالک تھی۔ پورا گاؤں اس کی سیرت اور خوبصورتی پر رشک کرتا تھا اور کچھ حسد بھی۔ وہ پانچ چھ جماعت تک ہی پڑھی تھی۔

جس لڑکے کے لئے رشتہ لیا گیا تھا وہ بھی بہت خوش تھا۔ کچھ ہی عرصہ گزرا تھا کہ اس لڑکے نے جس کے ساتھ عذرا کا رشتہ زبانی منسوب ہُوا تھا' فوج میں کمیشن

لے لیا اور فوجی ٹریننگ پر چلا گیا۔ ٹریننگ کے بعد افسری کندھوں پر لگ گئی اور دوسرے افسروں کے ساتھ رہنے سے تھوڑا بہت سٹیٹس بھی اونچا ہو گیا اور اپنے شادی شدہ دوستوں کی بیگمات کو دیکھا تو اس نے بھی ارادہ کیا کہ گاؤں کی بجائے شہر سے شادی کی جائے۔ یوں عذرا کے رشتے کی بات ختم ہو گئی۔ جو بزرگ عذرا کا رشتہ طے کرنے آئے تھے انہیں اپنے بیٹے کے فیصلے کا علم ہُوا تو وہ بھونچکا کر رہ گئے۔ کہاں پورا گاؤں ان کا احترام کرتا تھا اور کہاں آج بیٹے نے باپ کی پگڑی اچھال دی۔ بیٹے کی اس نافرمانی کا یہ اثر ہُوا کہ باپ پر ایسا دورہ پڑا کہ وہ جانبر نہ ہو سکا اور لیفٹیننٹ صاحب نے شہر سے شادی کر لی۔

عذرا کئی دن گھر سے باہر نہ نکل سکی۔ آخر سمجھ دار تھی۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ اس طرح والدین کی بھی بے عزتی ہو رہی ہے۔ بہتر ہے کہ اس صدمے کو برداشت کر لیا جائے۔ زندگی اسی ڈگر پر کچھ قدم اور آگے بڑھ گئی۔ یہ لیفٹیننٹ ان کی اپنی برادری سے تھا۔ اب انہی کی برادری کے ایک اور بزرگ نے آکر رشتہ مانگا تو عذرا کے والدین نے انکار کر دیا' کیونکہ وہ اپنی برادری سے کافی حد تک متنفّر ہو چکے تھے۔ پھر گاؤں کے ایک بزرگ نے جو ان کی اپنی برادری سے نہیں تھا' عذرا کا رشتہ مانگا' لڑکا انگلینڈ ہوتا تھا۔ عذرا کے چچا نے ان لوگوں سے کافی ادھالے رکھا تھا۔ عذرا کے والدین نے ان سے سوچنے کے لئے کچھ مہلت مانگی۔ عذرا کو جہاں تک میں جانتا ہوں' وہ پانچ وقت کی نمازی ہے۔ قرآن پاک کئی دفعہ بامعنی پڑھ چکی ہے اور انتہائی فرمانبردار ہے۔ جہاں تک اس کی خوبصورتی کا تعلق ہے' اس جتنا خوبصورت بخدا میں نے اس پورے علاقہ میں کسی کو نہیں دیکھا۔ اب عذرا کے چچا نے فعال رول ادا کیا اور ان لوگوں سے مراسم بڑھانے شروع کر دیئے۔

جس لڑکے کے لئے عذرا کا رشتہ مانگا جا رہا تھا۔ وہ پانچویں تک متذکرہ لیفٹیننٹ کا کلاس فیلو رہ چکا تھا۔ اس لڑکے کا نام آپ الطاف کہہ لیں۔ الطاف نے نہ صرف تعلیم حاصل نہیں کی تھی بلکہ جتنا ظاہری طور پر ناقابلِ برداشت تھا اتنا اندر سے بھی انسانیت سے دور تھا لیکن عذرا کے والدین ان کے چکر میں پھنس چکے تھے اور الطاف نے گھر والوں کو کہہ دیا کہ ان لوگوں کی ہر طرح مدد کرو تاکہ مجھے

رشتہ مل جائے اور میں لیفٹیننٹ کو بھی بتا سکوں کہ میں دولت میں تم سے آگے ہوں اور یہ کہ جو لڑکی تم سے منسوب رہ چکی ہے وہ اب میری بیوی ہو گی۔

میں نے خالہ زاد بہن سے کہا کہ آپ عذرا کا رشتہ کسی اچھی جگہ کیوں نہیں دیتیں؟ رشتہ دار یہ رشتہ حاصل کرنے کے خواہشمند ہیں۔ خالہ زاد بہن نے کہا کہ اب بہت مشکل ہے۔ میں ساری عمر مار کھا کھا کر اتنی مفلوج ہو چکی ہوں کہ اب مجھ میں ہمت ہی نہیں کہ گھر والوں کے سامنے ہاتھ اٹھا کر بھیک مانگوں۔ یہ سن کر میں اور پریشان ہُوا۔ اُس وقت میری اپنی شادی تو نہیں ہوئی تھی۔ البتہ ایک لڑکی سے میرا رشتہ طے ہو چکا تھا۔ میں نے بہت غور کیا۔ خالہ زاد بہن کی بیٹی سے میرا رشتہ ہو سکتا تھا لیکن ایک تو جہاں میرا رشتہ طے ہُوا تھا ہماری باہمی رضامندی سے ہُوا تھا۔ اگر میں خود اِدھر سے رشتہ کرتا تو اُدھر میں زیادتی کا مرتکب ہوتا اور اِدھر اگر ایسے میں اپنے آپ کو آمادہ کر بھی لیتا تو بہت مشکل تھا۔ البتہ اگر کوئی دو تین سال پہلے میری ان لوگوں سے ملاقات ہوئی ہوتی تو شاید عذرا کو میں باہر نہ جانے دیتا۔ ان لوگوں نے الطاف کو رشتہ دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ بہرحال اس کے باوجود میں نے فیصلہ کیا کہ کچھ نہ کچھ کروں گا۔

لوگ ایک غلطی کرتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ بیٹی کا رشتہ دولت مند گھرانے میں دو تو بیٹی سُکھی رہے گی۔ دولت کو سامنے رکھو تو کردار کی اچھائی بُرائی نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے۔ بیٹیوں والے اس خوش فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ جو لڑکا ملک سے باہر کام کر رہا ہے دولت اسی کے پاس ہے لہٰذا اسی کو داماد بناؤ۔ اس کا نتیجہ دیکھ لیں۔

اُسی دن میں نے اس گاؤں میں اپنی والدہ کے ایک دُور پار کے رشتہ دار سے بات کی۔ میں نے انہیں کہا کہ آپ لوگ عذرا کا رشتہ کیوں نہیں مانگتے؟ انہوں نے کہا کہ آپ لوگ عذرا کا رشتہ دیں تو ہم ضرور مانگیں گے۔ میں نے پھر خالہ زاد بہن سے بات کی۔ خالہ زاد بہن نے کہا کہ کوشش کر کے دیکھ لو لیکن مجھے یقین نہیں آتا کہ میرا خاوند اور دیور مان جائیں گے۔ ہم باتیں کر رہے تھے کہ عذرا نے ہماری باتیں سن لیں۔ اس نے مجھ سے علیحدہ بات کی کہ ماموں آپ خواہ مخواہ اَن دیکھی

راہوں پر چل رہے ہیں' چونکہ ہم' ہم عمر تھے اور ہم میں بہت زیادہ ذہنی ہم آہنگی پیدا ہو چکی تھی اس لئے عذرا نے میرے ساتھ بے تکلفی سے بات کی۔ اس نے کہا میرے چچا نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میرا رشتہ الطاف کو دیں گے۔ آپ کیوں پریشان ہو رہے ہیں۔ اب میرا رشتہ وہاں ہی ہو گا۔

میرے منہ سے بے اختیار یہ نکل گئی کہ عذرا! کیا تم خود بھی یہی چاہتی ہو؟ عذرا کے منہ سے نفرت انگیز ہنسی نکل گئی۔ اس نے کہا کہ میری مرضی کچھ بھی نہیں۔ اگر اس الطاف کو آپ دیکھ لیں تو اس کے پاس کم از کم میں بیٹھ کر کھانا بھی نہیں کھا سکتی یہ والدین کا فیصلہ ہے۔ جس جگہ پھینکیں گے وہی میرا فیصلہ ہو گا۔ اس نے کہا کہ رشتے میں آپ میرے ماموں لگتے ہیں لیکن ماں کے بعد سب سے زیادہ مہربان' ہمدرد اور اپنا کسی کو پایا ہے تو وہ صرف آپ ہیں۔ بعض باتیں آپ کو ایسی بھی بتا رہی ہوں جو آج تک میں اپنی ماں سے بھی نہ کہہ سکی۔

اس کشمکش میں مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا کروں۔ میں نے عذرا کے والد پہلی دفعہ اپنی اس خواہش کا اظہار کیا کہ آپ لوگ برادری سے باہر عذرا کا رشتہ نہ دیں۔ برادری کے اندر ہی رشتہ دینا بہتر ہو گا۔ میں نے یہ بھی کہا کہ محمد اسلم (میری والدہ کے کزن) اپنے بیٹے کے لئے عذرا کے رشتے کے خواہشمند ہیں۔ عذرا کے والد سے میری آدھی رات تک باتیں ہوتی رہیں۔ آخر انہوں نے کہا ٹھیک ہے کہ میں محمد اسلم کو رشتہ دوں گا لیکن بھائی وغیرہ سے مشورہ کرنے کے بعد۔ میں نے جا کر محمد اسلم سے کہا کہ آپ ان سے رشتہ باضابطہ طور پر مانگیں۔

میں نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا کہ عذرا کا رشتہ الطاف کو نہ ملے۔ نہ تو لڑکا ذہین تھا نہ خوبصورت بلکہ قبول صورت بھی نہ تھا اور کردار کے لحاظ سے بھی کورا تھا اور پھر انگلینڈ کا آزاد ماحول اور اسلام سے دوری بھی ہو تو کافرانہ آزادی اپنا رنگ دکھاتی ہے۔ میں نے اللہ کے حضور بھی رات کو رو کر دعا مانگی' یا ربّ' عذرا کو عذاب سے بچا لے۔ عذرا کے لئے میں بڑی سے بڑی قربانی دینے کے لئے تیار ہو گیا۔ مجھے عذرا ایک معصوم اور فرشتہ سی نظر آتی تھی میں اپنی خالہ زاد بہن اور اس کی اولاد کو اتنے جذبات سے چاہنے لگا تھا جس کا تصوّر بھی تحریر میں ممکن نہیں۔

اس کا ایک نفسیاتی پہلو یہ بھی نکلتا ہے کہ بچپن میں میری والدہ فوت ہو گئیں اور پیار پھر کسی سے بھی نہ مل سکا۔ میرا ایک ایک انگ ان لوگوں کے لئے بے چین ہونے لگا۔ گو میں آج شادی شدہ ہوں۔ جس سے میں نے شادی کی وہ مجھے چاہنے والی خوبصورت بیوی ہے لیکن خالہ زاد بہن اور اس کے بچّوں کے ساتھ میرا والہانہ لگاؤ ایک سمندر کی طرح موجزن تھا۔ جتنا عرصہ میں وہاں رہا خالہ زاد بہن کا بیٹا سکول کے بعد دو تین دن تک میرے پاس اس طرح سوتا رہا جس طرح معصوم بچّہ ماں کے پاس۔ مجھے جب عذرا کے والد نے تسلی دی کہ اب وہ عذرا کا رشتہ اسلم کے لڑکے کو دیں گے تو مجھے بہت خوشی ہوئی۔ عذرا اور اس کی چھوٹی بہن بلقیس نے میرے الوداع ہونے پر رو رو کر برا حال کر لیا۔

میں واپس کوئٹہ چلا گیا۔ مجھے بعد میں پتہ چلا کہ میرے جانے کے بعد الطاف کی برادری بھی سرگرم ہو گئی۔ انہیں اطلاع مل گئی کہ وہ لڑکا جو کوئٹہ چلا گیا ہے' رشتہ الطاف کو نہیں دلوائے گا۔ الطاف کے گھر والوں نے عذرا کے چچا کو مزید مراعات دے کر اپنے قدموں میں گرا لیا اور الطاف کو فون پر اطلاع دی گئی کہ جلدی پہنچو۔ وہ ہفتہ کے اندر اندر پاکستان پہنچ گیا۔ اِدھر کوئٹہ میں مَیں سکون کے ساتھ اپنی سروس کر رہا تھا۔ تقریباً" پندرہ دن کے بعد ایک خبر نے مجھے لرزا کر رکھ دیا۔ یہ خبر مجھے محمد اسلم کی بیٹی نے بذریعہ خط دی کہ عذرا کو الطاف کے ساتھ باندھ دیا گیا ہے۔

تفصیل کچھ اس طرح تھی کہ جب الطاف پاکستان پہنچ گیا اور تیاریاں شروع ہو گئیں۔ سب بے بس تھے' کیونکہ اصل معاملہ عذرا کے چچا اور والد کے ہاتھ میں تھا۔ دو تین دن میں شادی کی تاریخ پکی کر دی گئی۔ الطاف بارات لے کر عذرا کے گھر آیا اور نکاح ہو گیا۔ گاؤں میں کوئی لڑکی شرم و حیا سے انکار کی وجہ نہیں بتا سکتی۔ مجھے یہ بھی خط میں لکھا گیا کہ نکاح کے فوراً" بعد جب عذرا سے اپنے رشتہ دار مل رہے تھے تو عذرا بے ہوش ہو گئی۔ بعد میں ہم نے تصدیق بھی کی۔ بخدا یہ بات بالکل سچ ہے اور مجھے بعد میں خالہ زاد بہن نے بھی بتایا تھا۔ دو گھنٹے لگاتار عذرا بے ہوش رہی۔ ہوش میں لانے کے تمام حربے ناکام ہو گئے۔ آخر عذرا کی والدہ سب کے اصرار پر آگے بڑھیں اور انہوں نے بیٹی کے کان میں عذرا عذرا کے نام

سے پکارا تو عذرا نے معمولی سی آنکھیں کھولیں۔ مجھ کو سب نے بتایا کہ عذرا نے جو سب سے پہلے الفاظ ہوش میں آنے کے بعد کہے وہ یہ ہیں —— "ماموں آ گئے ہیں؟" —— عذرا کی سب بہنیں اور ماں رونے لگیں اور عذرا یہ سننے پر کہ ماموں نہیں آئے، پھر بے ہوش ہو گئی۔ سوا تین گھنٹے بعد ہوش میں آئی اور اس نیم مُردہ لاش کو دلہن کے کفن میں لپیٹ کر الطاف ڈولی لے گیا۔

کچھ عرصہ کے بعد الطاف عذرا کو لے کر انگلینڈ چلا گیا۔ اس کے بعد میرا عذرا سے کوئی رابطہ نہ رہا۔ البتہ میں ہر سال اپنی خالہ زاد بہن اور اس کی اولاد کو ملنے جاتا رہا۔ بعد میں خاموشی سے میری شادی ہوئی۔ میں نے کسی کو مدعو نہ کیا۔ گوجر خان جا کر عذرا کے حالات کا پتہ چلتا رہا۔ عذرا نے شروع میں الطاف کو قبول کرنا چاہا لیکن الطاف کی صحبت اور کردار بد نے عذرا کو بہت متنفر کیا لیکن عذرا نے والدین سے کبھی گِلہ نہ کیا اور یوں اُس کی زندگی کانٹوں کے بستر پر رواں دواں رہی۔

اب عذرا کے خاوند نے گاؤں میں ایک بڑی کوٹھی بنا لی ہے اور بہت بڑی حویلی بھی۔ دس سال گزرنے کے باوجود ان کے گھر اولاد نہ ہو سکی۔ ڈاکٹروں نے کہہ دیا ہے کہ عذرا سے اولاد ممکن نہیں۔ عذرا کو نہ اپنے آپ سے دلچسپی ہے اور نہ زندگی سے۔

اس دفعہ میری ملاقات کوئی دس سال بعد عذرا سے ہوئی۔ وہ مجھے مل کر رونا چاہتی تھی لیکن اس کی آنکھوں میں آنسو شاید ختم ہو چکے ہیں۔ میں نے عذرا کا گھر دیکھا۔ بہت بڑا گھر ہے لیکن ان تمام کمروں سے وحشت ٹپکتی ہے کیونکہ عذرا ایک چلتی پھرتی زندہ لاش کی طرح اپنی زندگی کا بوجھ اٹھائے پھر رہی ہے۔ عذرا نے اپنا تعلق خداوند تعالیٰ سے جوڑ رکھا ہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ میں کسی کی زندگی برباد نہیں کرنا چاہتی۔ میں کسی کی زندگی بنانے کے قابل بھی نہیں ہوں۔ الطاف بے مروّت سہی لیکن میں کسی سے انتقام نہیں لینا چاہتی بلکہ چاہتی ہوں کہ ان سب کو میری خوشیاں بھی ملیں جنہوں نے مجھے قدم قدم پر زخم لگائے ہیں۔ اس نے کہا کہ میں الطاف کی دوسری شادی کراؤں گی۔

میں حیران ہُوا کہ یہ کیا کہہ رہی ہے۔ مجھے کوئی تین ماہ بعد پتہ چلا کہ دُھن کی

پکی عذرا نے واقعی الطاف کی نہ صرف شادی کرا دی ہے بلکہ گھر کی چابیاں، تمام زیور، ہر ایک چیز نئی دلہن کے حوالے کر دی ہے۔ اور خود گھر کے ایک طرف چھوٹے کمرے میں مصلیٰ بچھائے بیٹھی ہوئی ہے۔ انگلستان نے اسے بندوں سے متنفر کر کے اللہ کے حضور بٹھا دیا ہے۔

پرنالہ وہیں ہے

یہ ایک بھولی بسری کہانی ہے جو میں آپ کو اپنے بیٹے کے اصرار پر سنا رہی ہوں۔ میری یہ آپ بیتی پچیس سال پہلے کی ہے۔ اگر میں نہ بتاتی تو آپ کو پتہ نہ چل سکتا کہ میں پرانی کہانی سنا رہی ہوں کیونکہ اس کہانی میں بیان کیے گئے حالات اور واقعات ہمارے دیہات اور قصبوں میں آج بھی وہی ہیں جو پہلے ہوتے تھے۔ بجلی، سڑکوں، تعلیم اور دبئی کے پیسے نے ان لوگوں پر کوئی اثر نہیں کیا، حتیٰ کہ ٹیلی ویژن کے ڈراموں کا بھی کوئی اثر نہیں ہوا۔

میری شادی میرے ایک دور کے چچا کے بیٹے کے ساتھ ہوئی تھی۔ اس وقت بھی ذات برادری میں رشتے کرنے کا رواج عام تھا۔ بیٹی کا رشتہ دوسری ذات یا برادری میں کرنے کو بے غیرتی سمجھا جاتا تھا اور اگر کوئی شخص اپنی بیٹی دوسری برادری میں بیاہ دیتا تو اپنی برادری اس کا حقہ پانی بند کر دیتی تھی۔ اس قسم کے رشتے طے کرنے سے لوگ اس لئے بھی گھبراتے تھے کہ وہ سمجھتے تھے کہ اس سے نسل خراب ہو جاتی ہے۔

میری شادی بدلے کی شادی تھی جسے وٹے سٹے کی شادی بھی کہا جاتا ہے۔ میری ایک نند میری شادی سے پہلے میرے بڑے بھائی سے بیاہی ہوئی تھی۔ میرا خاوند شہر میں ملازمت کرتا تھا اور اس کے دوسرے بھائی کاشتکاری کرتے تھے۔

میرے والد صاحب اور میرے سسر کے درمیان جائیداد کی تقسیم کا تنازعہ چل رہا تھا۔ جب میرے بھائی کی شادی چچا کی بیٹی کے ساتھ ہوئی تو تنازعہ ٹھنڈا پڑ گیا کیونکہ چچا بیٹی کا رشتہ دے کر خاموش ہو گیا تھا لیکن جب میری شادی اس کے بیٹے کے ساتھ ہوئی تو وہ پھر شیر ہو گیا اور اس نے اپنے بیٹوں کو بھڑکانا شروع کر دیا کہ جائیداد کا تنازعہ پھر شروع کریں۔ اب میرے باپ کی دکھتی رگ میرے سسر کے

ہاتھ میں آگئی تھی اور وہ دُکھتی رگ میں تھی۔ میرا سُسر خدا اُسے جنت نصیب کرے، فسادی آدمی تھا۔ اس طرح کے فسادی آدمی ہر ذات برادری میں پائے جاتے ہیں۔ ان کا کام صرف یہی ہوتا ہے کہ لڑائی جھگڑے کی آگ جلتی رہے اور وہ اسی میں مزہ لیتے ہیں چاہے ان کا اپنا گھر جل جائے۔

مسئلہ صرف یہ تھا کہ زمین کے ایک ٹکڑے کی ملکیت پر جھگڑا تھا۔ یہ ٹکڑا ایک عورت کی ملکیت تھا جو بے اولاد مری تھی۔ یہ عورت میرے والد صاحب کی پھوپھی لگتی تھی اور میرے سسر کی سوتیلی دادی تھی۔ یہ زمین اس عورت کے جہیز میں آئی تھی اور اس کے نام تھی۔ وہ عورت جب مرنے لگی تو میرا سسر اپنے ساتھیوں کی مدد سے اس عورت کو اپنے گھر لے آیا اور جب اس پر نزع کا عالم طاری ہُوا تو اس کی چارپائی اٹھائی اور اسے کچہری لے جا کر پکّے کاغذ پر اس کا انگوٹھا لگوا لیا۔ اس سے زمین کا یہ ٹکڑا میرے سسر کے پاس آگیا۔ یہ باتیں ہم لوگوں کے ہوش سنبھالنے سے پہلے کی ہیں۔ اس پر مقدمہ بازی ہوئی اور اس کا فیصلہ میرے والد صاحب کے حق میں ہوگیا۔ میرے سسر نے اس پر اپیل کر دی اور وہ اپیل کئی سال تک اسی طرح پڑی رہی۔ پھر اس پر بھی مقدمہ چلا اور اس کا فیصلہ میرے سسر کے حق میں ہوگیا۔ اس پر میرے والد صاحب نے ہائی کورٹ میں اپیل دائر کر دی۔

ہمارا گاؤں ایک چھوٹا سا قصبہ تھا جس میں کئی برادریاں آباد تھیں۔ ایک برادری میں ہی اگر آپس میں مقدمے بازی شروع ہو جائے تو پھوٹ پڑ جاتی ہے اور برادری دو حصّوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ اس کا نقصان یہ ہوتا ہے کہ دوسروں کے مقابلے میں برادری کی عزّت دو کوڑی کی رہ جاتی ہے۔ جب ہماری مقدمہ بازی شروع ہوئی تو برادری کے بزرگوں نے صلح صفائی کرانے کی کوشش کی اور اس صلح صفائی اور بزرگوں کے دباؤ کے نتیجے میں میرے سسر نے وعدہ کیا کہ وہ برادری میں بیٹھ کر ہی یہ مسئلہ حل کر لے گا اور عدالتوں میں جانے کی نوبت نہیں آئے گی۔ بزرگوں کے کہنے پر ہی اس نے اپنی بیٹی کا رشتہ میرے بڑے بھائی کو دے دیا اور اختلاف کچھ عرصے کے لئے کم ہوگیا۔

اِدھر میرے والد صاحب نے بیٹے سے کہا کہ اپنی بیوی کے ذریعے اپنے سُسر پر دباؤ ڈالو کہ وہ اپنے مطالبے سے دستبردار ہو جائے۔ دیہاتوں کی یہ سیاست بڑی خطرناک ہوتی ہے۔ کسی کی بیٹی بیاہ کر آجائے تو اس بیچاری کے ماں باپ اپنی پگڑی بھی لڑکے والوں کے قدموں میں رکھنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ میرے بھائی نے پہلے تو ٹال مٹول کی، پھر باپ کے مجبور کرنے پر اپنی بیوی کے ذریعے اپنے سسر کے نام پیغام بھیجا۔ پیغام یہ تھا کہ زمین سے دستبردار ہو جاؤ، ہم اس کا انتقال تمہاری بیٹی کے نام کر دیں گے۔

سُسر کوئی معمولی ذہن کا آدمی نہیں تھا۔ اس کا شمار اس سیاست کے استادوں میں ہوتا تھا۔ اس نے ہم سب گھر والوں کی دعوت کی اور بڑے اچھے طریقے سے ہمیں ملا۔

"مجھے آپ کا پیغام مل گیا تھا" —— اس نے میرے والد صاحب سے کہا —— "آپ کی یہ بات سن کر مجھے بڑی خوشی ہوئی ہے کہ آپ زمین کا میری بیٹی کے نام انتقال کرا دیں گے۔ میرا خیال یہ ہے کہ آپ اپنی اپیل واپس لے لیں۔ میں زمین خود اپنی بیٹی کو دے دوں گا"۔

"اپیل تو اس لئے کی ہے کہ دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہو جائے" —— میرے والد صاحب نے کہا —— "عدالت کا فیصلہ ہو گیا تو پتہ چل جائے گا کہ اصل حقدار کون ہے"۔

"پھر میرے لئے کیا حکم ہے؟" —— میرے سُسر نے کہا —— "میں تو یہی کر سکتا ہوں کہ عدالت کے فیصلے کا انتظار کروں۔ فیصلہ میرے حق میں ہوگیا تو پھر میں نہیں کہہ سکتا کہ زمین اپنی بیٹی کو دوں گا یا نہیں۔ آپ کے حق میں فیصلہ ہوگیا تو پھر جو جی میں آئے کریں"۔

"ہم تو زمین تمہاری بیٹی کے نام کر دیں گے" —— والد صاحب نے کہا۔

میرا سُسر بھی جانتا تھا کہ یہ سب باتیں ہی باتیں ہیں۔ اسے یہ بھی پتہ تھا کہ اس کی بیٹی کے نام زمین منتقل کرنے کا مطلب بھی یہی تھا کہ زمین ہمارے ہی خاندان میں رہے گی۔

پھر اس نے برادری کے بزرگوں کے ذریعے یہ دباؤ ڈالا کہ اگر نذیراں کا (میرا) رشتہ اس کے بیٹے کو دے دیا جائے تو وہ زمین کے بارے میں بات بھی نہیں کرے گا۔ میرے والد اور بھائیوں کو خطرہ تھا کہ میرا رشتہ لے کر وہ کوئی اور داؤ کھیلے گا اور پہلے سے زیادہ پریشان کرے گا۔ والد صاحب نے بزرگوں سے اپنے اس خدشے کا اظہار کیا۔ بزرگوں نے ایک پنچائت بلائی اور میرے سسر نے سب کے سامنے وعدہ کیا کہ وہ میرا رشتہ لے کر پریشان نہیں کرے گا۔ اس کے بعد اس وعدے پر اس کے قائم رہنے کے لئے دعا مانگی گئی اور والد صاحب نے سب کے سامنے اقرار کیا کہ وہ میرا رشتہ اس کے بیٹے کو دینے پر رضامند ہیں۔

میری شادی بھی جلد ہی ہو گئی۔ میرا خاوند ایک دوسرے شہر میں ریلوے میں ملازم تھا اور کبھی کبھی گھر آیا کرتا تھا۔ ایک بار اس نے دبے لفظوں میں اپنے ماں باپ سے کہا کہ مجھے شہر میں ہانڈی روٹی کی بڑی دقت ہوتی ہے' میں نذیراں کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔ میرے ساس سسر نے سختی سے انکار کر دیا۔ انہوں نے کہا کہ ہم نذیراں کو اپنی خدمت کے لئے لے کر آئے ہیں۔ میرا خاوند مایوس ہو کر واپس چلا گیا۔

میرا سسر جو اپنی بیٹی کی شادی کے بعد دبا دبا سا رہتا تھا' ایک دم شیر ہو گیا۔ اس نے مجھے کہا کہ اپنے باپ سے کہو' اپنی اپیل واپس لے لے۔

"چچا جان!" —— میں نے کہا —— "آپ کی بات تو ہو چکی ہے۔ وہ تو زمین آپ کی بیٹی کے نام کرا دیں گے"۔

"میں تمہارے باپ کی ساری چالاکیاں سمجھتا ہوں" —— میرے سُسر نے کہا —— "وہ زمین میری بیٹی کے نام تو اس وقت کرائے گا جب اُس کا فیصلہ اس کے حق میں ہو گا اور اس بات میں بھی اس کی چالاکی ہے۔ اس طرح بھی زمین اس کے پاس رہے گی۔ تمہارا باپ اپنی اپیل واپس لے لے تو میں اس زمین کا انتقال تمہارے نام کرا دوں گا"۔

"آپ نے تو بھری برادری میں کہا تھا کہ نذیراں کی شادی کے بعد آپ اس زمین کے بارے میں کوئی بات نہیں کریں گے" —— میں نے ذرا دلیر ہو کر کہا۔

"تم اپنے باپ کی طرح جرح کرتی ہو نذیراں!" —— میرے سسر نے زہریلی مسکراہٹ سے کہا —— "تم یہ نہ بھولو کہ تم اب میری بہو ہو۔ میری بیٹی نے کبھی تمہارے باپ کے سامنے زبان چلائی ہے؟ رہی بات برادری کی تو برادری کے سامنے قسم میں نے کھائی تھی' میرے بیٹوں نے نہیں۔ میرے بیٹے کہتے ہیں کہ یہ زمین ہر حال میں واپس لینی ہے"۔

میں اپنے سسر کی بات اچھی طرح سمجھتی تھی اور اس بات کا مطلب یہ تھا کہ اب اس گھر میں میری زندگی خراب ہونی تھی۔ ابھی میری شادی کو پورے چار مہینے بھی نہیں ہوئے تھے اور میرے سسر نے اپنی سیاست شروع کر دی تھی اور سارا جھگڑا زمین کے جس ٹکڑے پر ہوا تھا' وہ ابھی بنجر پڑا تھا کیونکہ کئی سالوں سے اس پر فصل بھی کاشت نہیں ہوئی تھی۔ اس زمین پر پہلے تو میرے سسر کا قبضہ تھا لیکن میرے بھائیوں نے للکار کر کہا تھا کہ اس زمین پر ہل وہی چلائے گا جسے اپنی جان عزیز نہیں ہو گی۔ اس کے بعد وہ زمین ویران ہو گئی تھی۔

میں نے اپنے سسر کی ساری باتیں اپنے باپ اور بھائیوں سے کہہ دیں۔ میرے باپ نے کہا کہ وہ میرے سسر کو جی بھر کر ذلیل کرے گا۔

"اگر اس نے تمہیں تنگ کرنے کی کوشش کی تو ہم اس کی بیٹی کو طلاق دے دیں گے" —— میرے ایک بھائی نے کہا۔

"اس لڑکی کے خاوند سے بھی پوچھو" —— میرے ایک اور بھائی نے کہا —— "وہ تین بار اپنی زبان ہلا بھی سکے گا یا نہیں۔ وہ تو اپنی بیوی کا غلام بنا ہُوا ہے"۔

میرے اس بھائی کو جو میری نند کا خاوند تھا' اپنی بیوی سے بہت محبت تھی۔ اس کی بیوی بھی بھلی عورت تھی۔ اس نے کبھی اپنے سُسرال کی بُرائی نہیں کی تھی نہ کبھی اپنے باپ کی حمایت کی تھی۔ میرے بھائی نے اسے بڑے آرام سے رکھا ہُوا تھا۔ گھر میں اس کے باپ کے خلاف باتیں ہوتی رہتی تھیں' لیکن اس لڑکی نے کبھی اُف بھی نہیں کی تھی۔ میرے بھائی نے اس کا یہ صِلہ دیا کہ کبھی بھی اسے پریشان نہ کیا۔ اب باپ اور بھائیوں نے اسے کہا کہ اپنے سسر کو دھمکی بھیجو کہ اس

نے نذیراں کو تنگ کیا تو ہم اس کی بیٹی کو نکال دیں گے۔

"اس میں میری بیوی کا کیا قصور ہے؟" —— میرے بھائی نے کہا —— "اور میں نے کبھی ایسی دھمکی دی بھی تو وہ نذیراں کو پہلے باہر نکالیں گے۔ نذیراں کے سکون کے لئے ضروری ہے کہ میری بیوی بھی سکون سے رہے"۔

میرا بھائی ٹھیک کہہ رہا تھا لیکن باپ اور بھائیوں نے اسے کہا کہ وہ تو ہے ہی بے غیرت' اس کے ساتھ بات کرنی بھی فضول ہے۔ میرے باپ نے کہا کہ تمہارا سسر اگر ہر حال میں زمین واپس لینا چاہتا ہے تو اسے مردوں کی طرح میدان میں آنا چاہئے۔

میں نے سسر سے تو یہ ساری باتیں نہ کیں' اسے اس کے پیغام کا صرف یہ جواب دیا کہ زمین کا فیصلہ عدالت ہی کرے گی۔ میری یہ بات سن کر میرا ایک دیور جوش میں آگیا۔ اس نے کہا کہ اس کا فیصلہ ہم خود کریں گے۔

پھر اس کا موقع بھی آگیا۔ میرے دیور نے میرے باپ اور بھائیوں کو پیغام بھیجا کہ ہم زمین میں ہل چلانے جا رہے ہیں جس نے اپنی ماں کا دودھ پیا ہے وہ ہمیں روک لے۔ میں بہت گھبرائی اور اُدھر بھاگی جدھر زمین کا وہ منحوس ٹکڑا تھا۔ وہاں میرے دیور نے ہل جوت لیا تھا اور میرے دوسرے دیور لاٹھیاں اور کلہاڑیاں اٹھائے کھڑے تھے۔ میں اپنے دیوروں کو تو کچھ نہیں کہہ سکتی تھی' اپنے بھائیوں کو روک سکتی تھی۔ ایک للکار سنائی دی اور میں نے دیکھا کہ میرے بھائی بھی لاٹھیاں اٹھائے بھاگے چلے آ رہے ہیں۔ میں بھاگ کر ان کی طرف گئی تاکہ ان کو خون خرابے سے روکوں۔ میرے ایک بھائی نے مجھے زور سے دھکا دیا اور میں زمین پر گری تو میرا سر ایک پتھر پر لگا جس سے میرے سر سے خون نکل آیا۔ میں نے اٹھ کر دیکھا۔ لاٹھیاں اور کلہاڑیاں ایک دوسرے سے ٹکرا رہی تھیں۔ تھوڑی دیر میں چند معتبر لوگ بھی بھاگے بھاگے آئے اور لڑائی رک گئی۔

میرا سسر اپنے بیٹوں کو لے کر تھانے چلا گیا۔ گاؤں میں پولیس آئی۔ گاؤں والوں کے بیانات لئے گئے۔ میرے سر پر پٹی بندھی تھی۔ پولیس نے میرا بھی بیان قلم بند کیا اور میرے بھائیوں اور دو دیوروں کو پکڑ کر تھانے لے گئی۔ اس کے بعد

مقدمہ چلا۔ میں موقعے کی گواہ تھی۔ میرے سسر نے مجھ سے کہا کہ اگر اس گھر میں رہنا چاہتی ہو تو عدالت میں یہ بیان دینا کہ تمہارے بھائیوں نے ہم پر حملہ کیا تھا اور زمین کاشت کرنے کا نام بھی نہ لینا۔ اِدھر میں اپنے گھر گئی تو بھائیوں نے مجھے کہا کہ تم اپنے دیور کا نام لے کر کہنا کہ اس نے مجھے کھیت میں پکڑ کر مارا اور میرا سر کھول دیا تھا اور میرے بھائی مجھے بچانے آئے تھے۔ انہوں نے مجھے یہ بھی کہا کہ فکر نہ کرنا۔ اگر تمہارے خاوند نے تمہیں نکال دیا تو ہم تمہیں سینے سے لگالیں گے۔

میں ایک مشکل میں پھنس گئی تھی۔ اگر میں اپنے بھائیوں کی بات مانتی تو میرا اپنا گھر اُجڑ جاتا۔ ٹھیک ہے میرے بھائیوں نے مجھے کہا تھا کہ وہ مجھے سینے سے لگالیں گے لیکن عورت کی اصل جگہ اس کے خاوند کا گھر ہوتا ہے۔ اگر میں اپنے سسر کی بات مانتی تو میرا میکہ ہمیشہ کے لئے اجنبی ہو جاتا اور میرے بھائی قید ہو جاتے۔ آپ جانتے ہیں کہ میکہ ہی عورت کا مان اور اس کے لئے جائے پناہ ہوتا ہے اگر وہ بھی چھن جائے تو عورت کی کوئی عزّت نہیں ہوتی۔

سوچ سوچ کر میرا دماغ پک گیا۔ میں بڑی ہی عجیب صورتِ حال میں پھنس گئی تھی۔ میرا سُسر تو مجھے دھمکا بھی چکا تھا کہ اگر میں نے اپنے بھائیوں کے خلاف گواہی نہ دی تو مجھے میرے خاوند سے طلاق دلا دے گا۔ میرا خاوند گھر نہیں تھا۔ اگر ہوتا بھی تو اس نے اپنے بھائیوں اور باپ کا ہی ساتھ دینا تھا۔

میں نے خدا سے دعا کی کہ مجھے سیدھا راستہ دکھائے۔ سیدھا راستہ تو میرے سامنے تھا کہ میں سچ بولوں اور اس کے بعد اس کے جو بھی نتائج ہوں' بھگتنے کے لئے تیار رہوں۔ میں نے سچ بولنے کا فیصلہ کر لیا۔

جس روز عدالت میں میری پیشی تھی' اس روز بھی سُسر میرے دماغ پر چھایا رہا لیکن میں نے عدالت میں جا کر وہی بات کہی جو سچ تھی۔

گھر آئے تو سُسر نے کہا کہ تم اپنے گھر جا سکتی ہو۔

ماں باپ کے گھر گئی تو بھائیوں نے دیکھ کر منہ پھیر لیا' لیکن وہی میرا ٹھکانہ تھا۔ میں اور کہیں جا بھی نہیں سکتی تھی۔ میری بھابی جو میری نند بھی تھی' میرا دُکھ سمجھتی تھی۔ میں نے رو رو کر خدا سے دعائیں مانگیں کہ میری مدد کرے۔

ایک روز میری بھابی نے مجھے کہا کہ تمہارا خاوند آیا ہوا ہے اور کہتا ہے کہ ایک دفعہ مل لو تاکہ کوئی فیصلہ ہو سکے۔ مجھے تھوڑی سی امید ہوئی کہ شاید خدا میری مدد کرے۔

خاوند سے ملی تو اس نے پہلی بات یہی پوچھی کہ کیا ارادے ہیں۔ میں نے اسے صاف کہا کہ تمہارے پاس رہنا چاہتی ہوں۔ اس نے کہا کہ میں تمہیں اپنے ماں باپ کے گھر میں نہیں رکھوں گا' اپنے پاس رکھوں گا۔ اس کے پاس کوارٹر تھا۔ اس نے مجھے کہا کہ میں جب چاہوں اس کے پاس چلی آؤں۔

خدا نے میری دعائیں سن لی تھیں۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ گھر سے نکلتی کیسے۔ بھائیوں کو پتہ چلتا تو وہ میری ٹانگیں توڑ دیتے۔ یہ مسئلہ ایسا تھا کہ ماں یا بھابی کو بھی رازدار نہیں بنا سکتی تھی۔ میں سوچتی رہی اور آخر ایک روز اس کا حل بھی نکل آیا۔

میں نے خاموشی سے اپنے کپڑے ایک گٹھڑی میں باندھے' اپنے پیسے اور زیور لیا اور ایک روز رات کے دس بجے گھر سے نکل آئی۔ مجھے معلوم تھا کہ ہمارے قصبے کے ریلوے سٹیشن سے رات کے گیارہ بجے ایک ریل گاڑی گزرتی ہے جو اگلی صبح اُس شہر میں پہنچا دیتی ہے جہاں میرا خاوند ملازم تھا۔

میں گھر سے نکلی تو سب لوگ سو رہے تھے۔ دیہاتی قصبوں میں رات دس بجے کا مطلب شہروں کی آدھی رات ہوتا ہے۔ میں ایک گلی سے مُڑ رہی تھی کہ سامنے سے ایک نوجوان آ ٹکرایا جسے دیکھ کر میں گھبرا گئی۔ وہ ہماری ہی برادری کا تھا۔ آوارہ اور بدمعاش تھا۔ جواریوں کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا تھا۔ میرا امیدوار بھی تھا' لیکن مجھے اس سے سخت نفرت تھی۔ اب اس وقت وہ مجھے ملا تو میں ڈر گئی۔ اگر وہ اس وقت میری مجبوری سے فائدہ اٹھانا چاہتا تو میں فریاد بھی نہیں کر سکتی تھی۔

"کہاں جا رہی ہو؟" —— اس نے میرا رستہ روک کر بڑے آوارہ لہجے میں پوچھا۔

میں نے اسے کہا کہ میرے راستے سے ہٹ جاؤ ورنہ تمہارا خون کر دوں گی۔ میں نے اسے یہ بھی کہا کہ میں اپنی عزت کی حفاظت کرنا جانتی ہوں۔

"مجھے تو تم نے آوارہ اور بدمعاش کہہ دیا ہے" —— اس نے کہا —— "لیکن اپنے بارے میں نہیں بتایا کہ چوری چوری کہاں جا رہی ہو"۔

میں نے اسے بتایا کہ اپنے خاوند کے پاس جا رہی ہوں۔ اس نے کچھ بھی نہ کہا بلکہ ہاتھ آگے بڑھا کر میرے ہاتھ سے گٹھڑی لے لی اور کہنے لگا' چلو۔ وہ میرے ساتھ ریلوے سٹیشن تک گیا اور مجھ سے پوچھے بغیر جا کر میرا ٹکٹ لے آیا۔ اسے معلوم تھا کہ میرا خاوند کس شہر میں ملازم ہے۔ میں نے اسے پیسے دیئے تو اس نے واپس کر دیئے۔ گاڑی ابھی نہیں آئی تھی۔ اس نے کہا کہ وہ مجھے گاڑی میں سوار کرا کے جائے گا۔

"تم مجھے آوارہ سمجھو یا بدمعاش سمجھو" —— گاڑی چلنے لگی تو اس نے مجھے کہا —— "لیکن یہ کبھی نہ بھولنا کہ میرے دل میں تمہاری محبت ہے۔ میں تمہارے لئے بدمعاش نہیں ہو سکتا"۔

گاڑی صبح اُس شہر پہنچی تو اپنے خاوند کو تلاش کرنا مشکل نہ تھا۔ میں نے ایک قلی سے پوچھا۔ اس نے میرے خاوند کو بلا لیا۔ مجھے دیکھ کر میرے خاوند کا جو ردِّعمل تھا اور میری جو جذباتی کیفیت تھی اس کی تفصیل نہ ہی پوچھیں۔

میں نے خاوند کو بتایا کہ میں کسی کو بتائے بغیر آئی ہوں۔ یہ سن کر خاوند نے اسی وقت ایک خط اپنے والد کو اور دوسرا میرے والد کو لکھا کہ میرے متعلق پریشان نہ ہوں' میں یہاں آ گئی ہوں۔ ایک ہفتے بعد مجھے میرے والد کا اور میرے خاوند کو اس کے والد کا خط ملا۔ دونوں خطوں کی تحریر مختلف تھی' مطلب ایک ہی تھا۔ ہمیں لکھا گیا تھا کہ ہم ان کے لئے اور وہ ہمارے لئے مر گئے ہیں۔ میرے والدین نے اس میں اپنی بے عزتی محسوس کی تھی کہ ان کی بیٹی ان کی مرضی اور ذہنیت کے خلاف اپنے خاوند کے پاس چلی گئی ہے اور یہی جرم میرے خاوند کا تھا کہ اس نے اپنے والدین کی ذہنیت کے خلاف اپنی بیوی کو گھر میں داخل ہونے کی اجازت دے دی تھی۔

آپ جانتے ہیں کہ اس قسم کی شادیوں میں اپنی اولاد کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں ہوتی بلکہ انہیں اپنی سیاست کے ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے یا انہیں

شطرنج کے مہرے بنا لیا جاتا ہے۔ میں یہ بھی دیکھ رہی تھی کہ میرے بھائی نے میرے خاوند کی بہن کو اپنے والدین کی مرضی کے خلاف گھر میں رکھا ہُوا تھا۔ ان میاں بیوی کے درمیان وہی پیار تھا جو مجھ میں اور میرے خاوند میں تھا۔ یہ ایک بغاوت تھی جو ہم نے کی تھی۔ میں کہتی ہوں کہ ایسی بغاوت ضروری ہوتی ہے حالانکہ ہمیں الٹی میٹم دے دیا گیا تھا کہ جہاں ہو وہیں جیئو اور وہیں مرو' ادھر نہ آنا ورنہ تمہارے ساتھ بہت بُرا سلوک کیا جائے گا۔

ہم دونوں کو افسوس تو بہت ہُوا۔ ابھی ہم نوجوانی کی عمر میں تھے جہاں انسان اپنے آپ کو بچہ ہی سمجھتا ہے اور اپنے سر پر والدین کے ہاتھ کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔ ہم دونوں نے اس مسئلے پر غور کیا کہ ان بوڑھوں کو کس طرح راضی کیا جا سکتا ہے۔ میرے خاوند نے سوچ سوچ کر کہا کہ ان پتھروں کو توڑنا ممکن ہی نہیں۔ وہ اپنی ناک کی خاطر اپنی اولاد کی زندگی جہنم بنا دیں گے۔ ہم چُپ ہو گئے۔

ایک سال گزر گیا۔ میں نے اپنے خاوند سے پوچھ کر اپنے والدین کو ایک بار پھر خط لکھا' لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ پھر اللہ نے ہم پر یہ کرم کیا کہ مجھے پہلے بچے سے نوازا۔ یہ لڑکا تھا۔ یہی وہ لڑکا ہے جو ماشاء اللہ آج میری یہ کہانی لکھ رہا ہے۔ میرے خاوند نے محسوس کیا کہ یہ خوشی کا موقع ہے۔ اس کی اطلاع والدین کو دینی چاہئے۔ وہ آتے یا نہ آتے یہ ان کی سوچ تھی۔ ہم نے اپنا فرض اس طرح ادا کر دیا کہ میرے خاوند نے اپنے والد کو بچے کی پیدائش کی اطلاع دے دی۔ ہمیں ایسی توقع نہیں تھی کہ آنا تو درکنار وہ مبارک کا خط بھی لکھیں گے۔

اس خط کے دس گیارہ روز بعد میرا خاوند پچھلے پہر وقت سے پہلے گھر آ گیا اور میں یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ اس کے پیچھے پیچھے اس کی ماں گھر میں داخل ہوئی۔

"میرا پوتا کہاں ہے؟" —— اس کے منہ سے پہلے الفاظ یہ نکلے۔

اس نے نومولود بچے کو جو ابھی ایک مہینے کا ہی تھا یوں جھپٹ کر اٹھایا جس طرح چیل مرغی کے چوزے کو اٹھا لے جاتی ہے۔ مجھے کچھ ایسا ڈر لگا جیسے میری ساس بچے کو اٹھا کر بھاگ جائے گی۔ بچے کو چوم چاٹ کر اس نے پلنگ پر لٹایا پھر میرے ساتھ لپٹ گئی۔ وہ زارو قطار رو رہی تھی اور یہ خوشی کے آنسو تھے۔

اس نے بتایا کہ وہ گھر والوں کو ایک دربار کا نام بتا کر گھر سے نکلی تھی کہ وہاں سلام کرنے جا رہی ہے۔ یہ مزار ہمارے آبائی قصبے سے پچیس تیس میل دور تھا۔ جس طرح میری ساس نے اپنے جذبات کا اظہار کیا وہ میں اگر لفظ بلفظ سنانا شروع کر دوں تو بات بہت لمبی ہو جائے گی۔ میں اس کے چند ایک الفاظ سنا دیتی ہوں۔

"تُو نے جو کیا اچھا کیا بیٹی!" —— اس نے مجھے الگ بٹھا کر کہا —— "لڑکی کو ماں باپ پرایا مال سمجھتے ہیں' لیکن خود ہی لڑائی جھگڑے پیدا کر کے لڑکی کو نہ پرایا رہنے دیتے ہیں نہ اپنا۔ میں جب تیری عمر میں تھی تو بھی ہمارے بزرگوں نے میرے آگے پہاڑ کھڑے کر دیئے تھے لیکن میں نے کہا کہ میرا اپنا وہی ہے جس کے نام پر میں نے کلمے پڑھ کر انگوٹھا لگایا تھا۔ میں اپنے خاوند کے گھر جا بیٹھی اور اس نے میرے سر پر ہاتھ رکھ لیا تھا..... میں دل میں تیرے خلاف دشمنی رکھ سکتی ہوں لیکن اپنا خون تو دشمن نہیں ہوتا۔ میرے کان میں آواز پڑی کہ میرے بچے کو اللہ نے بچہ دیا ہے تو میں بہت تڑپی۔ اس کے باپ کے ساتھ بات کی تو وہ بولا کہ تُو نے اُدھر کا نام لیا تو ٹانگیں توڑ دوں گا۔ میں کل رات تک تڑپتی رہی۔ اپنے خون کی کشش ایسی تھی کہ صبح نماز پڑھ کر جھوٹ بولا کہ میں دربار پر جا رہی ہوں اور میں چلی آئی"۔

ساس کا یہ عالم تھا کہ میں زچگی سے سنبھل چکی تھی' لیکن اس نے مجھے زبردستی لٹا دیا اور میرے گھر کا کام کاج سنبھال لیا۔ میرے خاوند کو اس نے بہت دوڑایا۔ بے شمار چیزوں کی فہرست لکھوائی مثلاً" بادام' پستہ وغیرہ وغیرہ۔ اس طرح وہ میری غذا کے انتظام میں اور بچے کی دیکھ بھال میں ایسی مگن ہوئی کہ تین دن گزر گئے۔ بات بات پر وہ کہتی تھی —— "تمہیں کیا پتہ! تم ابھی خود بچے ہو۔ تم بچے کو سنبھالنا کیا جانو"۔

تیسری شام میرا سسر بھی آ گیا۔ اُس نے تھوڑی دیر اپنا رعب جمایا۔ میری ساس کو کچھ ڈانٹا بھی' لیکن وہ اپنے جذبات پر قابو نہ پا سکا۔ اس نے کہا کہ اسے معلوم تھا کہ میری ساس کسی مزار پر نہیں گئی' وہ اِدھر ہی آئی ہے اسی لئے اس نے دو دن انتظار کیا تھا ورنہ وہ اسی شام مزار والے قصبے میں چلا جاتا۔ مختصر یہ کہ وہ بھی

اپنے خون کی کشش سے آیا تھا۔

خون کی کشش کا ہمیں یہ فائدہ ملا کہ ہماری جلاوطنی ختم ہو گئی اور ہمیں اپنے گھر جانے کی اجازت مل گئی۔ ہم بچے کے ساتھ گئے۔ پہلے خاوند مجھے اپنے گھر لے گیا پھر ہم دونوں میرے والدین سے ملنے آئے۔ اس میں دلچسپ بات یہ ہے کہ میرا سُسر میری ساس کو ساتھ لے کر پہلے روانہ ہو گیا تھا۔ اس نے ہمیں بڑی سختی سے کہا تھا کہ کسی کو یہ نہ پتہ چلے کہ وہ ہمارے ہاں آئے تھے۔ سُسر نے واپس جا کر یہ مشہور کر دیا تھا کہ میری ساس دربار پر سلام کے لئے گئی تھی اور وہیں دو دن عبادت کرتی رہی اور میرا سُسر اسے وہاں سے لے آیا۔ آپ یقین کریں کہ میں آج پہلی بار یہ راز فاش کر رہی ہوں۔

اس کے بعد ہمارا آنا جانا لگا رہا' لیکن آپ یہ نہ سمجھیں کہ فلمی کہانیوں کی طرح آخر میں سب ہنسی خوشی رہنے لگے۔ ہمیں کسی نے ہنسی خوشی نہیں رہنے دیا۔ جائیداد کا جو جھگڑا چل رہا تھا وہ چلتا رہا۔ میرے خاوند نے اس جھنجھٹ سے اس طرح جان چھڑالی تھی کہ چھوٹا سا ایک مکان الگ تعمیر کرا لیا تھا اور اس نے اعلان کر دیا تھا کہ ہمیں جائیداد میں سے اور کچھ نہیں چاہئے۔ اس کے باوجود ہمیں اس جھگڑے میں گھسیٹا جاتا رہا جو آدھی صدی پہلے شروع ہُوا تھا —— پرنالہ وہیں رہا۔

بہن جب بیوہ ہوئی

اگر آپ کسی قوم کی ذہنیت کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں تو اس کے ملک میں جا کر وہاں کے جیل خانوں میں قیدیوں کو اور پاگل خانوں میں پاگلوں کو دیکھیں اور وہ کہانیاں سنیں جنہوں نے انہیں مجرم اور پاگل بنایا ہے۔ جیل خانہ اور پاگل خانہ معاشرے کا ذہن لاشعور ہوتے ہیں۔ میں نفسیات کا سٹوڈنٹ رہا ہوں اس لئے میں نفسیات کی روشنی میں بات کر رہا ہوں۔ جس طرح ہمیں خود معلوم نہیں ہوتا کہ ہمارے ذہن لاشعور میں کیا کیا پوشیدہ ہے' اسی طرح معاشرے کو معلوم نہیں ہوتا کہ اس کے افراد کیسی کیسی ناقابلِ یقین حرکتیں (اچھی یا بُری) کر سکتے ہیں۔

میں ایسی ہی ایک کہانی سنا رہا ہوں۔ میں اس وقت ایم۔ اے نفسیات کا سٹوڈنٹ تھا۔ جنگِ عظیم شروع ہو گئی تھی اور گاؤں کے لڑکے دھڑا دھڑ فوج میں بھرتی ہو رہے تھے۔ نفسیات کے کورس میں پاگل خانے کا تجزیاتی دورہ بھی شامل تھا۔ وہاں کے ڈاکٹر ہمیں پاگلوں کے کیس سمجھایا کرتے اور بعض پاگلوں کے ساتھ ہماری بات چیت بھی کرایا کرتے تھے۔

لاہور کے پاگل خانے کا ایک ہندو ڈاکٹر میرے والد صاحب کا دوست تھا۔ اس وجہ سے وہ میری سٹڈی میں بہت دلچسپی لیا کرتا تھا۔ اس نے مجھے ذہنی امراض کے بہت سے کیس دکھائے اور سمجھائے تھے۔ ان میں زیادہ تر لوگ رسم و رواج اور اپنے معاشرے کی اور کئی خرابیوں کی وجہ سے پاگل ہوئے تھے۔ میری ایک بات کو نوٹ کر لیں کہ میں کہانی تو پرانے وقتوں کی سنا رہا ہوں لیکن ذہنی امراض کے جو اسباب ہیں' ان کو ہم نے پرانا نہیں ہونے دیا۔ میں اسے معاشرے کا پاگل پن کہوں گا۔ آج کل تعلیم بلکہ اعلیٰ تعلیم یعنی ڈگریوں والی تعلیم عام ہو گئی ہے اور سائنس نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ خود سائنس دان حیران ہوتے ہیں مگر ہم نے اپنے

معاشرے کو ذرا سا بھی نہیں بدلا' بلکہ پرانے وقتوں کی نسبت اب زیادہ خراب کر دیا ہے۔

ایک بار اس ہندو ڈاکٹر پنڈت گوپال داس نے مجھے ایک مسلمان پاگل دکھایا۔ اس کی عمر چالیس سال سے ذرا کم یا زیادہ تھی۔ لاہور سے بہت دور کے دیہاتی علاقے کا رہنے والا تھا۔ مجھے اس کا نہ اور کسی کا نام یاد رہا ہے۔ پاگل جہلم یا راولپنڈی کے علاقے کا تھا۔ کہانی سنانے کے لئے میں اسے اشرف کہہ لیتا ہوں۔ اس کی داڑھی بڑھی ہوئی اور سر کے بال لمبے ہو گئے تھے۔ پاگل پن میں اسے تین سال سے زائد عرصہ ہو گیا تھا۔ وہ ایک کوٹھڑی میں گھٹنوں پر سر رکھ کر بیٹھا ہوا تھا۔

ہم اس کے پاس گئے تو اس نے سر اٹھا کر ہمیں دیکھا اور اٹھ کر آہستہ آہستہ میرے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ ڈاکٹر گوپال داس نے مجھے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ اس سے ڈرنا نہیں۔ پھر بھی میں ڈر گیا۔ پاگل نے میرا ایک ہاتھ پکڑ لیا اور اسے دبا دبا کر دیکھنے لگا۔ پھر اس کا ہاتھ میرے ہاتھ کو دباتے دباتے میری گردن پر آ گیا۔ پھر اس نے اپنے دونوں ہاتھ میرے سر پر رکھے اور وہاں سے اس کے ہاتھ میرے منہ پر آ گئے۔

"قیامت آ رہی ہے۔ لوگ قتل ہو رہے ہیں" —— اس نے خوف کے لہجے میں کہا —— "قیامت آ رہی ہے..... قیامت آ گئی ہے..... قیامت..... قیامت..... کرو یاد اپنے اللہ کو" —— اور اس کے بعد اس نے ایک ہی رٹ لگانی شروع کر دی —— "آئی قیامت۔ آئی قیامت"۔ اس نے پچاس ساٹھ مرتبہ "آئی قیامت" کہا اور دوڑ کر دیوار کے ساتھ لگ کر اس طرح بیٹھ گیا جیسے چھپنے کی کوشش کر رہا ہو۔ وہ سر اُس جگہ چھپا رہا تھا جہاں فرش اور دیوار آپس میں ملتے ہیں۔ ایسے بھی لگتا تھا جیسے بلی یا کتا پنجوں سے زمین کھود کر اس میں اترنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس کی مدھم سی آواز آ رہی تھی —— "یا اللہ' یا نبیؐ۔ یا اللہ' یا نبیؐ"۔

ڈاکٹر گوپال داس مجھے وہاں سے ہٹا کر ایک طرف لے گیا۔

"اس کی قیامت ہر روز آتی ہے" —— ڈاکٹر گوپال داس نے کہا —— "اس

کے گناہوں کا حساب کتاب ہر روز ہوتا ہے۔ کبھی یہ چیخیں مارنی شروع کر دیتا ہے اور کہتا ہے کہ میں دوزخ کی آگ میں جل رہا ہوں۔ شروع کے دنوں میں یہ بہت چیختا تھا۔ کبھی کبھی پوری رات چیخیں مارتے گزار دیتا تھا۔ اسے دوائیاں اور انجیکشن دے دے کر اس حالت میں لے آئے ہیں کہ اب آرام سے بات کرتا ہے لیکن باتیں وہی کرتا ہے جو پہلے کیا کرتا تھا"۔

اس کی حالت تو میں نے دیکھ لی تھی۔ میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ اس کے پاگل پن کا باعث کیا ہے۔ ڈاکٹر گوپال داس سے پوچھا تو اس نے کہا کہ وہ اس کے دماغی مرض کا باعث بتا سکتے ہیں لیکن میں یہ کہانی اس آدمی سے سنوں جو کبھی کبھی اسے دیکھنے آتا ہے تو یہ بہتر ہو گا کیونکہ میں اس سے کئی سوال پوچھ سکوں گا۔

"وہ جس روز آیا' میں اسے روک کر تمہیں بلا لوں گا" —— ڈاکٹر گوپال داس نے کہا —— "یہ میں تمہیں پہلے بتا دیتا ہوں کہ یہ آدمی اس مریض کو دیکھنے آیا کرتا ہے' وہ اس کا کچھ نہیں لگتا۔ وہ اس کے گاؤں کا رہنے والا ہے' اس قسم کے پاگلوں کو ان کے رشتہ داروں سے نہیں ملوایا جاتا لیکن اس شخص نے مجھ تک رسائی حاصل کر لی اور مجھے بتایا کہ یہ آدمی (اشرف) کیوں پاگل ہوا ہے۔ میرے دل میں ہمدردی پیدا ہو گئی۔ وہ تمہیں بتائے گا کہ میں نے اشرف کے لئے کیا کیا سہولتیں پیدا کر دی ہیں"۔

مجھے دس بارہ دن انتظار کرنا پڑا۔ ڈاکٹر گوپال داس نے اس آدمی کو جو اشرف کو دیکھنے آیا کرتا تھا' اپنے چپڑاسی کے ساتھ میرے گھر بھیج دیا۔ میں اس آدمی کا نام رحیم لکھوں گا۔ وہ بڑی دور سے لاہور آیا کرتا تھا۔ میں نے اسے کھانا کھلایا اور اس کی عزّت افزائی کی۔ اُس وقت اُس کی بھی عمر چالیس [illegible] گئی تھی۔ وہ دیہاتی تھا۔ لباس اور طور طریقوں سے وہ معزّز اور امیر زمیندار لگتا تھا۔ اس نے مجھے جو بات سنائی' وہ میں آپ کو اس کی زبان سے سناتا ہوں۔

چھ سال گزر گئے ہیں۔ اشرف (پاگل) کی بہن قتل ہو گئی۔ یہ بہن جوانی میں بیوہ ہو گئی تھی۔ قتل کے وقت اس کی عمر چوبیس سال سے تین چار مہینے اوپر تھی۔ ایک سال پہلے وہ بیوہ ہوئی تھی۔ اس کا خاوند صرف تین سال زندہ رہا۔ دو سال پہلے

میری بیوی مرگئی تھی۔ یہ لڑکی میرے دل کو اچھی لگتی تھی۔ اس نے بیوگی کا ایک سال گزارا اور قتل ہوگئی۔ قتل بھی دن کے وقت ہوئی۔ اس کی لاش باجرے کی فصل میں پڑی ملی تھی۔

ہماری زمینوں میں باجرے کی فصل جب پوری طرح اونچی ہوتی ہے تو عام قد کا آدمی کھڑا ہو کر بھی اس میں چھُپ جاتا ہے۔ مقتولہ کی لاش مینڈھ سے پانچ چھ قدم فصل کے اندر پڑی تھی۔ اس کا گلا ہاتھوں سے دبا کر مارا گیا تھا۔ تھانیدار ایک سکھ تھا۔ تھانہ پانچ میل دور تھا۔ مقتولہ کے اس بھائی نے اور اس کے باپ نے تھانے جاکر اطلاع دی۔ تھانیدار کو آتے آتے شام ہوگئی۔ اُس زمانے میں پولیس بہت تیز ہُوا کرتی تھی۔ تھانیدار ساری رات مقتولہ کے گھر والوں کے بیان لیتا رہا۔ اس نے نمبردار کو اور گاؤں کے تین چار معزز آدمیوں کو بھی بلایا۔ ان سے اس نے پوچھا ہوگا کہ اس جوان بیوہ کے قتل کی وجہ کیا ہو سکتی ہے۔

اگلا دن بھی تفتیش میں گزر گیا۔ مقتولہ کا پوسٹ مارٹم ہُوا اور لاش گاؤں میں آگئی۔ ہمارے علاقے میں خاندانی دشمنیوں کی وجہ سے قتل اور زخمی ہوتے رہتے ہیں۔ لڑائیاں ہوتی ہیں۔ دونوں طرف کے آدمیوں کا نقصان ہوتا ہے پھر دونوں طرف کے لوگ تھانے چلے جاتے ہیں۔ پولیس کو زیادہ تفتیش نہیں کرنی پڑتی۔ ایسا کبھی کبھار ہوتا ہے کہ کوئی آدمی قتل ہو جائے اور پتہ نہ چلے کہ قاتل کون ہے۔ اس بیوہ کا قتل اسی طرح کا تھا۔

اگلی رات کو بھی تھانیدار ہمارے گاؤں میں ہی رہا۔ اُن دنوں تھانیدار ایسے ہی کیا کرتے تھے۔ رات کو تھانیدار نے مجھے طلب کیا اور کہنے لگا کہ پوسٹ مارٹم کرنے والے ڈاکٹر نے موت کا جو وقت لکھا ہے' اُس وقت تین آدمیوں نے تمہیں جائے وقوعہ کی طرف سے آتے دیکھا تھا۔

میں نے کہا کہ میں اُدھر نہیں گیا تھا۔

"دیکھو رحیم!" —— اس نے مجھے کہا —— "تم اکیلے اتنے زیادہ آدمیوں کو کس طرح جھوٹا ثابت کر سکتے ہو جو یقین سے کہتے ہیں کہ مقتولہ کے ساتھ تمہارا ملنا جلنا تھا اور اس کے ساتھ تم نے ناجائز دوستی قائم کر رکھی تھی۔ مجھے یہ بھی بتایا گیا ہے

کہ وہ تمہیں دیکھ کر بہت خوش ہوتی تھی"۔

"اگر آپ کو مجھ پر یہ شک ہے کہ میں نے لڑکی کو قتل کیا ہوگا تو اس کی کوئی وجہ بھی آپ نے سوچی ہوگی" —— میں نے کہا —— "یہ بالکل صحیح ہے کہ مقتولہ کے ساتھ میرے تعلقات تھے لیکن ناجائز نہیں تھے۔ میرا اس کے ساتھ ملنا جلنا بھی تھا۔ میں تو اس کے ساتھ شادی کرنا چاہتا تھا"۔

"پھر شادی کی کیوں نہیں؟" —— تھانیدار نے پوچھا۔

"عمر میں فرق تھا" —— میں نے کہا —— "اسی لئے میں اس کے ماں باپ سے رشتہ نہیں مانگتا تھا۔ ذات میں تھوڑا سا فرق تھا لیکن اس کی مجھے پرواہ نہیں تھی"۔

تھانیدار کے ساتھ میری بڑی لمبی باتیں ہوئیں۔ یہ میں آپ کو کیا سناؤں۔ میں نے تھانیدار کو منوا لیا کہ مجھ پر اس کا شک بالکل غلط ہے۔ اُس نے مجھے چھٹی دے دی۔ میں اپنے گھر چلا گیا۔ دوسرے دن کسی نے مجھے بتایا کہ مقتولہ کے بھائی اشرف کو تھانیدار نے بلایا ہے۔ نمبردار میری قریبی رشتہ داری کا آدمی تھا۔ اس نے بتایا کہ اشرف کے متعلق تھانیدار کو بتایا گیا ہے کہ اسے باجرے کے اس کھیت میں سے نکلتے دیکھا گیا تھا جس میں مقتولہ کی لاش پڑی ملی تھی۔

مجھے یہ بھی معلوم ہُوا کہ تھانیدار ایک بار پھر جائے وقوعہ پر گیا اور اس نے دیکھا کہ اندر سے فصل کے کئی پودے ٹوٹے ہوئے تھے یا جھک گئے تھے۔ اس سے پتہ چلتا تھا کہ یہاں سے کوئی فصل میں سے گزرا ہے اور دوسری طرف کی مینڈھ تک گیا ہے۔ دو تین آدمیوں نے اسے اس مینڈھ پر جاتے دیکھا تھا۔

بہت بعد کی بات ہے کہ مجھے پتہ چلا تھا کہ تھانیدار نے اشرف پر اس بنا پر شک کیا تھا کہ اس کی بہن کے تعلقات میرے ساتھ تھے۔ اس کا علم اشرف کو ہو گیا اور اس نے بہن کو قتل کر دیا۔ میں نے تھانیدار کو بتا دیا تھا کہ مقتولہ کے ساتھ میری محبت تھی اور وہ مجھے پسند کرتی تھی اور ہم چوری چھپے ملا بھی کرتے تھے۔ تھانیدار نے مجھ سے یہ بھی کہلوا لیا تھا کہ قتل سے بہت دیر پہلے مقتولہ مجھے اسی جگہ مینڈھ پر ملی تھی جہاں فصل کے اندر لاش پڑی پائی گئی تھی۔ تھانیدار نے مجھ سے پوچھا تھا کہ میں اسے وہیں مینڈھ پر کھڑا چھوڑ آیا تھا یا میں وہاں کھڑا رہا تھا اور وہ چلی گئی

تھی۔ میں نے اسے بتایا کہ وہاں زیادہ دیر کھڑے رہنا ٹھیک نہیں تھا۔ میں اسے وہیں چھوڑ کر آگیا تھا۔

تھانیدار کو یہ شک ہُوا تھا کہ اشرف نے اپنی بہن کو میرے پاس کھڑے دیکھ لیا ہو گا اور میں جب وہاں سے آگیا تو اس نے بہن کو قتل کر دیا۔

میرے دل اور دماغ پر اس لڑکی کے قتل کے صدمے کا ایسا اثر تھا کہ میرا دماغ بیکار ہوتا جا رہا تھا۔ میں کسی کے ساتھ اس صدمے کا اظہار نہیں کر سکتا تھا اور میں رو بھی نہیں سکتا تھا۔ انتقام کا جذبہ تو مجھے پاگل کر رہا تھا۔ آدھی رات کا وقت تھا۔ مجھے ایسے محسوس ہُوا جیسے مجھ پر کسی غیبی طاقت کا قبضہ ہو گیا ہو۔ میں گھر سے نکلا اور نمبردار کی ڈیوڑھی میں چلا گیا جہاں تھانیدار ٹھہرا ہوا تھا۔ وہ سویا ہُوا تھا۔ مجھے ایک کانسٹیبل نے بتایا کی ڈیوڑھی کے ساتھ والے کمرے میں اشرف پر تشدّد کیا جا رہا ہے۔ تھانیدار نے اس کا بیان لے کر اس پر بہت جرح کی تھی اور اشرف کے منہ سے ایسی باتیں نکل گئی تھیں جن سے تھانیدار کا یہ شک پکّا ہو گیا تھا کہ اشرف نے غیرت میں اپنی بہن کو قتل کیا ہے۔ اسے تھانیدار نے دو کانسٹیبلوں کے حوالے کر دیا تھا کہ رات کو اس پر تشدّد کرتے رہیں، صبح سے پہلے پہلے یہ اقبالِ جرم کر لے گا۔

میں تھانیدار کو جگانے کے لئے ڈیوڑھی میں جانے لگا تو کانسٹیبل نے مجھے روک دیا۔ میں نے اسے کہا کہ میں اقبالِ جرم کرنے آیا ہوں۔ لڑکی کا قاتل میں ہوں۔ کانسٹیبل نے اندر جا کر تھانیدار کو جگا دیا۔ تھانیدار نے اُسی وقت مجھے اندر بلا لیا اور پوچھا کہ مجھے اقبالِ جرم کا کیوں خیال آگیا ہے۔ میں نے اسے بتایا کہ مجھے کسی نے بتایا ہے کہ ایک بے گناہ آدمی چکّی میں پس رہا ہے۔ ایک تو اس کی بہن قتل ہو گئی ہے، اوپر سے اسی پر شبہ ہو رہا ہے کہ اپنی بہن کو اسی نے قتل کیا ہے۔ میں معزز اور غیرت مند خاندان کا آدمی ہوں۔ میں برداشت نہیں کر سکتا کہ میری پھانسی کا رسّہ کسی بے گناہ کی گردن میں ڈالا جائے۔

"اگر کوئی بے گناہ نہ پکڑا جاتا تو مجھے آپ کبھی نہ پکڑ سکتے" —— میں نے اسے کہا —— "اب اس غریب کو چھوڑ دیں"۔

اُس نے ایک کانسٹیبل کو بلا کر کہا کہ اس پر ایذا رسانی روک دو اور اسے پانی پلا کر بٹھائے رکھو۔ دراصل تھانیدار میرا اقبالی بیان سن کر یقین کرنا چاہتا تھا کہ میرا بیان قابلِ قبول ہے اور یہ دھوکہ نہیں۔ میں نے بیان دے دیا۔ کھوجی کو میرا کھُرا وہاں ملا تھا جہاں میں مقتولہ کے پاس کھڑا رہا تھا اور واپس آگیا تھا۔ اُدھر فصل کے دوسری طرف جو کھُرے تھے وہ مقتولہ کے بھائی اشرف کے تھے۔ فصل کے اندر کوئی کھرا قابلِ شناخت نہیں تھا۔ وجہ یہ تھی کہ فصل گھنی تھی پودے ٹوٹ کر پاؤں کے نیچے آتے تھے۔ تھانیدار نے اشرف کے کھُرے گول کر دیئے۔ کہتا تھا کہ وہ جائے وقوعہ سے بہت دور رہتے تھے۔ دراصل میرا بیان یقین کے قابل تھا۔

"مجھے ابھی شک ہے رحیم یار!" —— سکھ تھانیدار نے دوستوں کے لہجے میں کہا —— "تمہاری اور مقتولہ کی تو محبت چل رہی تھی اور تم نے کہا تھا کہ تعلقات بالکل پاک صاف تھے، پھر تم نے اسے قتل کیوں کیا؟"

"تعلقات کہاں پاک تھے سردار جی!" —— میں نے کہا —— "ادھر وہ جوانی میں بیوہ ہو گئی تھی ادھر میری جوانی میں میری بیوی مر گئی تھی۔ آپ سب سمجھتے ہیں۔ اس نے کہا تھا کہ وہ میرے ساتھ شادی کر کے بہت خوش ہو گی۔ میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ اس کے ماں باپ کو کہوں گا کہ اپنی بیٹی کا نکاح میرے ساتھ کر دیں لیکن مجھے پتہ چلا کہ اس نے اپنی عمر کے ایک آدمی کے ساتھ یاری لگالی ہے۔ مجھے یہ نہیں پتہ چلا کہ وہ کون تھا۔ مجھے اپنا شک رفع کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میرے لئے یہی ثبوت بہت تھا کہ اس نے میرے ساتھ ٹال مٹول شروع کر دی تھی.....

"اُس روز اس طرح ہُوا کہ میں کھیتوں میں سے گزر رہا تھا۔ وہ مجھے دو کھیتوں کے درمیان کھڑی نظر آگئی۔ وہ مینڈھ پر آہستہ آہستہ جا رہی تھی۔ دونوں طرف اونچا باجرہ تھا۔ میں اس کے پاس چلا گیا اور پوچھا کہ وہ کس کے انتظار میں ہے۔ اس نے غصہ نہ کیا۔ اچھے طریقے سے جواب دیا۔ میں نے اسے کہا کہ میں اس کے ماں باپ کو آج کہوں گا کہ ہم دونوں کا نکاح کرا دیں۔ اس نے مجھے منع کر دیا۔ میں نے اسے کہا کہ یوں نہ سہی، پہلے کی طرح ہی سہی۔ اس نے کہا کہ اب وہ میرے ساتھ تعلق نہیں رکھنا چاہتی.....

"مجھے غصہ آگیا۔ میں نے غصے میں جو باتیں کیں' ان کا اس نے غصے سے جواب دیا۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے اس کی گردن دبالی۔ مجھے معلوم نہیں کہ میں اسے جان سے مارنا چاہتا تھا یا نہیں۔ ہُوا اس طرح کہ میں نے اس کی گردن چھوڑی تو وہ گر پڑی۔ اس کے پاس بیٹھ کر دیکھا۔ وہ مرگئی تھی۔ میں نے لاش اٹھائی اور فصل کے اندر پھینک کر فصل کے اندر اندر چلتا دوسری طرف سے باہر نکل گیا"۔

میرے بیان میں بعض باتیں کمزور تھیں۔ میرا بیان صحیح نہیں بنتا تھا لیکن تھانیدار نے تو خدا کا شکر ادا کیا تھا کہ قاتل پکڑا گیا ہے اور اس کی تفتیش ختم ہو گئی ہے۔ اُس نے صبح سویرے گاؤں سے کوچ کیا اور مجھے اپنے تھانے میں لے گیا۔ اشرف کو اس نے چھوڑ دیا۔ مجھے ایک مجسٹریٹ کے پاس لے گئے۔ میں نے اس کو اپنا بیان دیا جو اس نے لکھ لیا۔ مجھے جیل خانے کی حوالات میں بھیج دیا گیا۔

جیل خانے میں میرے عزیز رشتہ دار مجھے ملنے کے لئے آئے۔ انہوں نے مجھے کہا کہ میں عدالت میں جا کر اپنے بیان سے پھر جاؤں۔ میں نے انہیں کہا کہ میں اپنے بیان سے نہیں پھروں گا۔ دوسری ملاقات میں وہ ایک ہندو وکیل کو ساتھ لے آئے۔ وہ بہت لائق اور تجربہ کار وکیل تھا۔ وکیل کو اجازت ہوتی ہے کہ وہ جیل خانے میں اپنے سائل کے ساتھ جتنی لمبی ملاقات کرنا چاہے کر سکتا ہے۔ میرے وکیل نے مجھ سے پوچھا کہ میں نے کیا بیان دیا ہے۔ میں نے اسے اپنا بیان بتایا۔ اس نے کہا کہ پہلے مقدمہ مجسٹریٹ کی عدالت میں جائے گا۔ وہاں میں کہوں کہ میں نے جو بیان دینا ہے وہ میں سیشن کورٹ میں دوں گا۔ جب مقدمہ سیشن کورٹ میں جائے تو میں وہاں کہوں کہ میں نے کسی کو قتل نہیں کیا اور پولیس نے مجھے مار پیٹ کر یہ بیان لیا ہے۔

میں نے وکیل کو بھی صاف کہہ دیا کہ میں اپنے بیان پر قائم رہوں گا۔

میرا باپ عرصہ ہُوا مر گیا ہے۔ اللہ کا فضل ہے' میری زمین بہت ہے۔ میری ماں ہے اور دو بہنیں ہیں۔ اب دونوں کی شادی ہو گئی ہے۔ اُس وقت ایک کی شادی ہو گئی تھی اور اس سے چھوٹی کی ابھی شادی نہیں ہوئی تھی۔ اُس کی عمر ابھی

پندرہ سال تھی۔ وہ مجھے ملنے جیل خانے میں نہیں آئی تھی۔ جیل خانہ دور تھا۔ ماں آتی رہتی تھی۔ وہ میری منّتیں کرتی تھی کہ میں اقبالی بیان سے پھر جاؤں۔ میں کہتا تھا کہ نہیں پھروں گا۔

ایک روز میرے چچا کے ساتھ میری دونوں بہنیں آگئیں۔ دونوں رو رہی تھیں۔ انہیں معلوم تھا کہ مجھے پھانسی کی سزا ہو گی یا عمر قید ملے گی۔ دونوں نے مجھے کہا میں سیشن کورٹ میں کہوں کہ میں بے گناہ ہوں۔ میں نے انہیں بھی وہی جواب دیا کہ میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔ شادی شدہ بہن نے کہا کہ ہمارا باپ مر گیا ہے۔ کوئی اور بھائی نہیں۔ اگر اس کے سر سے میرا بھی سایہ اٹھ گیا تو سُسرال میں اس کا رعب اور وقار ختم ہو جائے گا۔

چھوٹی بہن نے کہا کہ میں اس کی طرف دیکھوں۔ سر پر بھائی نہ رہا تو اُس کا کیا بنے گا۔ اس نے دو تین ایسی باتیں کہہ دیں جن سے میرے دل پر بڑی سخت چوٹ پڑی۔ میں نے سوچا کہ میری بہنوں کو کسی کی محتاجی نہیں ہو گی۔ زمین اور جائیداد بہت ہے لیکن ان کے سر پر کوئی مرد نہ رہا تو ان کی عزت کی حفاظت کون کرے گا۔ مجھے زیادہ خیال چھوٹی بہن کا آیا۔

میں سوچ میں پڑ گیا۔ دونوں بہنوں نے اور چچا نے بھی کہا کہ وکیل اتنا قابل ہے کہ وہ کہتا ہے کہ وہ مجھے بری کرا لے گا۔ وکیل نے یہ بھی کہا تھا کہ موقعہ کا کوئی گواہ نہیں۔ مجھے اور کسی کا خیال نہیں تھا۔ بہنیں جب میرے سامنے آئیں تو میرا ارادہ بدل گیا۔ میں نے بہنوں سے کہا کہ میں ان کی خاطر اقبالی بیان سے پھر جاؤں گا اور وہ میرے لئے دعا کریں۔

اتنا تو میں بھی جانتا تھا کہ میں نے جو اقبالی بیان دیا تھا' وہ بہت کمزور تھا۔ سکھ تھانیدار اسی پر خوش تھا کہ اس نے قاتل کو پکڑ لیا ہے اور قاتل اقبالی ہو گیا ہے۔ وکیل نے مجھے بتایا تھا کہ میں نے اقبالی بیان میں جو باتیں لکھوائی ہیں' وہ تھانیدار کو شہادت کے ذریعے ثابت کرنی پڑیں گی۔ انہیں وہ جھوٹے گواہوں سے ثابت کرے گا۔

پہلے مقدمہ مجسٹریٹ کے پاس گیا۔ وہاں تھانیدار نے تمام گواہ گزارے۔

میرے وکیل نے کسی پر جرح نہیں کی۔ میں نے اتنا ہی بیان دیا کہ میں بے گناہ ہوں اور میں اپنا بیان سیشن کورٹ میں دوں گا۔

مقدمہ جب سیشن کورٹ میں چلا تو میرے وکیل نے ہر گواہ پر جرح کی۔ سکھ تھانیدار پر اس نے جو جرح کی تھی' مقدمہ اسی سے میرے حق میں ہو گیا تھا۔ تھانیدار موقعہ کے دو گواہ لایا تھا۔ میرے وکیل نے دونوں کو جھوٹا ثابت کر دیا۔

رحیم نے بات بہت لمبی کر دی۔ وہ ہر ایک گواہ کا بیان اور وکیل کی جرح سنا رہا تھا۔ میں تو یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ اشرف پاگل کیوں ہُوا۔ رحیم نے آخر میں کہا کہ پولیس جرم ثابت نہ کر سکی اور رحیم کو بری کر دیا گیا۔ اس سے آگے رحیم نے مجھے اس کہانی کا اصل حصہ اس طرح سنایا۔

جن کی بیٹی قتل ہو گئی تھی' وہ خاموش رہنے والے لوگ نہیں تھے۔ ہمارے علاقے میں انتقام کا رواج ہے۔ ہم لوگ خون کے بدلے خون کے اصول پر کاربند رہتے ہیں۔ اگر قاتل بری ہو کر آجائے تو مقتول کے لواحقین اسے خود سزائے موت دیتے ہیں پھر خاندانی دشمنی کا یہ سلسلہ چل پڑتا ہے۔ اسے انگریزوں کا قانون بھی نہیں روک سکا۔

مقتول کی برادری ہماری برادری سے ذرا کمزور تھی لیکن وہ لوگ بے غیرت نہیں تھے۔ دونوں برادریوں میں دشمنی شروع ہو گئی۔ انہوں نے اعلان کر دیا کہ لڑکی کے خون کا بدلہ لیں گے۔ میری برادری تیار ہو گئی۔ میرے لئے معاملہ دونوں طرف خراب تھا۔ وہ برادری میری دشمن ہو گئی تھی اور اپنی برادری نے مجھے اندر بٹھا کر لعن طعن کی کہ میں پہلے بدکاری کرتا رہا پھر لڑکی کو قتل کر دیا اور گاؤں میں اپنے دشمن پیدا کر لئے۔ وہ مجھے کہتے تھے کہ اس سے بہتر تھا کہ میں دوسری شادی کر لیتا۔ میری ماں مجھے بہت گالیاں دیتی تھی۔ کہتی تھی کہ تم نے اپنے باپ کا نام ڈبو دیا ہے۔ اگر قتل ہی کرنا تھا تو کسی مرد کو قتل کرتے۔ ایک بیوہ کو قتل کر کے تم نے خاندان کے منہ پر کالک مل دی ہے۔

یہ تو اندر کی بات تھی کہ میرے اپنے مجھے شرمسار کرتے تھے۔ باہر نکل کر پوری برادری میرے ساتھ تھی۔ گاؤں کے دو تین معزز آدمی جن میں ایک سکھ

بھی تھا' دونوں برادریوں کے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ہمارے پیر صاحب نے بھی اور بڑی مسجد کے مولوی صاحب نے دونوں برادریوں کے بزرگوں کو بہت سمجھایا کہ ایک دوسرے کو زخمی اور قتل کرو گے' گرفتار ہو گے' مقدمے چلیں گے اور دونوں برادریاں تباہ ہو جائیں گی۔ اس کا کچھ کچھ اثر ہو رہا تھا۔ اصل بات یہ تھی کہ مقتولہ کی برادری ذرا کمزور تھی' ورنہ اُدھر سے فوراً" وار ہو جاتا۔

معاملہ کچھ ٹھنڈا سا ہو رہا تھا۔ لیکن ہم چوکنّے تھے۔ اپنی عورتوں اور بچّوں کو گاؤں سے دور نہیں جانے دیتے تھے۔ مجھے امید تھی کہ دشمنی آگے نہیں چلے گی لیکن دو فرد ایسے تھے جو معاملہ ٹھنڈا نہیں ہونے دے رہے تھے۔ ایک تو مقتولہ کا بھائی اشرف تھا اور دوسری اس کی ماں۔ ماں اپنی برادری کو بھڑکاتی رہتی کہ بدلہ نہ لینا بے غیرتی ہے۔ اشرف گاؤں میں کہتا پھرتا تھا کہ جب موقع ملا' وہ مجھے قتل کرے گا۔

اب آپ کو سمجھ آئے گی کہ اشرف کیوں پاگل ہُوا تھا۔ مجھے بری ہو کر آئے ڈیڑھ مہینہ گزر گیا تھا۔ مجھے جب پتہ چلا کہ مقتولہ کی ماں اور اشرف برادری کو بھڑکا رہے ہیں اور مجھے قتل کرنے کی دھمکیاں دے رہے ہیں تو ایک رات میرا دماغ گڑبڑ کرنے لگا۔ میں کسی کو بتائے بغیر مقتولہ کے گھر چلا گیا۔ وہ لوگ ابھی سوئے نہیں تھے۔ گھر میں مقتولہ کا باپ تھا' اس کی ماں تھی' اشرف تھا۔ اشرف کا چھوٹا بھائی تھا اور اس کی چھوٹی بہن تھی جس کی عمر بیس اکیس سال تھی۔ اس لڑکی کی منگنی ہو گئی تھی لیکن بہن کے قتل کی وجہ سے شادی کا دن مقرر نہیں ہُوا تھا۔

مجھے اپنے گھر میں دیکھ کر سب اتنے حیران ہوئے جیسے مر گئے ہوں۔ کسی کے منہ سے کوئی بات نہ نکلی۔ وہ مجھ سے ڈر نہیں گئے تھے' یہ حیرت کا اثر تھا۔

"یہاں کیا لینے آئے ہو؟" —— ذرا دیر بعد مقتولہ کے باپ نے پوچھا۔

"اپنی موت لینے آیا ہوں" —— میں نے کہا —— "دیکھ لو۔ خالی ہاتھ ہوں" —— میں نے اشرف کی طرف دیکھ کر کہا —— "اٹھو اشرف! خدا کی قسم' اف نہیں کروں گا۔ سر تمہارے آگے کر دوں گا"۔

"ہمیں ایسا اوچھا نہ سمجھ کہ گھر آئے دشمن پر ہاتھ اٹھائیں گے" —— اشرف

کے باپ نے کہا —— "بیٹھ اور پانی پی"۔

اشرف کی ماں نے مجھے گالیاں دینی شروع کر دیں۔ اشرف کا باپ اُسے چپ کرا رہا تھا۔ اشرف اور اس کا بھائی اور اس کی بہن خاموش تھے۔ میں خاموشی سے سنتا رہا۔ اُسے خاوند نے بڑی موٹی گالی دے کر چپ کرایا۔

"خالہ جی!" —— میں نے اشرف کی ماں سے کہا —— "تمہیں بیٹی کا غم کھا رہا ہے۔ اگر میں نہ ہوتا تو آج تم اپنے اس اشرف بیٹے کو بھی رو رہی ہوتیں"۔

میری یہ بات ان میں سے کوئی بھی نہ سمجھ سکا۔ وہ شاید یہ سمجھے تھے کہ میں انہیں کوئی دھمکی دے رہا ہوں۔ میری یہ بات شاید آپ بھی نہیں سمجھ سکیں گے۔ آپ حیران رہ جائیں گے۔

"تم میری بات نہیں سمجھ سکے" —— میں نے انہیں کہا —— "بتا اشرف! اپنی ماں کو بتا تیری بہن کا قاتل کون ہے؟"

اشرف کا رنگ اُڑ گیا۔ اشرف کی ماں نے مجھے بڑا برا لفظ کہہ کر کہا کہ تم پولیس کو رشوت دے کر بری ہو گئے ہو تو کہتے ہو کہ قاتل کون ہے؟ میری بیٹی کے قاتل تم ہو۔

"بول اشرف!" —— میں نے کہا —— "کہہ دے کہ اپنی بہن کو تُو نے قتل نہیں کیا پھر میں بتاتا ہوں کہ تم قاتل ہو یا نہیں۔ مجھے اس بیچاری سے کیا دشمنی تھی؟ اللہ کی ذات جانتی ہے کہ وہ کتنی پاک روح تھی" —— میں نے اشرف کی ماں کی طرف دیکھ کر کہا —— "میں نے تمہارے بیٹے کو پھانسی سے بچایا ہے خالہ! میں نے تمہارے بیٹے کی پھانسی کا رسّہ اپنے گلے میں ڈال لیا تھا..... پوچھ اپنے بیٹے سے خالہ! پوچھ اس سے۔ تمہارا اپنا بیٹا تمہاری بیٹی کا قاتل ہے"۔

اشرف مجرم تھا۔ اپنی بہن کو اسی نے قتل کیا تھا۔ اس کے چہرے کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا۔ اب اُسے دیکھا۔ اُس کی آنکھیں سفید ہو گئی تھیں۔

"رحیم چچا!" —— میں نے اسے کہا —— "آپ نے ٹھیک کہا تھا کہ آپ کی یہ بات مجھے بھی سمجھ نہیں آئے گی اور میں حیران ہو جاؤں گا۔ میں واقعی حیران ہوں کہ اقبال جرم آپ نے کیا تھا اور آپ ان لوگوں سے کہہ رہے تھے کہ اپنی بہن کو

اشرف نے قتل کیا تھا۔ ان لوگوں کو چھوڑیں کہ آپ نے انہیں کیا کہا اور انہوں نے آپ کو کیا کہا۔ مجھے یہ بتائیں کہ یہ معاملہ کیا تھا"۔

"بات اصل میں یہ تھی ڈاکٹر صاحب!" —— وہ مجھے پاگل خانے کا ڈاکٹر سمجھ رہا تھا۔ اس نے مجھے یہ عجیب بات سنائی —— "میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ مقتولہ کے ساتھ میری پاک محبت تھی جو اُس وقت پیدا ہوئی تھی جب وہ بیوہ ہو کر اپنے ماں باپ کے گھر آ گئی تھی۔ میں اس کے ساتھ شادی کرنا چاہتا تھا۔ اس کے دل میں میری اتنی محبت تھی کہ کہتی تھی کہ اس کے ماں باپ نہ مانے تو وہ میرے گھر آ جائے گی اور میں مولوی کو بلا کر نکاح پڑھا لوں۔ میں نے اسے کہا کہ میں شریفوں اور عزت دار لوگوں کی طرح اس کے ساتھ شادی کروں گا.....

"وہ مجھ پر مرتی تھی۔ ہماری ملاقاتیں چوری چوری ہوتی تھیں۔ اس کی ماں اچھی عورت تھی۔ دو سال گزرے مر گئی ہے۔ میں نے اسے کہا کہ اپنی بیوہ بیٹی مجھے دے دے۔ وہ بہت خوش ہوئی۔ کہنے لگی کہ تم سے اچھا اور کون ہو گا۔ بیٹی خوش رہے گی لیکن ذات میں ذرا فرق تھا۔ دو تین دنوں بعد لڑکی کی ماں نے مجھے کہا کہ اس نے اپنے خاوند اور اشرف کی مرضی معلوم کرنے کے لئے میرے متعلق اشارہ سا دیا تھا لیکن دونوں نہیں مانے۔ پھر بھی اس نے کہا کہ وہ اپنی کوشش جاری رکھے گی.....

"لڑکی نے جب اپنی ماں کا یہ رویّہ دیکھا تو اس نے ماں کو بتا دیا کہ وہ مجھے اتنا چاہتی ہے کہ کسی اور کے ساتھ شادی کرے گی ہی نہیں۔ ماں نے اسے کہا کہ وہ بدنامی سے بچے۔ اس کی ماں نے مجھے بھی کہا کہ میں اس کی بیٹی کو بدنامی سے بچائے رکھوں۔ میں نے قسم کھا کر اسے کہا کہ میں اس کی امانت میں خیانت نہیں کروں گا۔ اللہ گواہ ہے کہ میں نے خیانت نہیں کی.....

"اس طرح مقتولہ کی ماں ہماری محبت کی رازدار بن گئی۔ وہ دل سے چاہتی تھی کہ بیٹی مجھے دے دے۔ گاؤں میں چوری کی ملاقاتیں چھپ نہیں سکتیں۔ لوگوں کو پتہ چل گیا اور اشرف تک بھی بات پہنچ گئی۔ مجھے لڑکی نے بتایا کہ اشرف نے اسے گالیاں اور قتل کی دھمکی دے کر کہا ہے کہ مجھ سے ملنا چھوڑ دے۔ لڑکی

باز نہ آئی۔ ایک بار بھائی نے اسے مارا پیٹا بھی تھا۔ محبت چاہے پاک ہی ہو لوگ اسے ناجائز تعلقات کہتے ہیں۔ لڑکی کی ماں کا رویّہ نہ بدلا۔ وہ میرے ساتھ بہت پیار کرتی تھی.....

"ایک روز میری اور لڑکی کی ملاقات باجرے کے دو کھیتوں کے درمیان ہو گئی۔ یہ ملاقات اتفاقیہ تھی۔ اس نے کہا کہ آج دل پر بہت بوجھ ہے اور طبیعت گھبرا رہی ہے۔ میں نے اسے تسلی دی تو اس نے کہا کہ وہ اب زیادہ انتظار نہیں کر سکتی' وہ میرے گھر آجائے گی۔ میں نے اسے کہا کہ وہ دو تین دن انتظار کرے۔ میں نے بھی اب یہی سوچنا شروع کر دیا تھا کہ جیسے وہ کہہ رہی ہے ویسے ہی کروں.....

"وہاں زیادہ دیر کھڑے رہنا مناسب نہیں تھا۔ میں وہاں سے چل پڑا۔ کھیت کی دوسری طرف آکر میں نے ویسے ہی اُدھر دیکھا۔ فصل کے اوپر سے اس طرف مجھے اشرف کا سر نظر آیا۔ وہ اس طرف جا رہا تھا جہاں اُس کی بہن موجود تھی۔ میں جُھک کر چلنے لگا تا کہ اشرف مجھے نہ دیکھ سکے۔ میرا خیال ہے کہ اس نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ میں نے دور آکر پیچھے دیکھا۔ اشرف فصل کے اندر سے نکل رہا تھا.....

"دو یا تین گھنٹوں بعد گاؤں میں شور مچ گیا کہ باجرے میں اس لڑکی کی لاش پڑی ہے۔ جس جس نے سنا وہ اُدھر کو دوڑا گیا۔ صرف مجھے معلوم تھا کہ قاتل اشرف ہے۔ اس نے اپنی بہن کو کھیتوں میں جاتے دیکھ لیا تھا اور اس کے پیچھے گیا۔ اس نے مجھے بھی دیکھا ہو گا' پھر اس نے اپنی بہن کو وہاں کھڑے دیکھا یا وہاں سے جاتے دیکھا جہاں سے میں آیا تھا۔ اس نے اپنی دھمکی پوری کر دی اور بہن کا گلا گھونٹ دیا۔ وہ فصل کے اندر اندر دوسری طرف سے باہر آیا تھا.....

"میں نے بھی لڑکی کی لاش دیکھی۔ میرا دماغ چل گیا۔ لڑکی میری محبت پر ماری گئی تھی۔ ایک ارادہ میرے دل میں یہ آیا کہ اشرف کو قتل کر دوں۔ دوسرا یہ کہ خودکشی کر لوں۔ میں کچھ نہ کچھ کرنا ضرور چاہتا تھا۔ لڑکی کی ماں مجھے ملی تو میرے گلے لگ کر اتنی روئی کہ اس نے مجھے پاگل کر دیا.....

"پولیس آئی تو قاتل کا سراغ نہیں مل رہا تھا۔ جب تھانیدار نے اشرف کو بلایا تو میرے ذہن میں ایک اور خیال آگیا۔ وہ یہ تھا کہ مقتولہ کی ماں مجھے چاہتی تھی۔

میں نے سوچا کہ اشرف کو فصل میں سے نکلتے کسی نے نہیں دیکھا ہے۔ مجھے تو یقین تھا کہ قاتل وہی ہے۔ اگر اس کا جرم ثابت ہو گیا تو اسے سزا ملے گی جو پھانسی ہو گی۔ یہ اس کی ماں کے لئے بہت بڑا صدمہ ہو گا۔ دوسرا خیال یہ آیا کہ میں اشرف کی جگہ اپنے آپ کو پیش کر دوں اور کہوں کہ قاتل میں ہوں۔ اس طرح میری خودکشی کی خواہش پوری ہو جائے گی۔ اشرف کے ساتھ تو مجھے ذرا سی بھی ہمدردی نہیں تھی۔ میں اس کی ماں کو صدمے سے بچا رہا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو پیش کر دیا۔ میں چونکہ مرنا چاہتا تھا اس لئے میں اپنے اقبالی بیان پر قائم رہنا چاہتا تھا لیکن اپنی بہنوں کی وجہ سے میں نے بچنے کا راستہ اختیار کر لیا اور وکیل نے مجھے بچا لیا لیکن ہر کوئی مجھے ہی قاتل سمجھنے لگا اور اشرف کی ماں مجھ سے انتقام لینے کے لئے مردوں کو بھڑکانے لگی.....

"اب میں ان کے گھر جا کرتا رہا تھا کہ قاتل کون ہے۔ وہ مان گئے۔ مقتولہ کے ماں باپ پر جو اثر ہُوا وہ چھوڑیں اس کی ماں کی حالت کچھ اور ہو گئی۔ اب پھر اس کے دل میں میرا پیار جاگ اٹھا۔ اشرف کے دماغ کو اُسی وقت کچھ ہو گیا۔ میں ان کے گھر سے آگیا۔ میں نے ان لوگوں کے ساتھ وعدہ کیا تھا کہ میں یہ راز کسی کو نہیں دوں گا.....

"اس کے بعد اشرف کی ماں نے میرے خلاف دشمنی کی باتیں بند کر دیں۔ تین چار دنوں بعد وہ مجھے ملی۔ کہنے لگی کہ اشرف مان گیا ہے کہ اپنی بہن کو اسی نے قتل کیا ہے۔ ماں میری احسان مند تھی کہ میں نے اس کے بیٹے کو بچا لیا ہے۔ اس نے کہا —— ' جو اللہ کو منظور تھا وہ ہو گیا ہے۔ میں تمہارا احسان چکانا چاہتی ہوں۔ میں نے اشرف کے باپ سے ہاں کرا لی ہے۔ میں اپنی چھوٹی بیٹی کا رشتہ تمہیں دے دوں گی' —— میں نے اسے کہا کہ میرا دل نہیں مانتا۔ میں نے اپنی محبت کو دفن کر دیا ہے.....

"اشرف کا دماغ جواب دے گیا۔ وہ رات کو چیخیں مارنی شروع کر دیتا اور سارے گاؤں کو جگا دیتا تھا۔ کہتا تھا میرا جسم اندر سے جل رہا ہے۔ اسے تعویذ لا لا کر دیتے رہے لیکن اس کی حالت بگڑتی گئی۔ دن کو وہ کسی کے گلے پڑ جاتا' کبھی ہنسنے لگتا

اور کبھی رونا شروع کر دیتا۔ آخر سب نے فیصلہ کر لیا کہ اسے پاگل خانے داخل کرا دیا جائے.....

"اسے یہاں لا کر داخل کرا دیا گیا۔ اس کی ماں کی حالت بہت بری ہو گئی۔ اس نے مجھے کہا کہ کبھی کبھی لاہور جا کر میرے بیٹے کو دیکھ آیا کرو۔ میں یہاں آتا رہتا ہوں۔ صرف دو دفعہ اسے دیکھا ہے۔ میں یہاں کے ایک ملازم کو پیسے دے جاتا ہوں کہ وہ اشرف کا خیال رکھیں۔ اس کی ماں مر گئی ہے لیکن میں آتا رہتا ہوں۔ کبھی کبھی ایسے لگتا ہے جیسے میں بھی پاگل ہو گیا ہوں۔ میں نے دوسری شادی نہیں کی"۔

رحیم سے یہ کہانی سن کر میں اگلے روز ڈاکٹر گوپال داس سے ملا اور اس سے پوچھا کہ اشرف ٹھیک ہو سکتا ہے یا نہیں۔

"مشکل ہے" ــــ اس نے کہا ــــ "اگر وہ ٹھیک ہو بھی گیا تو گاؤں میں جا کر اس کی حالت پھر خراب ہو جائے گی"۔

مرض محبت اور مسیحا

میں آپ کو ایک ڈاکٹر کی کہانی سنانا چاہتا ہوں۔ ان کا اصلی نام کچھ اور تھا لیکن میں اس کہانی میں انہیں ڈاکٹر یوسف لکھوں گا۔ وہ میرے بڑے ہی گہرے دوست تھے۔ میں ان کی کہانی ان کی اجازت کے بغیر سنا رہا ہوں کیونکہ کہانی کی اشاعت کی اجازت دینے کے لئے ڈاکٹر یوسف اس دنیا میں موجود نہیں ہیں۔ ڈاکٹر صاحب ایک دور میں دہلی کے مشہور ڈاکٹر تھے۔

ڈاکٹر یوسف اس دور کے ڈاکٹر تھے جب ملاوٹ والی خوراک کا رواج عام نہیں ہُوا تھا۔ ڈاکٹروں کے ہاں مریضوں کا رش نہیں ہوتا تھا۔ ڈاکٹر ہر مریض پر پوری انفرادی توجہ دیتا تھا۔ اُس زمانے میں ابھی پنسلین ایجاد نہیں ہوئی تھی اس لئے دوائی کے ہاتھوں معذور ہو جانے والے نظر نہیں آتے تھے۔ لوگ بیماری کے ہاتھوں جلدی نہیں مرتے تھے۔ ڈاکٹروں نے تکلیف کو فوراً ٹھیک کرنے والے حربے ابھی اختیار نہیں کئے تھے۔

ڈاکٹر یوسف کے والدین کھاتے پیتے کاروباری لوگ تھے۔ انہوں نے بیٹے کو ڈاکٹری کی تعلیم دلائی۔ ڈاکٹر صاحب نے کچھ عرصہ تک بڑی کامیاب پریکٹس کی لیکن آٹھ دس سال بعد چھوڑ دی۔ ان کا یہ فیصلہ ان کے مریضوں کے لئے تکلیف دہ تھا اور ناقابلِ فہم بھی کیونکہ وہ اپنی پریکٹس سے اُس زمانے کے حساب سے ہزاروں روپے کما رہے تھے۔ ڈاکٹر یوسف نے پریکٹس چھوڑنے کے بعد کاروبار میں ہاتھ ڈالا اور ناکام نہیں ہوئے کیونکہ ان کا تعلق ہی کاروباری خاندان سے تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی یہ کہانی مجھے اس توقع پر سنائی تھی کہ میں ان کا یہ راز عام نہیں کروں گا لیکن ڈاکٹر صاحب آج سے آٹھ سال قبل وفات پا چکے ہیں۔ اس کہانی کے باقی کردار بھی مر کھپ گئے ہیں اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ یہ کہانی سنانے میں

اب کوئی مضائقہ نہیں۔ لیجئے آپ یہ کہانی اب ڈاکٹر یوسف کی اپنی زبانی سنئے جیسے انہوں نے مجھے سنائی تھی۔

ڈاکٹری کا پیشہ میں نے پیسہ کمانے کے لئے نہیں اپنایا تھا۔ مجھے روپے پیسے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ میرے والد صاحب کا اچھا خاصا کاروبار تھا اور میں ان کی واحد اولاد تھا۔ میری والدہ میرے بچپن میں ہی فوت ہو گئی تھیں اور کوئی بہن بھائی نہیں تھا۔ میری والدہ کی وفات ایک ایسی بیماری سے ہوئی تھی جس کا اُس وقت کوئی علاج نہیں تھا۔ انہیں ٹی۔ بی ہو گئی تھی۔ ان کی وفات کے وقت میری عمر دو ڈھائی سال تھی۔ مجھے اپنی والدہ کی شکل و صورت بھی یاد نہیں لیکن مجھے ان کی آغوش کا لمس اب بھی محسوس ہوتا ہے۔

ڈاکٹر بننے کا فیصلہ اس لحاظ سے میرا ذاتی فیصلہ تھا کہ میں بیمار انسانیت کی خدمت کے لئے خود کو وقف کر دینا چاہتا تھا۔ کسی کو دکھ میں دیکھنا میرے بس سے باہر تھا۔ میرے جذبات ہی ایسے تھے۔ میرے والد صاحب بتایا کرتے ہیں کہ جب میری والدہ کا انتقال ہُوا اور ان کو دفنا دیا گیا' اس دن وہ سخت آزردہ خاطر تھے۔ انہیں میرے مستقبل کے بارے میں پریشانی تھی۔ رات کو وہ اپنے کمرے میں پریشان بیٹھے تھے۔ میں نے انہیں دیکھا تو سخت بیتاب ہُوا۔ والد صاحب میری بیتابی کو دیکھ رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ میں ماں کی کمی محسوس کر رہا ہوں لیکن ہُوا یوں کہ میں نے انہیں پریشان پا کر اپنا ایک کھلونا ان کے سامنے کر دیا اور اسے ان کے سامنے اس طرح بجایا جس طرح بڑے چھوٹے بچوّں کو بہلانے کے لئے جھنجھنا بجایا کرتے ہیں۔ میں دراصل والد صاحب کو پریشان دیکھ کر انہیں بہلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ والد صاحب نے جب میرا یہ رویہّ دیکھا تو انہوں نے میری محبت سے متاثر ہو کر رونا شروع کر دیا اور آنسو ان کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ گرنے لگے جنہیں وہ سارا دن روکنے کی کوشش کرتے رہے تھے۔ یہ واقعہ مجھے بالکل یاد نہیں تھا۔ مجھے میرے والد صاحب نے سنایا تھا۔

انہوں نے میری اس محبت کا یہ بدلہ دیا کہ خود کو میرے لئے وقف کر دیا اور اپنے بزرگوں کے اصرار کے باوجود ساری زندگی دوسری شادی نہیں کی۔ انہوں

نے مجھے ماں کا بھی پیار دیا اور باپ کا بھی۔ انہوں نے نہایت لگن سے مجھے پڑھایا اور میرے اصرار پر مجھے کاروبار سے الگ رکھا اور ڈاکٹری کی تعلیم دلائی حالانکہ میں ان کی اکلوتی اولاد تھا اور اصولاً مجھے عام تعلیم ختم کر کے ان کے کاروبار میں ان کا ہاتھ بٹانا چاہئے تھا۔ پیار اور ایثار کا سبق میں نے اپنے والد سے سیکھا تھا۔

والد صاحب کی اتنی توجہ اور اتنے پیار کے باوجود میں اپنی ماں کی کمی شدت سے محسوس کرتا تھا۔ عورت کا پیار میری زندگی کی سب سے بڑی محرومی تھی۔ انسان کے دل میں پیار کی ہر قسم کے لئے علیحدہ علیحدہ خانے ہوتے ہیں۔ دوستوں اور ہمجولیوں کی محبت' باپ کی شفقت اور ماں کا پیار۔ محبت اور خلوص کے یہی رشتے ہیں اور ان میں سب سے بڑا رشتہ انسان خدا اور اس کی مخلوق کے ساتھ استوار کرتا ہے لیکن انسان کی فطرت اتنی گہری اور حسّاس ہوتی ہے کہ اس کے دل کا کوئی بھی خانہ خالی رہ جائے تو وہ اس خلاء کا علاج نہیں کر سکتا۔

میں چاہتا تو عورت کے پیار سے اپنی جھولی بھر سکتا تھا لیکن اس مقصد کے لئے اُس حد تک جانا پڑتا جس کی گنجائش اس تربیت میں نہیں تھی جو میرے والد صاحب نے کی تھی۔ میرے والد صاحب سمجھدار آدمی تھے' وہ میری محرومی کو سمجھتے تھے۔ انہوں نے اپنی دانست میں میرا علاج بھی کر دیا اور وہ یہ تھا کہ انہوں نے میرے پریکٹس شروع کرنے کے تھوڑا ہی عرصہ بعد میری شادی کر دی۔ میری بیوی ہماری رشتہ دار نہیں بلکہ والد صاحب کے ایک جاننے والے کی بیٹی تھی۔ پڑھی لکھی لڑکی تھی اور والد صاحب کا خیال تھا کہ تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے وہ میرا دُکھ سمجھ لے گی۔

والد صاحب نے میری غیر موجودگی میں میری بیوی کو بٹھا کر سمجھا دیا تھا کہ میرا دُکھ کیا ہے۔ انہوں نے اسے یہ بھی کہا تھا کہ اسے اپنے خاوند کا دکھ بانٹنا ہو گا۔ میری بیوی ہر لحاظ سے مثالی بیوی تھی اور شادی کے پہلے چند ماہ تک میں یہی سمجھتا رہا کہ میرا گھر جنّت بن گیا ہے لیکن ہُوا یوں کہ اس جنّت کی چار دیواری میں دراڑیں پڑنی شروع ہو گئیں اور دوزخ کی گرم اور زہر آلود ہوائیں اس جنّت میں داخل ہو کر اس کی فضا کو مسموم کرنے لگیں۔

دُکھی انسانیت کی خدمت میری زندگی کا مشن تھا اور عورت کا پیار میری ذات کی ضرورت تھی۔ میں نہ مشن پر ضرورت کو قربان کر سکتا تھا اور نہ ہی اپنی ضرورت کی خاطر اپنے مشن سے دستبردار ہو سکتا تھا۔

جب میری بیوی نے مجھے کہا کہ میں شام کو جلدی گھر آجایا کروں تو میں بالکل حیران نہ ہُوا۔ مجھے میرے دوست بتایا کرتے تھے کہ بیویاں شام کو خاوندوں کا گھر سے باہر رہنا پسند نہیں کرتیں۔ مجھے بیوی کے اس مطالبے سے ایک طرح کی روحانی خوشی محسوس ہوئی۔ میں نے سوچا کہ کوئی تو ہے جو شام کے وقت میرے وجود کو اپنے قریب رکھنے کی خواہش کرتی ہے۔ میں نے بیوی کو ہنس کر ٹال دیا۔

جب اس کے یہ مطالبے روز کا معمول بن گئے اور اس کی طبیعت میں تلخی پیدا ہونے لگی تو میں نے اس کو آرام سے بیٹھ کر سمجھایا۔

"میری پوزیشن سمجھنے کی کوشش کرو" ——— میں نے اپنی بیوی سے کہا ——— "میں اگر کسی سرکاری دفتر میں ملازم ہوتا یا عام دکاندار ہوتا تو چھُٹی کر کے فوراً" گھر آجایا کرتا لیکن میرا پیشہ کچھ اور ہے"۔

"آپ کا پیشہ جو کوئی بھی ہے" ——— میری بیوی نے کہا ——— "آپ کو یہ بھی خیال رکھنا چاہئے کہ میں گھر میں اکیلی ہوتی ہوں۔ مجھے آپ کی ضرورت ہوتی ہے"۔

مجھ کو اُس پر بہت پیار آیا۔ وہ واقعی گھر میں اکیلی ہوتی تھی۔ گھر میں اور کوئی عورت بھی نہیں تھی جس کے ساتھ وہ وقت گزار سکتی۔ مجھے اُس کی اس ضرورت کا احساس تھا لیکن میں اپنے فرائض سے بھی کوتاہی نہیں کرتا تھا۔ میں نے اس کو سمجھانے کی کوشش کی تو وہ چڑ گئی۔

"جہنم میں جائیں آپ کے مریض" ——— میری بیوی نے بھڑک کر کہا ——— "ہروقت زندگی کے مشن اور انسانی ہمدردی کی باتیں کرتے رہتے ہیں۔ آخر بیوی بھی انسان ہوتی ہے' اسے بھی انسانی ہمدردی کی ضرورت ہے"۔

یہ تھا پہلا پتھر جو گھر کی پُرسکون جھیل میں ارتعاش پیدا کر رہا تھا۔ شادی کے بعد

میں نے جو سکون محسوس کیا تھا' وہ اب ختم ہوتا نظر آرہا تھا۔ یہ سکون میری ضرورت تھا۔ میں نے سوچا کہ گھر کا سکون خراب نہیں ہونا چاہئے۔ میں نے اپنے کلینک کے اوقات میں اس طرح تبدیلی کر لی کہ میں شام گھر گزار سکتا تھا۔ میں دوپہر کو کلینک سے گھر آتا' کھانا کھا کر بیوی سے گپ شپ لگاتا۔ پچھلے پہر کبھی کبھی اسے سیر کے لئے لے جاتا اور مغرب کی نماز کے بعد پھر کلینک پہنچ جاتا۔ اپنے علاقے میں میرا ہی کلینک تھا۔ میرے مریض مجھ سے مطمئن تھے اور انہیں میرے طریقہ علاج پر اعتماد بھی تھا۔ ان کے اعتماد پر پورا اترنے کے لئے مجھے بہت محنت کرنی پڑتی۔ میں رات کو تھکا ہارا گھر آتا تو میرا مزاج شگفتہ نہیں ہوتا تھا۔ تھکان انسان کے مزاج پر کوئی اچھا اثر نہیں چھوڑتی۔

"آپ کا تو گھر آنے کو جی نہیں چاہتا" ——— ایک دن میری بیوی نے آتے ہی مجھ پر حملہ کیا اور عجیب سے لہجے میں کہنے لگی ——— "آپ کا دل تو کلینک میں ہی لگ گیا ہے۔ گھر میں داخل ہوتے ہی آپ کا موڈ خراب ہو جاتا ہے۔ گھر میں بیوی جو ہے۔ کلینک میں تو اور بھی بہت سی دلچسپیاں ہیں"۔

اُس روز مجھے اپنی بیوی پر بہت غصہ آیا لیکن میں پی گیا۔ میں نے کوشش کی کہ آئندہ تھکان کے باوجود ہنستا مسکراتا گھر میں داخل ہُوا کروں گا لیکن یہ تجربہ بھی ناکام رہا۔ ایک روز میں خوش خوش گھر داخل ہوا تو مجھے دیکھ کر میری بیوی کے چہرے پر زہریلی مسکراہٹ آگئی۔

"کیا بات ہے؟" ——— مجھے دیکھتے ہی اُس نے کہا ——— "بڑے خوش ہیں۔ کون آئی تھی آج؟"

میرا دل بُجھ کر رہ گیا۔ میں نے سوچا کہ اس عورت کے ساتھ اب میرا گزارہ نہیں ہو سکتا لیکن ہم لوگ نہ چاہتے ہوئے بھی گلے میں بندھے ہوئے زندگی کے اس ڈھول کو بجائے چلے جاتے ہیں۔ میں نے ایک تلخ زندگی کے لئے خود کو تیار کر لیا اور اپنے ذہن کو یہ حقیقت قبول کرنے پر آمادہ کر لیا کہ عورت کا پیار میری قسمت میں نہیں۔ پھر بھی میں نے اپنی بیوی کی دلجوئی کرنے کی ہر ممکن کوشش

کی۔ میرا خیال تھا کہ ماں بننے کے بعد شاید اس کے رویّے میں فرق آجائے لیکن قدرت اس معاملے میں بھی میری قسمت پر قفل لگا چکی تھی۔ میری بیوی ماں نہیں بن سکتی تھی۔

ایک روز مجھے کلینک میں خاصی دیر ہو گئی۔ میں اٹھنے ہی والا تھا کہ ایک سیریس کیس آگیا۔ ایک بچّہ دیوار کے نیچے آگیا تھا اور شدید زخمی تھا۔ اس کے ماں باپ روتے پیٹتے آئے تھے۔ بچّہ بیہوش تھا۔ میں نے بچے کو ضروری طبّی امداد دی اور اس کی مرہم پٹی کی۔ جب میں فارغ ہُوا اُس وقت رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ میں گھر میں داخل ہُوا تو میری بیوی نے قیامت برپا کر رکھی تھی۔ میرے والد صاحب اسے سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے لیکن وہ ان کے ہاتھ بھی نہیں آ رہی تھی۔ میں ابھی گھر میں داخل ہُوا ہی تھا کہ میرے کانوں میں یہ آوازیں پڑے۔

"بیٹی!" —— میرے والد صاحب کہہ رہے تھے —— "تم تو پڑھی لکھی ہو' سمجھنے کی کوشش کرو....."

"میں کچھ نہیں سمجھنا چاہتی" —— میری بیوی نے چلّا کر کہا —— "کوئی اور پڑھی لکھی بیوی لے آؤ"۔

جب اُس کی نظر مجھ پر پڑی اس وقت اُس کا انداز اور زیادہ جارحانہ ہو گیا۔ اُس نے مجھے گریبان سے پکڑ لیا اور چیخ چیخ کر کہنے لگی —— "مجھے فارغ کر دو۔ مجھے طلاق دے دو" —— میں نے اس کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن اُس وقت اُس پر دورے کی کیفیت طاری ہو چکی تھی۔ وہ چیخ چیخ کر یہی کہہ رہی تھی —— "مجھے فارغ کر دو۔ مجھے طلاق دے دو..... اپنی کسی مریض کے ساتھ شادی کر لو۔ مجھے فارغ کر دو"۔

میں ڈاکٹر تھا اور سمجھ سکتا تھا کہ اس کا دماغ اس کے قابو میں نہیں لیکن میں انسان بھی تھا۔ میں نے اُسی وقت فیصلہ کر لیا کہ گھُٹ گھُٹ کر اور کُڑھ کُڑھ کر جینے سے بہتر ہے کہ اس عورت سے چھٹکارا حاصل کر لوں۔ میں نے صبح ہوتے ہی اسے اس کے ماں باپ کے گھر بھیج دیا اور چند روز بعد طلاق دے دی۔

اب میں اپنے مریضوں کو پوری توجہ سے دیکھ سکتا تھا لیکن جس توجہ کا میں خود

محتاج تھا وہ نہ مل سکی۔ میرے دل کا ایک خانہ خالی ہی رہا۔

مجھے بیوی سے علیٰحدہ ہوئے دو ڈھائی سال گزر چکے تھے۔ میری پریکٹس اچھی خاصی چل رہی تھی۔ اب تو دوسرے شہروں سے بھی لوگ علاج کے لئے آیا کرتے تھے۔ میں بہت مصروف ہو گیا اور کچھ عرصے کے لئے یہ بھول گیا کہ میں تنہائی کی زندگی گزار رہا ہوں۔ والد صاحب نے گھر میں ایک بوڑھی ملازمہ رکھ لی تھی جس نے گھر کو سنبھال لیا تھا۔ والد صاحب نے مجھ پر زور دینا شروع کر دیا کہ میں دوسری شادی کر لوں لیکن میں نہ مانا۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ تنہائی کی زندگی ہی گزاروں گا۔ میں نے ایک گاڑی بھی خرید لی اور اپنے آپ کو مزید مصروف کرنے میں لگ گیا۔ میری عمر تیس سال ہو چکی تھی۔

ایک روز ایک کیس میرے پاس آیا۔ مریض کی عمر چالیس سال کے لگ بھگ تھی۔ اس کی پیٹھ اور پسلیوں پر پھنسیاں نکلی ہوئی تھیں۔ اس شخص کو اس کی بیوی لائی تھی۔ مجھے بتایا گیا کہ پانچ چھ ماہ سے اس تکلیف میں مبتلا ہے۔ میں نے اس کا علاج کرنا شروع کیا۔ کیس اس لحاظ سے خاصا بگڑا ہُوا تھا کہ پیٹھ اور پسلیوں کا سارا گوشت تقریباً گل گیا تھا۔ اُس زمانے میں ایسی تکلیفوں کا علاج جلدی نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ ابھی پنسلین ہندوستان میں نہیں آئی تھی۔ یہ خیال رکھیں کہ یہ زمانہ جنگِ عظیم دوم سے فوراً پہلے کا تھا۔ میں نے سلفاڈرگز سے علاج شروع کیا۔ مریض ہفتے میں ایک بار آیا کرتا تھا اور ہر بار اس کی بیوی اس کے ساتھ ہوتی تھی۔

میں نے پہلے پہل تو اس عورت کو غور سے نہ دیکھا' لیکن جب انہوں نے باقاعدہ آنا شروع کر دیا تو میں نے اس عورت کی طرف بھی توجہ دی۔ اس کی عمر پینتیس سال کے لگ بھگ تھی۔ میاں بیوی بے اولاد تھے۔ دہلی کے مضافاتی علاقے میں رہتے تھے۔ خاوند کا چھوٹا موٹا کاروبار تھا۔ بیوی اچھی قد و قامت کی خوش شکل عورت تھی۔

میں نے جب علاج شروع کیا تو ایک ماہ بعد ہی اس کا اثر ظاہر ہونا شروع ہو گیا۔ مریض کو دوائی فائدے دے رہی تھی۔ میں نے اسے کہا کہ ہر بار اب آنے کی ضرورت نہیں رہی۔ میں نے انہیں مشورہ دیا کہ کسی آدمی کو بھیج کر اور حالت

بتا کر دوائی منگوا لیا کریں۔

اگلے ہی ہفتے بیوی پھر میرے کلینک میں آ گئی۔ دوپہر کا وقت تھا۔ میں نے اُسے بٹھا لیا۔ میں اس وقت مریضوں سے فارغ ہو چکا تھا۔

"آپ کو خود تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں تھی" ——— میں نے اسے کہا ——— "کسی اور کو بھیج دیا ہوتا"۔

"میرے لئے تکلیف اٹھانے والا تو خود تکلیف میں ہے" ——— اس نے ہلکی سی مسکراہٹ سے کہا ——— "اور کوئی تھا نہیں جسے آپ کے پاس بھیج سکتی اس لئے خود ہی چلی آئی"۔

مجھے احساس تھا کہ عورت دور سے آئی ہے اور مجھے اس کو جلدی فارغ کر دینا چاہئے۔ گرمیوں کے دن تھے۔ میں نے اس کے لئے شربت منگوایا۔ شربت پی کر اس کے چہرے پر بشاشت آ گئی اور وہ تازہ دم ہو گئی۔ میں نے اس کی دوائی تیار کروائی۔ اتنی دیر میں گھر سے میرا کھانا آ گیا۔ میں بیوی سے علیحدگی کے بعد کھانا کلینک پر ہی منگوا لیا کرتا اور دوپہر کو کلینک میں ہی تھوڑی دیر کے لئے آرام کر لیا کرتا تھا۔

"ڈاکٹر صاحب!" ——— اس عورت نے پوچھا ——— "آپ کے بال بچے نہیں؟ آپ کھانا گھر میں نہیں کھاتے؟"

اس کے جواب میں میرے منہ سے ایک آہ نکل گئی اور میں نے اس کے سوال کا کوئی جواب نہ دیا۔ وہ دوائی لے کر اٹھنے لگی تو نہ جانے مجھے کیوں خیال آ گیا کہ کھانے کا وقت ہے اور یہ عورت بھوکی اتنی دور واپس جائے گی۔ میں نے اسے اپنے ساتھ کھانے میں شریک کر لیا۔ کھانے کے دوران وہ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی۔ اسی روز مجھے معلوم ہُوا کہ اس کا نام زبیدہ ہے۔ اس کا خاوند دکاندار ہے۔ بیماری کی وجہ سے دکان بند ہے۔ جمع پونجی تھی جس سے علاج ہو رہا تھا ورنہ اس وقت گھر میں فاقے ہوتے۔ زبیدہ کے دو بھائی بھی تھے جو کاشتکاری کرتے تھے۔ زبیدہ کی دونوں بھابیاں آپس میں سگی بہنیں تھیں اور زبیدہ کے ساتھ ان کا سلوک ایسا تھا کہ زبیدہ کسی مالی امداد کے لئے اپنے بھائیوں کی طرف نہیں دیکھ سکتی تھی۔

زبیدہ کا خاوند اکیلا تھا۔ آگے پیچھے کوئی نہیں تھا۔ شریف آدمی تھا۔ اپنے کام سے کام رکھتا تھا۔

اُس روز زبیدہ سے بہت باتیں ہوئیں۔ اُس کا باتیں کرنے کا انداز بہت خوبصورت تھا۔ بعض دفعہ بات کرتے وقت اس کے ہونٹوں پر اپنے آپ ہی ایک دلکش سی مسکراہٹ دوڑ جاتی جو ایک ہی لمحے بعد غائب ہو جاتی۔ بعض اوقات اس کی آنکھیں مُسکرانے لگتیں۔ جب وہ اپنے خاوند کا اور اپنے دکھ کا ذکر کرتی تو آنسو اُس کی آنکھوں سے جاری ہو جاتے۔ میں نے اُس روز پہلی مرتبہ دیکھا کہ اُس کی آنکھیں کالی سیاہ اور بڑی بڑی ہیں۔ اس کا جب اچانک رنگ سرخ ہو گیا اور اس نے شرما کر سر جھکا لیا تو مجھے خیال آیا کہ میں بڑی محویت سے اس کی طرف تعریفی نظروں سے دیکھ رہا ہوں۔ میں جلد ہی اپنے آپ میں واپس آ گیا۔

تھوڑی دیر بعد جب کمپاؤنڈر نے آ کر ڈسپنسری کھولی تو مجھے معلوم ہُوا کہ شام ہو چکی ہے۔ زبیدہ سے اتنی باتیں ہو چکی تھیں لیکن اس کے باوجود ایسے لگتا تھا جیسے ابھی تھوڑی ہی دیر گزری ہے۔ وہ جانے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں نے اس سے دوائی کے پیسے نہ لئے۔ اس نے بہت اصرار کیا لیکن میں نہ مانا۔

"مجھے اپنا بھائی سمجھ لو" ——— میں نے کہا ——— "باپ سمجھ لو یا ہمدرد سہیلی سمجھ لو۔ میں تم سے پیسے نہیں لوں گا"۔

وہ پھر بھی جھجک رہی تھی۔ اسے قائل کرنے میں مجھے خاصی دیر لگی۔ میں اُس پر یہ واضح کرنا چاہتا تھا کہ میری نیّت بُری نہیں۔

"زبیدہ!" ——— وہ جب جانے لگی تو میں نے اس سے پوچھا ——— "اتنی دیر ہو گئی ہے۔ گھر جا کر کیا کہو گی؟"

"کچھ بھی نہیں" ——— اس نے جواب دیا ——— "اس شہر میں میری ایک سہیلی رہتی ہے۔ گھر سے چلتے وقت خاوند نے کہا تھا کہ اتنی گرمی میں واپس نہ آنا۔ دوپہر کو سہیلی کے ہاں چلی جانا۔ شام کو واپس آنا"۔

زبیدہ اس کے بعد بھی میرے پاس آتی رہی۔ وہ دوپہر کو آتی ہم اکٹھے کھانا کھاتے، گپ شپ لگاتے اور وہ شام کو واپس چلی جاتی۔

"ڈاکٹر صاحب!" — ایک روز زبیدہ نے مجھے کہا — "آپ کو میرا اس طرح بیٹھے رہنا اچھا لگتا ہے؟ لوگ غلط باتیں تو نہیں کرتے ہوں گے؟ آپ کا وقت تو ضائع نہیں ہوتا؟"

"تم اپنی بات کرو زبیدہ!" — میں نے کہا — "تمہیں اگر برا لگتا ہے تو بیشک نہ بیٹھا کرو"۔

"مجھے کیا بُرا لگے گا ڈاکٹر صاحب!" — زبیدہ نے کہا — "میں نے تو شکر کیا ہے کہ میرا کوئی تو ہے جس کے پاس بیٹھ کر میں دل کا بوجھ ہلکا کر لیتی ہوں۔ آپ نے خود ہی تو کہا تھا کہ میں آپ کو اپنی سہیلی سمجھ لوں۔ آپ کے پاس تھوڑی دیر بیٹھ جاتی ہوں تو دل کا غبار نکل جاتا ہے لیکن ڈاکٹر صاحب!....." زبیدہ بولتے بولتے یوں رکی جیسے وہ زبان پر آئی ہوئی بات منہ سے نہ نکالنا چاہتی ہو۔

"لیکن کیا؟"

"میں سوچ رہی ہوں ڈاکٹر صاحب!" — زبیدہ نے کہا — "کہ آپ میرے ساتھ خلوصِ دل سے ہمدردی کرتے ہیں لیکن میں جب یہ دیکھتی ہوں کہ آپ مجھ سے دوائیوں کے پیسے بھی نہیں لیتے تو ڈرنے لگتی ہوں کہ کہیں آپ مجھے محض ایک جوان اور بے بس عورت تو نہیں سمجھتے جس کا خاوند بیکار اور بیمار ہے اور جسے آپ اپنے احسان کے بوجھ سے لاد رہے ہیں"۔

"نہیں زبیدہ نہیں" — میں نے کہا — "احسان میں نہیں کر رہا، احسان تم کر رہی ہو اور تم ایسا احسان کر رہی ہو جس کا بدلہ میں ساری عمر نہیں دے سکتا" — میں نے اسے تفصیل سے سمجھایا کہ میری زندگی کیسی گزری ہے اور میں کس قسم کی پیاس کے ساتھ زندگی گزار رہا ہوں۔

"عورت کا پیار میری زندگی کی سب سے بڑی محرومی ہے زبیدہ!" — میں نے کہا — "مجھے نہیں معلوم ماں کا پیار کیسا ہوتا ہے، بہن کا پیار کیسا ہوتا ہے۔ میری کوئی بیٹی بھی نہیں کہ میں تمہیں بتا سکوں کہ بیٹی کے پیار میں کتنا سکھ ہے۔ لے دے کے ایک ہی عورت میری زندگی میں آئی تھی اور وہ میری بیوی تھی۔ اس نے میرے ساتھ جو سلوک روا رکھا وہ میں تمہیں بتا چکا ہوں..... تم میرے سامنے

بیٹھ کر اپنا دکھ روتی ہو تو میں تھوڑی دیر کے لئے اپنا دکھ بھول جاتا ہوں"۔

"آپ بھی اپنا سینہ ہلکا کر لیا کریں" — زبیدہ نے کہا۔

"نہیں زبیدہ!" — میں نے کہا — "تم شکر کرو کہ تم عورت ہو۔ تم جب چاہو رو سکتی ہو، لیکن تم نے کبھی مجھ جیسے مردوں کو بھی روتے دیکھا ہے؟..... اور میں رو بھی کیسے سکتا ہوں زبیدہ! میں کس کے کندھے پر سر رکھ کر آنسو بہاؤں؟" — یہ بات کہتے کہتے میں جذباتی ہو گیا اور میرے لہجے میں دکھ کو محسوس کر کے زبیدہ کی آنکھیں چھلک پڑیں۔

"میرے عزیز ڈاکٹر صاحب!" — زبیدہ نے عجیب سے لہجے میں کہا — "میرے کندھے پر سر رکھ کر رو لیا کریں۔ آپ مجھے اپنا غمخوار سمجھیں"۔

"پاگل نہ بنو زبیدہ!" — میں نے اسے پیار سے ڈانٹ دیا — "مت بھولو کہ تم شادی شدہ عورت ہو اور تمہاری ذمّے داریاں بھی ہیں"۔

"جب سے میرا خاوند بستر سے لگا ہے، لوگوں نے مجھے شادی شدہ عورت سمجھنا چھوڑ دیا ہے" — زبیدہ نے کہا — "وہ مجھے مجبور اور بے بس بیوہ سمجھتے ہیں۔ وہ مجھے نوٹ دکھاتے ہیں، رانی بنانے کے وعدے کرتے ہیں۔ جس ہندو پنساری کی دکان سے اب سودا لاتی ہوں اس نے کچھ عرصے تک تو لحاظ کیا پھر اس نے ادھا کی واپسی کا تقاضا شروع کر دیا۔ اب کچھ عرصے سے اس کا بیٹا دکان پر بیٹھ رہا ہے۔ اس نے مجھے کہا ہے کہ ادھا واپس کرنے کی ضرورت نہیں، ویسے ہی برابر کر لو۔ اس کی اس بات سے مجھے آگ لگ گئی لیکن میں اس کا کیا بگاڑ سکتی تھی۔ میں نے اپنے خاوند سے بھی ذکر نہیں کیا۔ وہ اس بیماری میں اپنا خون جلانے کے سوا کر بھی کیا سکتا ہے"۔

"پنساری کا کتنا ادھا ہے؟" — میں نے پوچھا۔

اس نے بتایا تو میں نے اتنی رقم اس کے حوالے کر دی اور اسے کہا کہ پنساری کے منہ پر دے مارنا۔ اسے سمجھایا کہ خاوند کو رقم کا پتہ چل جائے تو اسے کہنا کہ سہیلی سے مانگ کر لائی ہوں۔ اس نے رقم لینے سے انکار کیا لیکن میں نے زبردستی رقم اس کے ہاتھ میں پکڑا دی۔

تین چار ماہ بعد زبیدہ کا خاوند ٹھیک ہو گیا اور اس نے دکان پر بیٹھنا شروع کر دیا۔ زبیدہ پھر بھی کسی نہ کسی بہانے میرے پاس آجایا کرتی تھی۔ اس کے حالات بہتر ہونے شروع ہو گئے تھے۔

تھوڑے عرصے بعد زبیدہ پھر اپنے خاوند کو لے کر میرے پاس آئی۔ اس کے خاوند کو اب کھانسی ہو گئی تھی۔ اُس زمانے میں لوگ کھانسی سے گھبرا کر ڈاکٹر کے پاس نہیں جایا کرتے تھے' بلکہ خود ہی جوشاندہ وغیرہ پی کر کھانسی کا علاج کر لیتے تھے۔ زبیدہ اور اس کے خاوند کے لئے تشویش کی بات یہ تھی کہ کھانسی کے ساتھ سانس بھی اُکھڑ جاتا تھا جو بڑی مشکل سے اور بڑی دیر بعد صحیح ہوتا تھا۔ میں نے اس کا علاج بھی شروع کر دیا۔ زبیدہ نے اپنے خاوند کے سامنے ہی مجھے دوائیوں کے پیسے دیئے جو میں نے قبول کر لئے۔ میں اُس کے خاوند کو کوئی غلط تاثر نہیں دینا چاہتا تھا۔

اس دفعہ میرے علاج سے زبیدہ کے خاوند کو کوئی فرق نہ پڑا بلکہ اس کی تکلیف میں اضافہ ہوتا گیا۔ اسے اب کھانسی کے ساتھ بخار بھی رہنے لگا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ میرے اس مریض کو ٹی۔ بی ہو گئی ہے اور یہ ٹی۔ بی کی خاصی اگلی سٹیج ہے۔ میں زبیدہ کو یہ بات بتا کر دُکھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے مجھے چاہئے تو یہ تھا کہ میں مریض کو ایکسرے کرانے کا مشورہ دیتا اور اپنا شک رفع کرتا لیکن مرض کی علامات دیکھ کر میرے لئے شک والی کوئی بات نہیں رہی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ زبیدہ کا خاوند تپ دق کا شکار ہے۔ ایکسرے میں نے اس لئے نہیں کرایا کہ ان لوگوں کو شک ہو جائے گا کہ اُسے ٹی۔ بی ہو گئی ہے۔ ٹی بی اُس زمانے میں لاعلاج بیماری تھی اور اس کا انجام تھا ایک دردناک موت۔ میں اس دردناک موت سے پہلے زبیدہ اور اس کے خاوند کو کسی ذہنی اذیّت میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔

ایک روز زبیدہ خلافِ معمول شام کے وقت ہی میرے کلینک میں آ گئی۔ اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ ایسے لگتا تھا جیسے وہ سارا دن روتی رہی ہے۔ میں نے اس سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ خاوند کی طبیعت اب زیادہ خراب ہو گئی ہے اور کھانسی کے ساتھ بلغم میں خون بھی آتا ہے۔ میری تشخیص درست ثابت ہوئی

تھی۔

"سب کہتے ہیں تمہارے خاوند کو ٹی۔ بی ہو گئی ہے" ——— زبیدہ نے روہانسی آواز میں کہا ——— "آپ کے پاس وقت ہو تو خود چل کر دیکھ لیں"۔

انکار کی گنجائش ہی نہیں تھی حالانکہ مجھے معلوم تھا کہ میرے جانے کی کوئی ضرورت نہیں پھر بھی میں نے زبیدہ کی دلجوئی کے خیال سے اپنی گاڑی نکالی اور اسے ساتھ لے کر روانہ ہو گیا۔ اس کا گھر دہلی سے خاصا باہر تھا اور میرے کلینک سے تقریباً" چھ سات میل کے فاصلے پر تھا۔ راستے میں زبیدہ اپنے مخصوص انداز میں گفتگو کرتی رہی۔ اپنے خاوند کی اور اپنی زندگی کے بارے میں باتیں کرتے کرتے اس نے اچانک ہچکیاں لے کر رونا شروع کر دیا۔ راستہ ویران تھا۔ میں نے سڑک سے اتر کر ایک طرف گاڑی روک دی۔ زبیدہ ہچکیاں لے لے کر روئے جا رہی تھی۔

یہ صورت حال میرے لئے بڑی دشوار تھی۔ میں اسے چپ کرانا چاہتا تھا لیکن اسے ہاتھ لگاتے بھی ڈرتا تھا۔ ڈر اس بات کا تھا کہ زبیدہ مجھے عام مردوں کی طرح ہوس کار مرد نہ سمجھ لے۔ زبیدہ نے میری مشکل حل کر دی اور میرے کندھے پر اپنا سر پھینک دیا۔ میں نے اپنے بائیں بازو کو اس کے شانے پر پھیلا کر اسے دائیں بازو سے تھپکیاں دینی شروع کر دیں اور اسے حوصلہ دینے لگا۔

زبیدہ کے خاوند کو جا کر دیکھا تو وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ بن چکا تھا۔ اس کے چہرے سے گوشت غائب تھا اور چہرے کی ابھری ہوئی ہڈیاں بڑا خوفناک تاثر پیدا کر رہی تھیں۔ وہ سانس لیتا تھا تو اس کے سینے سے عجیب سی آوازیں آتی تھیں۔ اسے بخار بھی تھا۔ مجھے یقین تھا کہ میرا مریض ٹی۔ بی کی آخری سٹیج پر پہنچ چکا ہے۔ پھر بھی میں نے اسے تسلی دلاسہ دیا اور کچھ دوائیں دے کر واپس آ گیا۔

دو روز بعد زبیدہ پھر میرے کلینک میں آ گئی۔ تنہائی میں بیٹھ کر اس نے پھر رونا شروع کر دیا۔ میں نے اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا اور اسے حوصلہ دیا۔

"ڈاکٹر صاحب!" ——— زبیدہ نے روتے ہوئے کہا ——— "خدا کے لئے مجھے بتائیں کہ میرے خاوند کو کیا ہو گیا ہے؟"

میں نے اسے بڑے آرام سے سمجھایا کہ اس کے خاوند کو ٹی۔ بی ہو گئی ہے اور وہ زیادہ سے زیادہ چھ ماہ زندہ رہے گا۔ میں نے اسے کہا کہ اگر اپنے خاوند کی اذیّت کو کم کرنا چاہتی ہو تو اسے اچھی خوراک اور فروٹ کھلاؤ۔ میں نے اسے پیسے دیئے اور سختی سے منع کیا کہ خاوند کو ٹی۔ بی کا نہ بتانا۔

زبیدہ اس کے بعد بھی میرے پاس آکر روتی رہی۔ اسے حوصلہ دینے کے لئے مجھے اس کا وجود اپنے ساتھ لگانا پڑتا تھا۔ میں اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتا' اس کے گالوں پر تھپکی دیتا۔ اس میں میری کوئی بدنیّتی شامل نہیں تھی۔ میں یہ سب ہمدردی میں کرتا تھا لیکن مجھے اعتراف کرنے میں کوئی شرم نہیں کہ ایسا کرتے وقت مجھے بھی سکون محسوس ہوتا تھا۔

میں اس کے بعد تین مرتبہ زبیدہ کے گھر گیا۔ اس کے خاوند کی تکلیف مجھ سے بھی نہیں دیکھی جاتی تھی۔ اس کا ایک پھیپھڑا تو مکمل طور پر کھایا جا چکا تھا اور دوسرا بھی بُری طرح مجروح تھا۔ وہ پوری بات بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ایک جملہ بولنے کے بعد ہانپنے لگتا تھا۔ وہ سینے میں شدید درد کی شکایت کرتا تھا۔ زبیدہ نے مجھے بتایا کہ وہ کبھی کبھی درد سے تڑپنے لگتا تھا۔ میں جب بھی جاتا' اس کو کوئی نہ کوئی دوائی دے آتا تھا۔ ایک روز میں نے اس کو سکون کا انجکشن دیا اور واپس آگیا۔ واپس آتے ہی مجھے پیغام ملا کہ زبیدہ کا خاوند فوت ہو گیا ہے۔ میں نے اس کے جنازے میں شرکت کی اور بوجھل دل سے واپس آگیا۔

زبیدہ نے عدت کی مدت پوری کی اور مجھ سے ملنے آگئی۔ اس کا بہت بُرا حال تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس کے بھائی اسے لے گئے تھے اور اب وہ ان کے گھر میں رہتی ہے۔ مجھے زبیدہ کی یہ حالت دیکھ کر بہت دُکھ ہُوا۔ میں نے پہلے کی طرح اسے حوصلہ دیا۔ اسے روزمرّہ کی ضرورت کے لئے پیسے دیئے۔ اُس دن بھی وہ میرے پاس بیٹھی رہی۔ وہ جب اٹھنے لگی تو میرا جی نہیں چاہتا تھا کہ میں اسے اٹھنے دوں۔ پھر بھی میں نے خود پر جبر کیا اور اسے کہا کہ میرے پاس نہ آیا کرو' اب اچھا نہیں لگتا۔ میں اسے یہ نہیں کہنا چاہتا تھا کہ اسے دیکھ کر مجھے اس کے خاوند کی موت یاد آجاتی ہے۔ زبیدہ ڈبڈباتی آنکھوں سے رخصت ہو گئی۔

زبیدہ کو بھیج کر میری اپنی طبیعت بھی بیزار ہو گئی۔ زبیدہ آتی تھی تو مجھے اچھا لگتا تھا۔ میرا وقت بھی اپنے مریضوں کے ساتھ اچھا گزرتا تھا۔ اس کے لئے اپنا دروازہ بند کرنے کے بعد میری حالت اُس پیاسے مسافر کی سی ہو گئی جس نے تپتے ریگزار میں چلتے چلتے نخلستان کو جانے والا راستہ خود بخود ہی بدل لیا ہو۔ میں نے اپنے کمپاؤنڈر کو بلا کر کہا کہ میں شام کلینک پر نہیں بیٹھ سکوں گا۔

اس کے بعد یہ میرا روز کا معمول بن گیا۔ کلینک میں میرا دل نہیں لگتا تھا۔ میں نے کلینک سے چھٹیاں کرنی شروع کر دیں۔ میرے والد صاحب بھی پریشان تھے اور میرا کمپاؤنڈر بھی۔ میرے مریض بھی سوچ رہے تھے کہ ڈاکٹر کو کیا ہو گیا ہے' لیکن میرا دل اپنی زندگی کے مشن سے بیزار ہو چکا تھا۔

میرا دل چاہ رہا تھا کہ زبیدہ مل جائے۔ میں اس سے دل کی باتیں کرنا چاہتا تھا لیکن اب اس سے ملنے کی کوئی صورت نہیں تھی لیکن جہاں خواہش شدید ہو' وہاں خواہش پوری بھی ہو جایا کرتی ہے۔

ایک روز میں گھر میں ہی تھا کہ مجھے بتایا گیا کہ ایک مریضہ مجھ سے ملنا چاہتی ہے۔ میں عام طور پر گھر پر مریض نہیں دیکھا کرتا تھا کیونکہ میرا سارا وقت تو کلینک میں گزرتا تھا۔ اب جب کہ میں کلینک سے غیر حاضر تھا' میں نے سوچا شاید کوئی ایمرجنسی ہو۔ میں نے مریضہ کو اپنے کمرے میں ہی بلا لیا۔

دروازہ کھلا اور زبیدہ اندر داخل ہوئی۔ میں غیر ارادی طور پر اُٹھ کھڑا ہُوا۔ زبیدہ میرے سینے سے لگ گئی اور سسکنے لگی۔

"زبیدہ!" ---- میں نے کہا ---- "میں نے تمہیں ملنے سے منع کیا تھا"۔

"مجھے بچا لو ڈاکٹر صاحب!" ---- اُس نے روتے ہوئے کہا ---- "میرا آپ پر کوئی تو حق ہے"۔

یہ پہلا موقع تھا کہ زبیدہ کو میں نے خود سے علیحدہ کر دیا۔ اس کے جسم کا لمس اب مجھے سکون نہیں اذیّت دے رہا تھا۔ میں نے اسے آرام سے بٹھایا اور اس سے پوچھا کہ اب اس پر کیا مصیبت آپڑی ہے۔

"میرے بھائی مجھ سے جان چھڑا رہے ہیں" ---- اس نے بتایا ---- "میرے

بھائی جس کے ساتھ میری شادی کرنا چاہتے ہیں وہ نیم پاگل ہے اور بوڑھا بھی ہے لیکن میری بھابی کہتی ہے کہ وہ میرے لئے اچھا خاوند ثابت ہو گا..... میں مر جاؤں گی ڈاکٹر صاحب! میرے ساتھ ظلم ہو رہا ہے"۔

اس نے مجھے تفصیل سے سنایا کہ خاوند کے مرنے کے بعد اس پر بھائیوں کے گھر میں کیا بیتی ہے۔ میں نے بظاہر سکون سے سنا لیکن میری جذباتی حالت بہت ہی بُری ہو گئی۔ زبیدہ مجھ سے کوئی اور توقع لے کر آئی تھی۔

"ڈاکٹر صاحب!" — اس نے کہا — "آپ نے زندگی بھر میرے کام آنے کا وعدہ کیا تھا۔ اب وقت آگیا ہے۔ مجھے اپنی پناہ میں لے لیں..... میرے ساتھ شادی کر لیں"۔

اس نے میرے دل کی بات کہہ دی تھی۔ اس عورت سے مجھے سکون ملتا تھا جس کے لئے میں ترس گیا تھا مگر میں نے اسے کہا کہ میں اس کے ساتھ شادی نہیں کر سکتا۔

"اس لئے کہ آپ امیر ہیں، بہت بڑے ڈاکٹر ہیں اور میں غریب اور مجبور بیوہ ہوں" — اس نے کہا — "لیکن ڈاکٹر صاحب! آپ کے دل میں میری محبت ہے۔ اگر آپ کو مجھ سے محبت نہ ہوتی تو آپ کبھی کے مجھ پر اُس بدنیتی کا اظہار کر چکے ہوتے جو مجبور اور محتاج عورت پر مرد کیا کرتے ہیں۔ مجھ پر جال پھینکے گئے تھے لیکن آپ نے مجھے سچی اور دلی محبت دی اور مجھ سے محبت لی۔ میں بچی نہیں۔ میں جانتی ہوں کہ آپ دل پر پتھر رکھ کر مجھے ٹھکرا رہے ہیں"۔

"ہاں زبیدہ!" — میں نے کہا — "تم ٹھیک کہتی ہو۔ میں تمہاری محبت کو دل میں دفن نہیں کر سکتا لیکن....."

"لیکن آپ کے سامنے میری حیثیت ایک نوکرانی سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں" — اس نے کہا — "یہی کہنا چاہتے ہیں نا آپ؟"

میں نے اسے ٹالنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ مجھے اُس مقام پر لے آئی جہاں انسان میں انکار کی جرأت ختم ہو جاتی ہے لیکن میری حالت یہ تھی کہ میں اس حسین عورت کی نظروں کا سامنا کرنے سے گھبرا رہا تھا اور میں اسے ایک آخری

بات کہنے سے ڈرتا تھا۔ اس نے مجھے مجبور کر دیا کہ وہ بات کہہ دوں۔

"زبیدہ!" — میں نے کہا — "میں تمہارا مجرم ہوں۔ میں نے تمہارے خاوند کو قتل کیا تھا"۔

وہ چونک پڑی۔ کچھ دیر حیرت سے پھٹی پھٹی آنکھوں سے میرے منہ کی طرف دیکھتی رہی پھر بولی — "کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ میرے خاوند کو آپ نے....."

"ہاں زبیدہ!" — میں نے کہا — "میں نے اسے قتل کیا تھا۔ یہ اس کی خواہش تھی جو میں نے پوری کی تھی۔ پہلے وہ ٹی۔ بی کا مریض نہیں تھا۔ میں نے اس کے پھوڑوں کا علاج کیا تھا۔ وہ پھوڑے ٹی۔ بی کو ساتھ لے کر پھر نکل آئے تھے۔ اُس کی پیٹھ گل گئی اور پھیپھڑوں کو دِق کے جراثیم کھا رہے تھے۔ تم نہیں جانتیں کہ وہ ایسی اذیت میں مبتلا تھا جسے وہ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اسے زیادہ سے زیادہ تین ماہ بعد مرجانا تھا لیکن اس کی حالت یہ تھی جیسے اس کی پیٹھ میں اور سینے میں مسلسل تیر اُتر رہے ہوں.....

"ایک روز تم روتی ہوئی آئیں اور مجھے اپنے گھر لے گئیں۔ اس روز تمہارا خاوند بہت بری تکلیف میں تھا۔ اس نے تمہیں کہا کہ ڈاکٹر صاحب کے لئے چائے بناؤ۔ تم چلی گئیں تو اس نے مجھے کہا — "ڈاکٹر صاحب! میں ٹھیک نہیں ہو سکتا اور مجھ سے یہ تکلیف برداشت نہیں ہوتی۔ دوسری بات یہ ہے کہ میری بیوی کو دیکھیں۔ جوان ہے، خوبصورت ہے۔ چھ سات برسوں سے میں نے اس کے ساتھ میاں بیوی والا تعلق توڑ رکھا ہے۔ یہ دن رات میری خدمت کرتی ہے۔ میں اسے آزاد کر دینا چاہتا ہوں۔ میں اسے اپنی بیماری کے جراثیم سے بچانا چاہتا ہوں۔ میری مدد کریں، میری بیوی پر رحم کریں اور مجھے کوئی ایسی دوائی پلا دیں کہ میں ذرا جلدی مر جاؤں.....

"زبیدہ! اس کی باتیں میرے دل میں اُتر گئیں۔ اس کا علاج آخر موت تھا۔ میں نے سوچا کہ میں یہ علاج جلدی کیوں نہ کر دوں۔ یہ جیتے جی قبر میں پڑے ہوئے مُردے کی طرح کیوں گلتا سڑتا رہے۔ میں نے بیگ سے ایک انجکشن نکالا اور اسے لگا دیا۔ تمہیں یاد ہو گا کہ تم چائے لے کر آئی تھی۔ اور میں چائے پئے بغیر آگیا تھا۔

اُسی رات تم بیوہ ہو گئیں"۔

"اگر آپ نے اسے انجکشن دیا تھا تو نیکی کی تھی" ـــ زبیدہ نے کہا ـــ "اسے آپ قتل کیوں کہتے ہیں؟"

میں نے زبیدہ کو سمجھانے کی بہت کوشش کی مگر وہ نہ سمجھ سکی۔ ایک احساس نے مجھے نفسیاتی مریض بنا دیا تھا۔ میرے اندر احساس یہ بیدار ہو گیا تھا کہ میں زبیدہ کو دل و جان سے چاہتا ہوں اور میں نے لاشعوری طور پر زبیدہ کی محبت کی خاطر اس کے خاوند کو قتل کیا ہے۔ اب زبیدہ نے مجھے شادی کی پیشکش کی تو جرم کے احساس نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں اسے ٹھکرا دوں ورنہ میں تمام عمر جرم کے احساس سے پاگل ہوتا رہوں گا۔ بے شک یہ MERCY KILLING تھی۔ ساری دنیا میں ایسے کیس ہوتے رہتے ہیں لیکن مجھ پر جرم کا احساس آسیب بن کر طاری ہو گیا۔

زبیدہ میری بات نہ سمجھ سکی اور میرے پیچھے پڑی رہی۔ میں نے اسے ٹالنے کے لئے کہہ دیا کہ مجھے دو چار دن سوچنے دو۔ وہ چلی گئی لیکن میں نے جو سوچنا تھا وہ سوچ لیا تھا۔ دوسری سوچ یہ آئی کہ میں شادی سے گھبراتا تھا۔ پہلی بیوی نے میرے ساتھ بہت بُرا سلوک کیا تھا۔ میرا پیشہ ایسا ہے کہ مجھے عورتوں کا علاج بھی کرنا ہوتا ہے۔ ان کی نبض پر ہاتھ رکھتا ہوں۔ ان کے سینے پر، حتیٰ کہ ان کے کپڑے اٹھا کر بھی دیکھتا ہوں۔ اُس وقت میں مرد نہیں مسیحا ہوتا ہوں مگر بیوی کچھ اور سمجھتی تھی۔ میں ایسا تلخ تجربہ ایک بار پھر نہیں کرنا چاہتا تھا۔

زبیدہ پھر نہ آئی۔ سات آٹھ روز بعد پتہ چلا کہ بھائیوں نے اسے زبردستی ایک بوڑھے اور نیم پاگل کے ساتھ بیاہ دیا ہے اور خاصی رقم وصول کی ہے۔ اس کے چند دن بعد معلوم ہُوا کہ زبیدہ نے خودکشی کر لی ہے۔ میں نے اگلے دن سے کلینک میں بیٹھنا چھوڑ دیا۔ پھر دوسرا کاروبار شروع کر دیا۔

ایک خاوند سے دوسرے خاوند تک

میری آپ بیتی کو آپ چار دیواری کی دنیا کی کہانی کہیں گے لیکن میں اسے تھانیداری کی دنیا کی کہانی کہتی ہوں۔ یہ نہ سمجھیں کہ میں پولیس کے خلاف کچھ کہوں گی۔ میں تھانیداروں کے خلاف بھی کچھ نہیں کہوں گی۔ یہ میرے اپنے گھر کی کہانی ہے۔ میں جگہوں کے اور افراد کے جو نام لکھوں گی وہ اصلی نہیں ہوں گے۔ مجھے معلوم ہے کہ میری آپ بیتی کے دو بڑے فرد اس دنیا میں نہیں ہیں پھر بھی میں نہیں چاہتی کہ ان کے مُردے خوار کروں۔ اب تو میری اپنی عمر اتنی ہو گئی ہے کہ اس جگہ کی تیاریاں کر رہی ہوں جہاں مُردے خوار ہونے کے لئے جایا کرتے ہیں۔

آپ بیتی ہندوستان کے ایک علاقے سے شروع ہوئی تھی۔ میں اُس وقت کنواری تھی۔ رشتہ مانگنے والوں نے ہمارے گھر کا محاصرہ کر لیا تھا۔ مجھ میں دو خوبیاں امیدواروں کو نظر آتی تھیں، ایک یہ کہ مجھے خدا نے رنگ روغن اور شکل و صورت ایسی عطا کر دی تھی کہ جو مجھے دیکھتا وہ رک جاتا اور جب تک میں نظروں سے اوجھل نہ ہو جاتی وہ مجھے دیکھتا ہی رہتا تھا۔ دوسری خوبی میرے خاندان کی تھی۔ ہم لوگ اونچے پیمانے کے زمیندار تھے۔ حویلی اونچی تھی۔ روپے پیسے کی فراوانی تھی۔ میرا رشتہ مانگنے والوں کو پتہ چل گیا تھا کہ مجھے جہیز میں پندرہ بیس ایکڑ زمین بھی ملے گی۔

ہم لوگ دیہات کے رہنے والے تھے۔ ہمارے گاؤں سے چار میل دور ایک اور گاؤں تھا جس میں ہماری ہی ذات کا اور ہماری حیثیت سے کچھ درجے اوپر کا خاندان رہتا تھا۔ اس خاندان کی حیثیت اونچی ہونے کی وجہ یہ تھی کہ اس کے آدمی انگریزوں کی فوج میں صوبیداری کے عہدے تک چلے گئے تھے۔ ایک بوڑھا پنشن

پر آگیا تھا۔ انگریزوں نے انہیں بہت ساری زمین جسے مربعے کہتے ہیں دے دی تھی۔ یہ خاندان انگریزوں کی بہت مٹھی چاپی کرتا تھا۔

اس خاندان کا ایک جوان پولیس میں چھوٹا تھانیدار تھا جسے اسسٹنٹ سب انسپکٹر کہتے ہیں۔ اس کی عمر چوبیس پچیس سال ہو گئی تھی۔ انگریزوں نے اسے اسی عہدے پر بھرتی کیا تھا۔ اب وہ ایک تھانے میں لگا ہوا تھا۔ یہ تھانہ ہمارے گاؤں سے چالیس پینتالیس میل دور تھا۔ اس چھوٹے تھانیدار کو میں افضل نام دے دیتی ہوں۔ وہ بھی میرے امیدواروں میں سے تھا اور میرے والدین مجھے اسی کو دینا چاہتے تھے۔ کہتے تھے کہ عزت والا اور مال و دولت والا خاندان ہے اور لڑکے کا محکمہ اور عہدہ بڑا اچھا ہے۔

میں دیہات کی لڑکی تھی لیکن مجھ میں دیہات والی سادگی نہیں تھی۔ ہم نوکروں نوکرانیوں والے لوگ تھے۔ گاؤں میں عزت تھی اور رعب داب بھی تھا۔ ہمارے گھر میں پردہ نہیں تھا۔ میں چلبلی لڑکی تھی۔ کسی کی روک ٹوک نہیں تھی۔ کسی کو چھیڑنا اور کسی پر رعب جھاڑ دینا۔ میری حالت شہزادیوں جیسی تھی۔ بس اپنی عزت اور عصمت کا مجھے پورا پورا احساس تھا۔ آپ نے شادی سے پہلے کی محبت کی کہانیاں سنی ہوں گی۔ پنجابی فلمیں بھی دیکھتے ہوں گے۔ میں آپ کو اپنی بات بتاتی ہوں کہ میرے دل میں کسی کی بھی محبت پیدا نہ ہوئی۔ ایک ہی خیال رہتا تھا کہ شادی ہوگی تو خاوند سے محبت کروں گی۔ یہ خواہش تو ہر لڑکی میں ہوتی ہے کہ خاوند خوبصورت ہو۔ میری بھی یہی خواہش تھی۔ میرے والدین کو افضل بہت اچھا لگتا تھا۔ وہ واقعی اچھا لگنے کے قابل تھا۔ قد بہت اچھا' رنگ روپ بڑا پیارا اور نقش تو بہت ہی اچھے تھے۔ میں نے اسے کئی بار دیکھا تھا۔ میں اس کے گاؤں جاتی اور وہ کئی بار میرے گاؤں آیا لیکن اس کے ساتھ میری بات چیت یا سلام دعا کبھی نہیں ہوئی تھی۔

یہ آدمی مجھے پسند تھا لیکن خوبصورت جوان ہونا کوئی ضمانت نہیں کہ یہ شخص اچھا خاوند بھی ثابت ہوگا۔ میں نے اپنے بڑے بھائی سے پوچھا کہ افضل کیسا آدمی ہے۔

"اوچھا آدمی ہے" ___ میرے بھائی نے کہا ___ "کبھی چھٹی آتا ہے تو گاؤں والوں پر تھانیداری کا رعب جھاڑتا رہتا ہے۔ اپنے آپ کو سب کا حاکم سمجھتا ہے۔ ایسی حرکتیں کم ذاتوں والے کیا کرتے ہیں۔ افضل کو کیا پڑی ہے کہ وہ ایسی گھٹیا شوبازی کرتا پھرے۔ اس کے پاس کس چیز کی کمی ہے؟"

میرے بھائی نے اس کے اوچھے پن کی تین چار مثالیں دے کر کہا کہ افضل اسے اچھا نہیں لگتا۔ میرے ابا جان طبیعت کے سخت تھے۔ ان کے آگے کوئی بول نہیں سکتا تھا۔ دوسرے ہی دن افضل کی ماں اور اس کا باپ آگیا۔ میرے ابا جان نے میرا رشتہ افضل کے ساتھ پکا کر دیا۔ مجھے پتہ نہیں چلتا تھا کہ خوشی مناؤں کہ مجھے خوبصورت اور بڑے اچھے قد بُت کا خاوند مل رہا ہے' یا افسوس کروں کہ مجھے جو خاوند مل رہا ہے وہ اوچھا ہے اور کمین ذات والوں کی طرح حرکتیں کرتا ہے۔

افضل کے گاؤں میں ہمارے رشتہ دار رہتے تھے۔ میں انہی کے گھر جایا کرتی تھی اور افضل کو دیکھا تھا۔ میرے رشتہ داروں میں دو جوان لڑکیاں میری سہیلیاں تھیں۔ وہ دو روز بعد مبارک دینے آئیں تو میں نے انہیں کہا کہ وہ افضل کی عادتوں کے متعلق معلوم کریں اور مجھے بتائیں۔ اب میری تحقیقات کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ بات پکی ہو گئی تھی' پھر بھی میں نے اپنے ہونے والے خاوند کے متعلق کچھ جاننا ضروری سمجھا۔

کچھ دنوں بعد مجھے وہی رپورٹیں ملیں جو بھائی دے چکا تھا۔ اس گاؤں کی ایک عورت نے میری سہیلیوں کو بتایا کہ اس کا خاوند کہتا ہے کہ افضل کہہ رہا تھا ___ "مجھے ایسی بیوی چاہئے جو بہت خوبصورت ہو کیونکہ میری پوزیشن بہت اونچی ہے"۔

مجھے خوش ہونا چاہئے تھا کہ مجھے اس نے اپنے معیار اور ضرورت کے مطابق "بہت خوبصورت" سمجھا تھا لیکن میں خوش نہ ہوئی۔ میں تب خوش ہوتی کہ وہ کہتا کہ اسے ایسی بیوی چاہئے جس کے ساتھ وہ محبت کر سکے لیکن اس نے محبت کی بجائے پوزیشن کی بات کی۔ اُس کے گاؤں سے مجھے ایک بھی ایسی رپورٹ نہ ملی کہ اس شخص میں فلاں خوبی ہے۔ میں کسی سے ڈرنے والی نہیں تھی۔ مجھ میں اتنی

جرأت اور ہمّت تھی کہ اس شخص کو قبول کرنے سے صاف انکار کر دیتی لیکن میں اپنے باپ کی پوزیشن اور عزت کو خراب کرنے کو گناہ سمجھتی تھی۔ میرے باپ نے تو میرا بھلا سوچا تھا کہ بیٹی اتنے امیر گھر میں جائے گی اور خوش رہے گی۔ باپ نے تو مجھے ایک تھانیدار دے دیا تھا۔

میں چُپ رہی اور اپنی قسمت اپنے خدا کے حضور رکھ دی۔ ایک مہینے بعد افضل کی بارات آئی اور وہ مجھے ڈولی میں بٹھا کر لے گیا۔ شادی کی پہلی رات کے متعلق ہر لڑکی بڑے خوبصورت خواب دیکھا کرتی ہے۔ میں نے بھی ایسے ہی خواب دیکھے تھے مگر پہلی رات میرا دولہا کمرے میں آیا تو مجھے شک ہونے لگا جیسے یہ کوئی مولوی یا استاد ہے جو مجھے "ازدواجی زندگی میں بیوی کی ذمّہ داریاں" پر لیکچر دے رہا ہے۔ یہ لیکچر دے کر چلا جائے گا پھر میرا دولہا آئے گا، مگر وہ کوئی مولوی یا استاد نہیں تھا، وہ میرا دولہا چوہدری افضل خان اسسٹنٹ سب انسپکٹر تھا۔ وہ کمرے میں ٹہل رہا تھا۔

میں وہ لیکچر پورا نہیں سناؤں گی جو اس نے مجھے دیا تھا۔ اس کا مطلب اور مدعا بلکہ حکم یہ تھا کہ آج رات سے وہ میرا حاکم ہو گا اور میں اس کی زر خرید لونڈی۔ اگر اس کا کوئی حکم مجھے اچھا نہیں لگے گا تو بھی مجھے اس حکم کی تعمیل کرنی پڑے گی۔ میں اس کی اجازت کے بغیر کسی رشتہ دار سے نہیں مل سکتی۔ وہ مجھے اجازت نہیں دے گا کہ میں اس سے کسی بھی قسم کی باز پُرس کروں۔

مجھے معلوم نہیں کہ قیدی جب جیل خانے میں جاتا ہے تو اس کا وہاں استقبال کس طرح ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ نئے قیدی کو پہلے روز بتاتے ہوں گے کہ وہ سزا کے طور پر آیا ہے اور وہ آزادی سے محروم ہو گیا ہے۔ اب وہ جیل خانے سے اپنی سزا کی میعاد پوری کر کے نکلے گا۔ اسے یہ حق نہیں دیا جائے گا کہ اس کے ساتھ برا سلوک کیا جائے تو وہ کوئی اعتراض کرے۔

میرے ساتھ افضل نے ایسی ہی باتیں کیں۔ جیسے جیل خانے کا کوئی افسر نئے قیدی کو حکم سنا رہا ہو کہ وہ کیا کر سکتا ہے اور کیا نہیں کر سکتا۔ شبِ عروسی کے میرے سارے خواب تباہ ہو گئے۔ میں نے افضل کو دیکھا۔ وہ میری طرف دیکھے

بغیر کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ اتنا خوبصورت جوان اس طرح لگ رہا تھا جیسے کوئی گھٹیا سا ایکٹر تھیٹر کے سٹیج پر ایک امیر زادے کی ایکٹنگ کر رہا ہو۔ یہ شک بھی ہُوا کہ یہ شخص تھانیدار نہیں نہ یہ اونچی ذات کا آدمی ہے نہ اس کی کوئی زمین جائیداد ہے۔ یہ بہروپیا ہے۔

مجھے یاد نہیں کہ وہ ایک گھنٹہ بولتا رہا یا دو گھنٹے بولتا رہا، میری حالت یہ ہو گئی کہ میں اس کے لئے محبت کا جو تحفہ لائی تھی اسے میں نے اپنے سینے میں ہی دفن کر دیا۔ زبان پر بہت باتیں آئیں جو میں اسے کہنا چاہتی تھی لیکن میں نے ہونٹ سی لئے اور دل پر پتھر رکھ لیا۔ مجھے نیند آنے لگی۔ اس دولہا کے ساتھ ذرا سی بھی دلچسپی نہ رہی۔ میری اس حالت میں وہ میرے قریب آیا۔ پھر بھی اس نے پیار اور محبت کی کوئی بات نہ کی۔ اس کی بجائے اس نے حکم کے لہجے میں مجھے لیٹ جانے کو کہا۔ میرا خون اُبل پڑا کہ میرے ساتھ زبردستی کی جا رہی ہے لیکن میں کچھ نہ کر سکی۔ پرانے زمانے کی لونڈیوں کی طرح میں نے اس کا وہ حکم بھی مانا جسے میں آج بھی ایک انتہائی غلیظ حکم کہتی ہوں۔

میں دوسرے روز میکے گئی۔ میری ماں بہت خوش تھی۔ اس نے مجھ سے پہلی رات کی بات پوچھی۔ میں نے مایوسی کے لہجے میں کہا —— "میری زندگی میں صرف یہ تبدیلی آئی ہے کہ میں اب کنواری نہیں رہی اور اب میں خصم والی ہو گئی ہوں"۔

ماں نے کیا کہا، میں نے کیا کہا، اسے الگ رکھیں۔ یہ لمبی باتیں ہیں۔ صرف یہ سن لیں کہ اپنے خاوند کے ساتھ واپس جاتے میرے دل کو بہت تکلیف ہوئی۔ دل کو اس امید پر بہلایا کہ خاوند کے ساتھ بے تکلفی پیدا ہو جائے گی تو اسے کہوں گی کہ میں اسے حاکم چھوڑ مہاراجہ سمجھتی ہوں لیکن پیار اور محبت کے بغیر زندگی میں کوئی لطف نہیں ہوتا، مگر اس نے میرے ساتھ وہ بے تکلفی پیدا نہ کی جو میں چاہتی تھی اور جو ہر لڑکی چاہتی ہے۔ مجھے صرف ایک اطمینان تھا کہ میں اس کی پسند کی بیوی ہوں۔

اُس کی چھٹی ختم ہو گئی اور وہ مجھے اپنے ساتھ لے گیا۔ وہ چھوٹا سا ایک قصبہ تھا جہاں ایک ہی تھانہ تھا۔ اردگرد کے دیہات کا علاقہ بھی اسی تھانے میں آتا تھا۔ افضل نے بڑا اچھا مکان کرائے پر لے لیا تھا۔ ہم دونوں جب اکیلے رہنے لگے تو مجھے امید پوری ہوتی نظر آنے لگی کہ افضل اپنے آپ کو میرے جذبات کے مطابق بدل دے گا مگر دن گزرتے گئے اور میری امید مرتی گئی۔ تھانے میں تو وہ چھوٹا تھانیدار تھا لیکن گھر میں وہ بڑا تھانیدار بن جاتا تھا۔ محبت اور بے تکلفی کی بجائے وہ مجھے پیسے بہت دیتا تھا۔ چھٹے ساتویں روز پانچ پانچ اور دس دس کے پانچ چھ نوٹ مجھے دے دیتا۔ اس نے یہ کبھی نہیں پوچھا تھا کہ میں اتنے زیادہ پیسے خرچ کرتی ہوں یا اپنے ماں باپ کو بھیج دیتی ہوں یا کیا کرتی ہوں۔

ایک بار میں نے پھیری والے سے اپنی پسند کا ایک کپڑا خریدا۔ افضل گھر آیا تو میں نے اسے بتایا اور کپڑا دکھایا۔ مجھے امید تھی کہ وہ میرا دل رکھنے کے لئے کپڑے کی تعریف کرے گا لیکن اس نے کہا ——— "مجھے مت دکھاؤ۔ میں تم سے کبھی حساب نہیں مانگوں گا۔ میں تمہیں پیسے خرچ کرنے کے لئے دیتا ہوں" ——— اُس نے جیب سے تین چار نوٹ نکالے اور میرے آگے پھینک دیئے۔

کبھی کبھی شام کو وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر سیر کو نکلا کرتا تھا۔ پاس سے گزرنے والے لوگ اسے جھک کر سلام کرتے تھے۔ قصبے یا دیہات کا تھانیدار چھوٹا ہو یا بڑا علاقے کا بادشاہ سمجھا جاتا تھا۔ میں اسے دیکھتی تو اس کے چہرے پر بادشاہوں والا تاثر ہوتا تھا۔ میں سمجھ گئی کہ وہ مجھے باہر لا کر یہ دکھانا چاہتا ہے کہ دیکھو لوگ مجھے کس طرح سلام کرتے ہیں' اور لوگوں کو وہ دکھاتا تھا کہ دیکھو میں کتنی خوبصورت بیوی کا خاوند ہوں۔

اس شوبازی سے تو میری تسکین نہیں ہو سکتی تھی۔ میں ایک خوبصورت چڑیا تھی جسے ایک آدمی نے پنجرے میں بند کر رکھا تھا۔ میں چڑیا کی طرح تڑپ رہی تھی۔

اُس تھانے کا انچارج ایک ہندو سب انسپکٹر تھا۔ اس کی بیوی مجھ سے آٹھ نو

سال بڑی تھی۔ زندہ دل عورت تھی۔ ہندو ہونے کے باوجود زندہ دل تھی اور میرے ساتھ وہ بڑی جلدی بے تکلف ہو گئی۔ عورتیں ایک دوسرے سے پردہ نہیں رکھا کرتیں۔ وہ مجھے اپنے خاوند کی باتیں سناتی اور میں اسے اپنے خاوند کی باتیں سناتی تھی۔ میری اور اس ہندو عورت کی گہری دوستی ہو گئی اور ہمارے راز سانجھے ہو گئے۔ اس نے مجھے یہاں تک بتا دیا کہ اپنے میکے گاؤں کے ایک مسلمان کے ساتھ اُس کی ناجائز محبت شادی سے پہلے کی چلی آ رہی ہے اور وہ صرف اُس کے لئے اپنے میکے گاؤں جاتی رہتی ہے۔

جب بے تکلفی اتنی زیادہ ہو گئی تو اُس عورت نے مجھے افضل کی باہر کی باتیں بتانی شروع کر دیں جو اسے اس کا خاوند بتایا کرتا تھا۔ مجھے اس عورت سے پتہ چلا کہ افضل خان تفتیش کے معاملے میں بڑا عقل مند ہے اور اپنا دماغ استعمال کر کے ایسے سراغ پا لیتا ہے جنہیں خود پولیس والے ناممکن کہا کرتے تھے۔ تھانے کے دیہاتی علاقے کے بڑے جابر قسم کے پیشہ ور چور اور ڈاکو افضل کے نام سے بھی ڈرتے تھے۔ قصبے کے غنڈے بدمعاش تھانیداروں سے ڈرا ہی کرتے ہیں لیکن افضل کے وہ اشاروں پر ناچتے تھے۔ یہ تو وہ خوبیاں تھیں جو ہر تھانیدار میں ہونی چاہئیں۔ افضل میں یہ خوبیاں بھری ہوئی تھیں لیکن اس شخص میں خرابی یہ تھی کہ رشوت لیتا تھا۔ انگریزوں کی حکومت میں رشوت لینے کے لئے جرأت کی ضرورت تھی جو افضل نے اپنے آپ میں پیدا کر رکھی تھی۔

وہ مجھ پر جو نوٹ نچھاور کرتا رہتا تھا وہ رشوت کی دولت تھی۔ بڑے تھانیدار کی بیوی نے مجھے یہ بھی بتایا کہ افضل تھانیدار ہونے کے ساتھ ساتھ خوبصورت جوان بھی ہے اس لئے ایک ہندو اور ایک مسلمان عورت نے اس کے ساتھ بڑی گہری دوستی پیدا کر رکھی ہے اور ان کی ملاقاتیں شہر کے ایک بدمعاش کے گھر میں ہوتی ہیں۔

تین سال اسی حالت میں گزر گئے۔ بڑا تھانیدار تبدیل ہو کر چلا گیا۔ افضل اسی تھانے میں رہا اور ایسا ہی رہا جیسا پہلے تھا۔ میں اس عرصے میں کچھ دنوں کے لئے اپنے ماں باپ کے پاس بھی رہی اور افضل کے ماں باپ کے پاس بھی۔ میں نے

اپنے جذبات کا گلا دبا دیا اور دل کو پھونک مار کر بجھا دیا۔ میرے وجود میں تلخیاں پیدا ہو کر مجھے بے چین کرنے لگیں۔ جسمانی لحاظ سے مجھے افضل سے کوئی شکایت نہیں تھی، میرے جذبات پیاس سے مرگئے تھے لیکن میں نے اپنی تسکین کا اور کوئی ناجائز ذریعہ اختیار نہ کیا۔ کوئی غلط روش سوچی ہی نہیں۔ میں اپنے آپ کو اتنی مری ہوئی سمجھنے لگی کہ افضل سے یہ گِلہ بھی نہ کیا کہ اس کی دلچسپی باہر کی عورتوں میں ہے۔

جب شادی کا دوسرا سال آدھا گزر گیا تو سب سے پہلے میری ماں نے مجھ سے پوچھا تھا کہ میں نے ابھی تک بچہ نہیں جنا اور اس کے آثار بھی نہیں۔ میں اس کا کیا جواب دے سکتی تھی۔ یہی کہا کہ ہم دونوں ٹھیک ہیں۔ نقص نہ افضل میں تھا نہ مجھ میں۔ اس کے بعد ساس نے مجھ سے پوچھا۔ اسے بھی میں نے یہی جواب دیا۔ دو سال گزر گئے تو خاوند نے کہا کہ اب بچّہ پیدا ہونا چاہئے۔ میں نے اسے کہا کہ یہ ہم دونوں کے اختیار میں نہیں۔

تین سال ہو گئے تو میری ساس نے تشویش کا اظہار کیا کہ بچّہ نہیں ہوتا۔ میری ساس اچھی عورت تھی۔ اس نے کبھی اوچھی بات نہیں کی تھی۔ اس کے آنسو نکل آئے۔ کہنے لگی کہ وہ مزاروں اور خانقاہوں پر جا کر منتیں اور نذرانے مان رہی ہے۔ اس کے آنسو دیکھ کر میرے بھی آنسو نکل آئے۔

اُس عمر میں مجھے نفسیات اور فلسفے کے نام سے بھی واقفیت نہیں تھی۔ آج جب میری اولاد اس عمر کو پہنچ گئی ہے جس عمر کی میں اپنی بات سنا رہی ہوں تو مجھے علم کی رمزیں معلوم ہو گئی ہیں۔ افضل بھی ٹھیک تھا۔ میں بھی ٹھیک تھی۔ ہم دونوں بچہ پیدا کرنے کے قابل تھے لیکن میں پختہ عمر میں آکر سمجھی ہوں کہ بچہ کیوں نہیں ہوتا تھا۔ میرا ذہن اور میری روح قبول نہیں کرتی تھی کہ میں افضل کا بچہ پیدا کروں۔ میرا جسم اس کے قبضے میں ہوتا تھا مگر میری روح روتی تھی، بھٹکتی تھی۔ ایسے لگتا تھا جیسے مجھے بدبُو اور غلاظت میں پھینک دیا گیا ہے۔ میرا دماغ پھٹنے لگتا تھا۔

ازدواجی زندگی کے چوتھے سال کے آغاز میں افضل کو ترقی دے کر سب انسپکٹر بنا دیا گیا۔ اس ترقی میں سفارش کا بھی دخل تھا۔ افضل کے بزرگ انگریزوں کے

خدمت گار تھے۔ جنگِ عظیم شروع ہو چکی تھی۔ افضل کے خاندان نے انگریزوں کو جنگی فنڈ میں دل کھول کر چندہ دیا تھا۔ اس کے صِلے میں افضل کو وقت سے کچھ پہلے ترقی مل گئی۔ اس کی رپورٹیں بھی اچھی تھیں۔ پولیس آفیسر کی حیثیت سے وہ قابل آدمی مانا جاتا تھا۔

سب انسپکٹر بنا کر اسے ایسے ہی ایک قصبے کے تھانے کا انچارج بنا دیا گیا۔ یہ نیا تھانہ میرے گاؤں سے تقریباً" ایک سو میل دور تھا۔ افضل مجھے ساتھ لے کر وہاں چلا گیا اور اس نے تھانے کا چارج لیا۔ پہلے قصبے کی نسبت نیا قصبہ شہر لگتا تھا۔ اس کی آبادی زیادہ تھی اور اس کے خدوخال شہروں جیسے تھے۔ یہاں بھی پہلے قصبے کی طرح ارد گرد کا دیہاتی علاقہ اس قصبے کے تھانے میں آتا تھا۔

یہاں ہمیں زیادہ خوبصورت اور کشادہ مکان ملا۔ میرے خاوند کا دماغ سب انسپکٹری نے اور اونچا، بلکہ خراب کر دیا۔ میں آپ کو یہ بتا دوں کہ وہ مجھ پر کوئی سختی نہیں کرتا تھا۔ مجھے روکتا ٹوکتا نہیں تھا۔ اس نے شادی کی پہلی رات مجھے کہا تھا کہ مرد حاکم ہوتا ہے اور عورت اس کے ہر حکم تعمیل کرتی ہے لیکن اس نے عملی طور پر مجھ سے کبھی کوئی ایسا حکم نہیں منوایا تھا جو میں نہ ماننا چاہتی۔ میں یہ کہہ رہی ہوں کہ اس کی طبیعت خشک اور مزاج حاکموں جیسا تھا۔ مثلاً" میں گھر کے متعلق یا کسی شادی یا ماتم پر جانے کے متعلق اور وہاں کچھ دینے دلانے کے متعلق کوئی مشورہ دیتی تو وہ فوراً" حاکم بن جاتا، کوئی فیصلہ نہ دیتا اور اس طرح کی ایکٹنگ کرتا جیسے وہ سوچ کر اور فرصت کے وقت اپنا فیصلہ سنائے گا۔

میں چلبلی اور ہنسوڑ لڑکی تھی۔ دل بیتاب ہوتا تھا کہ کبھی وہ مجھے چھیڑے، میں اسے چھیڑوں اور ہنس کھیل کر کچھ وقت گزرے مگر اس میں ہنسی مذاق والا کل پُرزہ تھا ہی نہیں۔ وہ میرے ساتھ کھل کر بات بھی نہیں کرتا تھا۔ میں اس کے لئے گھر کے استعمال والی دوسری چیزوں کی طرح ایک بے جان چیز تھی جسے وہ اپنی مرضی کے مطابق استعمال کرتا اور الگ رکھ دیتا تھا۔ اگر میرا ایک بچہ ہو جاتا تو میں اس سے دل بہلا لیا کرتی۔

ایک روز اُس نے مجھے کہا —— "تم بتا سکتی ہو کہ اتنے عرصے میں تم نے بچّہ

کیوں نہیں پیدا کیا؟"

میں جلی بیٹھی تھی۔ میں نے کہا — "آپ بتا سکتے ہیں کہ آپ کا بچّہ کیوں پیدا نہیں ہُوا؟"

"میں تم سے پوچھ رہا ہوں" — اس نے ایسے لہجے میں کہا جیسے میں کسی واردات میں مشتبہ ہوں۔ اس نے کہا — "مجھے فوراً" میرے سوال کا جواب ملنا چاہیے"۔

"میرے اندر بھی تو نہیں لگی ہوئی کہ بچّے بنا بنا کر آپ کو دیتی چلی جاؤں" — میں نے کہا — "میں بالکل ٹھیک ہوں۔ اپنا علاج کرائیں۔ کسی ڈاکٹر سے چیک کرائیں"۔

مرد اس چوٹ کو برداشت نہیں کر سکتا کہ اس کی بیوی اسے کہے کہ وہ بچہ پیدا کرنے کے قابل نہیں۔ مرد یہ نہیں سوچتا کہ ہو سکتا ہے قدرت نے اسے اس وصف سے محروم رکھا ہو۔ میرا خاوند بھی یہ چوٹ برداشت نہ کر سکا۔ اس روز اس نے مجھے یاد دلایا کہ عورت کو حق حاصل نہیں کہ وہ مرد کی توہین کرے۔ میں اپنے قابو سے نکل گئی۔ تین برسوں کا رکا ہوا غبار پھٹ پڑا۔ یہ ہماری پہلی لڑائی تھی۔ بہت بک بک ہوئی۔ اس نے مجھے ڈانٹتے ہوئے کہا — "میں تمہیں بکواس کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ تم میری بیوی ہو"۔

"بیوی نہیں" — میں نے چلّا کر کہا — "آپ نے مجھے داشتہ بنا کے رکھا ہُوا ہے۔ میں بیوی بننا چاہتی ہوں۔ میرا صرف جسم نہیں، اس جسم میں روح بھی ہے، جذبات بھی ہیں"۔

اُس کے پاس اس کے سوا کوئی جواب نہیں تھا کہ وہ مرد ہے اور میں عورت ہوں جسے بکواس کرنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ اگر وہ باوقار مردوں کی طرح مجھے ڈانٹ ڈپٹ کرتا تو وہ مجھے اچھا لگتا۔ یہ تو مجھے معلوم تھا کہ وہ اوچھا آدمی ہے لیکن اُس روز مجھے پتہ چلا کہ وہ اندر سے بالکل ہی کھوکھلا ہے۔ اُس روز میرے دل میں اُس کی جو ذرا سی عزّت رہ گئی تھی وہ بھی نکل گئی اور دل نفرت سے بھر گیا۔

ایک اور سال گزر گیا۔ اس تھانے میں جو چھوٹا تھانیدار (اے۔ ایس۔ آئی)

آیا وہ مسلمان تھا۔ اس کی عمر پچیس سال کے لگ بھگ تھی۔ افضل نے مجھے کہا کہ وہ اسے کھانے پر مدعو کرنا چاہتا ہے۔ میں نے بڑے اچھے کھانے کا انتظام کیا اور نیا اے۔ ایس۔ آئی ہمارے گھر آیا۔ اصلی نام کی بجائے میں اسے یٰسین کہوں گی۔ افضل میری نمائش کرنے کا عادی ہو گیا تھا۔ یٰسین آیا تو افضل نے مجھے بلایا اور یٰسین سے میرا تعارف کرایا۔ میں کچھ دیر ان کے پاس بیٹھی۔

افضل کی کوئی بات اور اس کا کوئی کام مجھے اچھا نہیں لگتا تھا۔ میں یٰسین کے سامنے دو تین منٹ سے زیادہ نہیں بیٹھنا چاہتی تھی کیونکہ میں جانتی تھی کہ افضل اسے دکھا رہا ہے کہ اس کی بیوی کتنی خوبصورت ہے۔ میں اپنے آپ پر جبر کر کے بیٹھ گئی لیکن یٰسین کی باتیں مجھے اتنی اچھی لگیں کہ میں نے جلدی اٹھنے کا ارادہ بدل دیا۔ وہ ہنسنے اور ہنسانے والا آدمی تھا۔ افضل کو خدا نے ہنسی سے محروم رکھا ہُوا تھا۔ میں نے اسے یٰسین کی باتوں پر مسکراتے دیکھا۔

یٰسین نے تین خاوندوں اور ان کی بیویوں کی اتنی دلچسپ باتیں سنائیں کہ میں ہنس ہنس کے دوہری ہونے لگی۔ میں نے محسوس کیا کہ میرے وجود میں زہر بھر گیا تھا۔ یہ زہر نکل گیا اور میری حالت ایسی ہو گئی جیسے میں زندہ دفن ہو گئی تھی، اور یٰسین نے مجھے زمین سے نکال کر مجھ میں نئی روح پھونک دی ہے یا روح کو تازہ کر دیا ہے۔

شکل و صورت اور رنگ روغن کے لحاظ سے وہ افضل کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھا۔ اس کا رنگ گندمی تھا۔ اس کا قد بُت افضل کی طرح اچھا تھا۔ وہ چونکہ زندہ دل تھا اس لئے اس کے چہرے پر رونق اور آنکھوں میں بڑی پیاری چمک تھی۔ اگر افضل مجھے یہ نہ کہتا کہ جاؤ کھانا بھیجو تو میں یٰسین کے سامنے جانے کب تک بیٹھی رہتی۔

یٰسین کھانا کھا کر چلا گیا۔ مجھے اس کے جانے کا افسوس ہُوا۔ آٹھ دس دنوں بعد ایک شام وہ پھر آیا۔ میں افضل کے کہنے کے بغیر اس کمرے میں جا بیٹھی جس میں دونوں بیٹھے ہوئے تھے۔ اس کی مزاحیہ باتوں نے مجھے بہت لطف دیا۔ اسے دیکھ کر مجھے افضل پہلے سے زیادہ بُرا لگنے لگا۔ یٰسین نے یہ معمول بنا لیا کہ وہ آٹھ دس

دنوں بعد افضل کے ساتھ میرے گھر آتا۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ میں اس کی باتوں کو پسند کرتی ہوں۔ مجھے خوش کرنے کے لئے وہ ہنسنے ہنسانے والی ہی باتیں کرتا تھا۔

وہ چار پانچ مرتبہ آچکا تو ایک روز افضل کو سیشن کورٹ میں گواہی کے لئے بلایا گیا۔ سیشن کورٹ والا شہر تیس میل سے ذرا زیادہ دور تھا۔ افضل کو صبح جا کر شام کو واپس آجانا تھا لیکن وہ نہ آیا۔ اس کی بجائے شام یٰسین میرے گھر آیا۔ اس نے بتایا کہ افضل کا پیغام آیا ہے کہ وہ کل شام آئے گا۔ پولیس ہیڈ کوارٹر وہیں تھا۔ وہ ہیڈ کوارٹر میں کسی کام کے لئے رک گیا تھا۔ مجھے خوشی ہوئی کہ افضل نہیں آیا اور یٰسین آگیا ہے۔ یٰسین نے کہا کہ وہ افضل کی غیر موجودگی میں میرے پاس نہیں بیٹھے گا لیکن میں نے اسے زبردستی بٹھا لیا۔ اس کی باتوں نے میری زندہ دلی کو جگا دیا۔ افضل کے سامنے تو میں یٰسین کی باتیں صرف سنتی اور ہنستی تھی۔ افضل نہیں تھا تو میں نے یٰسین کے ساتھ بے دھڑک ہنسی مذاق کی باتیں کیں۔

وہ جب جانے لگا اس وقت تک میں ہلکی پھلکی ہو چکی تھی۔ میرے منہ سے نکل گیا کہ افضل اتنا سنجیدہ اور ایسا کھچا روٹھا سا رہتا ہے کہ میرا دل مُردہ ہو گیا ہے۔ میں نے اسے کہا کہ وہ آتا رہا کرے۔

دوسرے دن وہ شام کو آنے کی بجائے دوپہر کو آگیا۔ میں نے اسے کھانا کھلایا اور کچھ دیر بٹھائے رکھا۔ ہم نے اچھی باتیں کیں۔ اداس باتیں کیں۔ تلخیوں سے بھری ہوئی باتیں کیں اور ایسی باتیں بھی کیں جن سے اداسیاں اور تلخیاں قہقہے بن گئیں۔ میں یٰسین کو افضل کے مقابلے میں خوبصورت سمجھنے لگی۔ حقیقت میں افضل صحیح معنوں میں خوبصورت آدمی تھا۔ یہ بھی ذہن میں رکھیں کہ یٰسین کے ساتھ میری گہری بے تکلفی پیدا ہو گئی تھی۔ اسے دوستی بھی کہا جا سکتا ہے لیکن میں خدا کو حاضر ناظر جان کر کہتی ہوں کہ میں نے اس کے ساتھ میاں بیوی والے تعلقات پیدا کرنے کی سوچی ہی نہیں۔ میں آپ کو بتا چکی ہوں کہ مجھے کوئی جسمانی تشنگی نہیں تھی۔ اگر میں حیوانوں کی سطح پر بات کروں تو افضل بہترین حیوان تھا۔ حیوانی سطح پر اس نے مجھے ہمیشہ مطمئن رکھا تھا مگر انسان ہمیشہ کے لئے حیوان نہیں رہ سکتا۔ عورت کو اس سفلی سطح پر دیکھنے والے بہت بڑی غلطی پر ہوتے ہیں۔

عورت شفقت، محبت اور زندہ دلی چاہتی ہے۔

ایک جذباتی تسکین سی تھی جو مجھے یٰسین سے مل گئی تھی۔ اس نے بھی کبھی بری نیت کا اظہار نہیں کیا تھا۔ شاید وہ افضل سے ڈرتا تھا۔ اس کے بعد ایسے ہوا کہ افضل چونکہ تھانے کا انچارج تھا، اس لئے اسے اکثر کورٹوں میں شہادت کے لئے جانا پڑتا تھا۔ کبھی وہ کسی سنگین واردات کی تفتیش کے لئے دیہاتی علاقے میں جاتا تو تین تین چار چار دن وہیں رہتا۔ انگریزوں کی حکومت تھی اور انگریز تفتیش کے معاملے میں بہت سختی کرتے تھے۔ ڈاکے اور قتل کی واردات ہو جائے تو تھانیدار کے لئے حکم تھا کہ واردات والے گاؤں میں رہے اور سراغ لگا کر وہاں سے ہلے۔

یٰسین افضل کی موجودگی میں بھی آتا تھا اور افضل کی غیر حاضری میں زیادہ بیٹھتا تھا۔ ایک روز میں نے اس سے پوچھا کہ وہ اپنی بیوی کو کیوں نہیں لاتا۔ وہ فوراً اداس ہو گیا۔ کہنے لگا کہ اس کی بیوی میری طرح خوبصورت تھی لیکن سڑیل مزاج تھی۔ یٰسین نے اسے اپنی طبیعت کے مطابق بدلنے کی بہت کوشش کی۔ اسے اتنے پیسے دیتا رہا جتنے اس نے اپنے ماں باپ کے گھر کبھی نہیں دیکھے تھے۔ اسے قیمتی اور نئے ڈیزائنوں کے کپڑے دیتا رہا۔ اسے گھماتا پھراتا رہا مگر وہ لڑکی اپنی عادتیں نہ بدل سکی۔ وہ ہر بات میں مین میخ نکالتی اور مُنہ بسور لیتی تھی۔

یٰسین کو یہ لڑکی اتنی اچھی لگتی تھی کہ اسے چھوڑنا اس کے لئے موت تھی لیکن اس لڑکی نے یٰسین جیسے زندہ دل آدمی کی زندگی کو جہنم بنا دیا۔ یٰسین نے بتایا کہ اس کی ساس بھی ایسی ہی تھی۔ بیٹی پر اس کا اثر تھا۔ آخر تنگ آکر یٰسین نے اپنی ساس سے کہا کہ وہ اپنی بیٹی کو سمجھائے کہ اسے کسی قسم کی تنگی نہیں پھر وہ کیوں لڑنے مرنے پر تیار رہتی ہے۔ ساس نے یٰسین کی دلجوئی کرنے کی بجائے اس کے ساتھ وہی سلوک کیا جو بیوی اس کے ساتھ کر رہی تھی۔ یٰسین نے دیکھا کہ اس کی بیوی کو بہتر بنانے کی بجائے اس کی ماں اسے بدتر کر رہی ہے تو اس نے بیوی کو طلاق دے دی اور حق مہر کے علاوہ بھی کچھ رقم دی۔

"دوسری شادی کب کر رہے ہو؟" —— میں نے پوچھا۔

"دل اکھڑ گیا ہے" ___ اُس نے مایوسی کے لہجے میں کہا ___ "جو اپنے دل کو اچھی لگتی تھی وہ اپنی نہ بنی تو مجھے وہم ہو گیا ہے کہ کوئی بھی میری نہ بن سکے گی"۔

میرے ذہن میں اپنی برادری کی دو لڑکیاں آگئیں۔ دونوں خوبصورت اور میری طبیعت کی تھیں۔ میں نے یٰسین سے کہا کہ وہ شادی کرنا چاہے تو میں اس کی پسند کی لڑکی کے ساتھ کرا سکتی ہوں۔ اس نے کہا کہ اس کی اپنی برادری میں لڑکیوں کی کمی نہیں لیکن پہلا زخم مل جائے تو وہ دوسرا زخم کھانے کی سوچے گا۔ اس کی ازدواجی زندگی کا یہ انجام سن کر میرے دل میں اس کی ہمدردی پیدا ہو گئی۔ اس کی جذباتی حالت میرے سوا کوئی نہیں سمجھ سکتا تھا۔ میرے اپنے جذبات کا یہی حشر اور انجام ہو رہا تھا۔ وہ تو مرد تھا اس لئے زنجیر توڑ کر آزاد ہو گیا تھا۔ مجبوری عورت کے لئے ہوتی ہے جو گل سڑ جاتی ہے' آزاد نہیں ہو سکتی' جلتے ہوئے تنور سے نکل نہیں سکتی۔

یٰسین کا اور میرا درد ایک جیسا تھا۔ اس کے بعد ہمیں مل بیٹھنے کا موقع ملتا تو ہم اس درد کی باتیں کرتے اور وہ مجھے ہنسا کر میرا درد کم بھی کر دیتا۔ پھر میں نے اسے بتا دیا کہ میرے ساتھ بھی وہی بیت رہی ہے جو اس کے ساتھ بیتی ہے۔ میں نے اس سے پہلے اُس کے ساتھ افضل کے خلاف کبھی بات نہیں کی تھی۔ اب کی تو اس نے مجھے بتانا شروع کر دیا کہ افضل کو تھانے کے عملے کا بھی کوئی آدمی پسند نہیں کرتا۔

"اس کا حکم ماننا پڑتا ہے" ___ یٰسین نے کہا ___ "وہ خود کہیں سے رشوت لیتا ہے تو اس کے ساتھ جو ہیڈ کانسٹیبل اور کانسٹیبل ہوتے ہیں انہیں بھی دلا دیتا ہے۔ بس یہ ایک وجہ ہے کہ اسے عملہ پسند کرتا ہے۔ میں نے اس کے ساتھ دوستی اس لئے بنا رکھی ہے کہ مجھے آئندہ ترقی کے لئے اس کی اچھی رپورٹ کی ضرورت ہے۔ میں اسے ناراض نہیں کر سکتا"۔

"سنا ہے باہر کی عورتوں میں دلچسپی لیتا ہے!" ___ میں نے کہا۔

"اس کی دلچسپی ہے ہی باہر کی عورتوں کے ساتھ" ___ یٰسین نے کہا ___ "اگر کوئی شریف آدمی کسی طرح پولیس کے چکر میں آجائے تو اس کے گھر کی

شریف عورتوں پر بھی بُری نظر رکھ لیتا ہے"۔

یٰسین نے مجھے افضل کی بہت سی باتیں سنائیں۔ میں تو یہ سمجھنے لگی کہ افضل کو صرف میرے ساتھ دلچسپی نہیں اور اس کی ساری دلچسپیاں باہر کی عورتوں کے ساتھ ہیں۔ میں نے افضل سے کچھ بھی نہ کہا۔ بے فائدہ تھا۔ چار سال گزر گئے تھے۔ اگر اسے میرا خیال ہوتا تو اس عرصے میں کچھ تو بدلتا۔ اسے بدلنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ میں اس کی قیدی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ بھاگ نہیں سکتی۔

اس میں تو کوئی تبدیلی نہ آئی' میری سوچوں میں انقلاب آنے لگا۔ نفرت اتنی زیادہ ہو گئی کہ افضل گھر آتا تو میری سانسیں اکھڑ جاتیں اور میرا جسم تپ جاتا تھا۔ پہلے اس طرح نہیں ہوتا تھا۔ ایک خیال میرے دل پر بیٹھ گیا جو مجھے غصہ دلاتا تھا۔ خیال یہ آنے لگا کہ یہ شخص قابلِ نفرت ہے اور میں اتنی مجبور ہوں کہ یہ میری عصمت دری کرتا ہے اور میں کچھ نہیں کر سکتی۔ میں نے ذہن سے اتار دیا کہ یہ میرا خاوند ہے۔

اس پر ہماری دو مرتبہ لڑائی ہوئی۔ میں طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر کے اس سے الگ سوئی اور اس کے حکم کو میں نے دھتکار دیا۔ اب تو میری اور اس کی دشمنی ہو گئی تھی۔ مجھے ڈر یہ تھا کہ وہ کبھی مجھ پر یہ الزام عائد کر دے گا کہ میری یٰسین کے ساتھ دوستی ہے۔ مرد کو اپنی بیوی کے خلاف کوئی شکایت نہ ملے تو وہ بیوی پر بدچلنی کا الزام تھوپ دیتا ہے لیکن اس نے ایسی کوئی بات نہ کی۔ اُدھر اشارہ تک نہ کیا۔

میں نے شادی سے پہلے بھی کوئی گناہ نہیں کیا تھا' شادی کے بعد بھی میں پاک صاف رہی' پھر بھی خدا نے مجھے ایسی سزا دی جیسے میں نے کوئی گناہ کیا ہو جسے خدا بھی برداشت نہ کر سکا۔ ایک تو یہ خاوند مجھے سزا کے طور پر ملا۔ خدا نے سوچا ہو گا کہ یہ کافی نہیں۔ اس کی ذاتِ باری نے مجھے ایسی سزا دی کہ میں پاگل ہو گئی۔ ہُوا یہ کہ میرے ابا جان اور میرا بڑا بھائی قتل ہو گئے۔ کھیتوں کو پانی لگانے پر جھگڑا ہُوا۔ نوبت لڑائی تک آگئی دوسرے فریق کے آدمی زیادہ تھے۔ میرا باپ بھی مارا گیا بھائی

بھی مارا گیا۔ پیچھے میرا چھوٹا بھائی رہ گیا اور ماں رہ گئی۔

لڑکی کے لئے ماں باپ اور بھائی جذباتی سہارا ہوتے ہیں۔ لڑکی انہی کے ساتھ دُکھ درد کی بات کر سکتی ہے۔ جسے افضل جیسا خاوند مل جائے اس کے لئے تو ماں باپ ہی پناہ ہوتے ہیں۔ میرا یہ سہارا مجھ سے چھن گیا۔ قاتلوں کو عمر قید کی سزا ملی تھی۔ اگر انہیں پھانسی دے دی جاتی تو بھی مجھے میرا باپ اور بھائی تو نہیں مل سکتا تھا۔

اس اتنے ظالم حادثے کے بعد مجھے ہر طرف اندھیرا اور مایوسی کی گھٹائیں نظر آنے لگیں۔ اگر افضل میرے سر پر ہاتھ رکھ لیتا اور مجھے غم زدہ سمجھ کر میرا غم ہلکا کرنے کی کوشش کرتا تو میں اپنے دل سے نفرت نکال کر محبت پیدا کر لیتی مگر اُس کا رویّہ اور سلوک پہلے سے زیادہ خراب ہو گیا۔ میں اب یٰسین کی ضرورت پہلے سے زیادہ محسوس کرنے لگی۔

چھ سات مہینے گزر گئے۔ قصبے میں ایک مسلمان کے گھر میں نقب لگی۔ زیورات، نقدی اور کچھ اور قیمتی سامان نکل گیا۔ نقب زنی سنگین واردات سمجھی جاتی تھی۔ افضل اس کی تفتیش میں مصروف ہو گیا۔ اس نے مجھے کبھی نہیں بتایا تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے اور تفتیش کہاں تک پہنچی ہے۔ اس کی غیر حاضری میں یٰسین مجھے بتاتا تھا کہ کیا واردات ہوئی ہے اور تفتیش کیا ہو رہی ہے۔

ایک روز افضل کسی کیس کی شہادت دینے سیشن کورٹ میں چلا گیا۔ اسے شام کو واپس آنا تھا۔ یٰسین آ گیا۔ اس نے بتایا کہ افضل نقب زنی کی تفتیش میں بڑا ظلم کر رہا ہے۔ جس کے گھر نقب لگی تھی وہ روپے پیسے والا آدمی تھا۔ اس نے شک میں دو تین آدمیوں کے نام لکھوا دیئے۔ یہ سب اس کے رشتہ دار تھے۔ وہ کہتا تھا کہ ان رشتہ داروں نے دشمنی کی وجہ سے اس کے گھر نقب لگوائی ہے اور گھر بھیدی کا کام کیا ہے۔ افضل نے ان سب کو تھانے بلا لیا اور ان کی پٹائی کر رہا تھا۔

یہ تھانے کے معاملے تھے۔ ان کے ساتھ میری کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ مُشتبہوں کو مارتا پیٹتا اور مجرموں کو پکڑتا تھا تو یہ اس کی ڈیوٹی تھی۔ وہ فرشتہ نہیں تھا

کہ کسی کو دیکھ کر یقین سے کہہ دیتا کہ یہ ہے وہ شخص جس نے یہ واردات کی ہے۔ مجھے افسوس اور غصہ ایک اور بات پر آ رہا تھا جو یٰسین نے مجھے بتائی۔ مشتبہوں میں ایک آدمی کچھ غریب تھا۔ تیس سال کے لگ بھگ اس کی عمر تھی۔ اس کی بیوی جس کی عمر چھبیس ستائیس سال ہو گی خاصی خوبصورت عورت تھی۔ یٰسین کہتا تھا کہ افضل ان مشتبہ آدمیوں سے نقد رشوت کا سودا کر رہا ہے۔ یہ سب غریب تھے اور اتنی رقم نہیں دے سکتے تھے جو افضل ان سے مانگتا تھا۔ افضل نے رات کو بھی انہیں بٹھائے رکھا۔

رات کو ایک خوبصورت عورت تھانے میں آئی۔ اسے افضل نے اپنے دفتر میں بٹھا لیا۔ وہ ایک مُشتبہ کی بیوی تھی۔ عورت غریب تھی لیکن چہرے کے رنگ اور نقش و نگار سے اور جسم کی بناوٹ اور لچک سے امیر گھرانے کی معلوم ہوتی تھی۔ یٰسین کی موجودگی میں اس عورت نے رو رو کر افضل کو بتایا اس کا خاوند ایسا نہیں کہ کسی کے گھر نقب لگائے۔ وہ بہت شریف آدمی ہے۔ اس عورت نے بتایا کہ جس آدمی کے گھر نقب لگی ہے وہ ان کا رشتہ دار ہے اور امیر آدمی ہے۔ اس کی عادتیں بہت بُری ہیں۔ سکھوں کے ساتھ بیٹھ کر شراب بھی پیتا ہے۔ اپنی رشتہ داری میں سب پر اس طرح رعب گانٹھتا ہے جیسے سب اس کے غلام ہوں۔ اس وجہ سے رشتہ داری میں کوئی بھی اس سے منہ نہیں لگاتا۔ دو مرتبہ ایسے ہُوا کہ اس نے اپنے کسی رشتہ دار پر نہ صرف رعب جھاڑا بلکہ اُس کے منہ پر تھپڑ مارے۔ تمام رشتہ دار اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور اس کی بے عزتی کی۔ وہ کہتا ہے کہ رشتہ دار اس سے جلتے ہیں۔ اب کہتا ہے کہ وہ سب کو اندر کرا دے گا۔ نقب سب نے مل جل کر لگوائی ہے۔

یٰسین نے مجھے بتایا کہ افضل کے چہرے کا رنگ بدل گیا، اور اس نے اس عورت سے کہا کہ تمہارے خاوند پر تو پکا شک ہے۔ اسے اتنی جلدی نہیں چھوڑا جا سکتا۔ یہ سن کر عورت یوں رونے اور منّتیں کرنے لگی جیسے اس کے خاوند کی زندگی افضل کے ہاتھ میں ہو۔

"تم خود جانتی ہو کہ کسی کے بھی گھر کے حالات پولیس سے پوشیدہ نہیں

ہوتے" ــــ یٰسین نے مجھے کہا ــــ "ہر جگہ ہمارے مخبر موجود ہوتے ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ افضل جانتا ہے کہ نقب زنی دشمنی کی وجہ سے نہیں ہوئی اور جس کے گھر نقب لگی ہے اس کے رشتہ داروں کا اس میں ہاتھ نہیں۔ مجھے اچھی طرح پتہ ہے کہ یہ آدمی جو اپنے رشتہ داروں کو ذلیل کرا رہا ہے اچھا آدمی نہیں۔ مجھے یہ بھی شک ہے کہ اس نے اپنے رشتہ داروں کو ذلیل کرانے کی افضل کو رشوت دی ہے۔ یہ کام کر کے افضل اصل مجرموں کا سراغ لگائے گا۔ اب وہ ان مشتبہوں سے رشوت مانگ رہا ہے"۔

دو روز بعد افضل رات کو ذرا دیر سے گھر آیا۔ اس نے مجھے کہا کہ ایک کیس کے سلسلے میں دو تین آدمی گھر آرہے ہیں۔ تم اس کمرے میں نہ آنا۔

اس کے پاس آدمی تو آتے ہی رہتے تھے۔ کیس کے سلسلے میں نہ آئیں تو شہر کے معزّز خوشامدی اور بڑی اچھی حیثیت کے مخبر ضرور آتے تھے۔ افضل کی نوکری ہی ایسی تھی لیکن اس نے مجھے کبھی نہیں کہا تھا کہ کوئی آدمی آرہے ہیں، تم اِدھر نہ آنا۔ میں باہر کے آدمیوں میں کبھی بھی نہیں بیٹھی تھی۔ صرف یٰسین تھا جس کے سامنے خود افضل نے مجھے بٹھایا تھا۔ مجھے شک ہُوا کہ کوئی خاص آدمی آرہا ہے۔ میں نے ارادہ کر لیا کہ میں اسے ضرور دیکھوں گی۔

افضل نے کھانا جلدی کھا لیا۔ رات اندھیری ہو گئی۔ ہمارا مکان بہت بڑا تھا۔ سامنے کے علاوہ ایک دروازہ اس کے پیچھے بھی تھا۔ اس دروازے پر آہستہ سے دستک ہوئی۔ افضل اسی کمرے میں تھا جس میں وہ ملاقاتیوں کو بٹھایا کرتا تھا۔ جو کوئی آیا تھا اسے افضل کمرے میں لے آیا اور اس نے اندر کی چٹخنی چڑھا دی۔ میں ایک کمرے میں چلی گئی۔ اس میں بھی اس کمرے کا ایک دروازہ کھلتا تھا۔ اس کے کواڑوں میں دو تین درزیں ذرا کھل گئی تھیں۔ میں نے ایک درز کے ساتھ آنکھ لگائی تو افضل کے ملاقاتی کمرے کا سارا منظر نظر آگیا۔

ایک عورت تھی جو مجھے وہی لگی جس کے متعلق یٰسین نے مجھے بتایا تھا کہ اس کے خاوند کو افضل نے مُشتبہ بٹھا رکھا ہے۔ وہ کمرے میں کھڑی تھی اور شرما نہیں رہی تھی بلکہ رو رہی تھی۔ اس نے روتے ہوئے افضل سے کہا کہ وہ پردہ دار

ہے اور اس کا خاوند شریف آدمی ہے۔ خدا معلوم نہیں انہیں کون سے گناہ کی سزا دے رہا ہے کہ خاوند نقب زنی کے شک میں پکڑا ہوا ہے اور میری عزّت آبرو بھی اپنی نہیں رہی۔

"تمہارے خاوند کو چھوڑنے کے لئے مجھے اپنی نوکری اور تھانیداری خطرے میں ڈالنی پڑے گی۔ یہ میں تمہاری جوانی پر رحم کر رہا ہوں" ــــ افضل نے کہا ــــ "اس کے خلاف شہادت مل گئی ہے۔ اگر تم اس کے لئے معمولی سی قربانی نہیں دے سکتیں تو جاؤ۔ وہ دس گیارہ برسوں کے لئے جیل چلا جائے گا"۔

عورت روتی رہی۔ افضل اُس کے پیچھے پڑا رہا۔ عورت برقعے میں تھی۔ افضل نے اسے اتنا ڈرایا کہ اس کا سر جھک گیا۔ اس نے سر اُٹھا کر افضل سے پوچھا۔

"کل صبح آپ میرے خاوند کو نہیں چھوڑ سکتے؟"

"نہیں" ــــ افضل نے کہا ــــ "پندرہ بیس دن لگیں گے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہارے خاوند کے خلاف مقدمہ نہیں بنے گا۔ اسے میں تھانے سے ہی گھر بھیج دوں گا لیکن شرط یہ ہے کہ تم میرا کہا مانو"۔

پردہ دار عورت نے اپنے غریب خاوند کو اس جال سے نکالنے کے لئے روتے ہوئے سر قدموں میں رکھا۔ میں نے درز سے آنکھ ہٹا لی۔ کچھ وقت بعد میری آنکھ پھر درز سے جا لگی۔ عورت سِسک رہی تھی۔ وہ پلنگ سے اٹھی تو پتہ چلتا تھا کہ غش کھا کر گر پڑے گی۔

مجھے ایسا کوئی افسوس نہ ہُوا کہ میں نے اپنے خاوند کو ایک غیر عورت کے ساتھ دیکھا ہے۔ افضل سے میں دل کا رشتہ کبھی کا توڑ چکی تھی۔ میرا دماغ اب کچھ اور سوچ رہا تھا۔ میں بڑی سنجیدگی سے اس سوچ میں کھوئی۔ اگر میں کردار کی کچی ہوتی تو یٰسین میرے ہاتھ میں تھا۔ میں اس کے ساتھ گندا تعلق پیدا کر کے افضل سے انتقام لیتی لیکن اِدھر میرا دھیان ہی نہیں گیا۔ گناہ کر کے گناہگار سے انتقام لینا کوئی کمال تو نہیں۔

میں نے چونکہ گناہ کی نہیں سوچی تھی اس لئے خدا نے میری مدد کی۔ ایک ہی دن گزرا تھا کہ افضل کو ڈی۔ ایس۔ پی کا بلاوا آگیا۔ وہ فوراً روانہ ہو گیا۔ میں نے یٹیین کو گھر بلوالیا۔ میں یہی دعا کر رہی تھی کہ افضل ذرا جلدی کہیں باہر چلا جائے۔ یٹیین آیا تو میں نے اسے رات کا واقعہ سنایا اور اسے کہا کہ میں افضل کو عین موقع پر پکڑوانے کا پکا ارادہ کر چکی ہوں۔ ڈی۔ ایس۔ پی انگریز تھا۔ اُس تک خبر پہنچ جاتی تو وہ افضل کو پکڑنے کا انتظام کر دیتا۔ یہ خبر یٹیین پہنچا سکتا تھا لیکن وہ ڈر گیا۔

میں نے اس کا حوصلہ بڑھایا لیکن وہ ڈرتا ہی رہا۔

"میری بات غور سے سنو یٹیین!" ــــ میں نے اسے کہا ــــ "میں جانتی ہوں کہ تمہارے دل میں میری محبت ہے۔ تم افضل کے ڈر سے چھپا رہے ہو کہ تم مجھے چاہتے ہو۔ میں تمہیں چاہتی ہوں۔ یہ میرا وعدہ ہے کہ افضل کو پکڑوا دو۔ میں اس سے طلاق لے لوں گی۔ میں اپنے گھر نہیں جاؤں گی۔ تمہارے گھر جاؤں گی اور میرے ساتھ نکاح پڑھا لینا"۔

وہ بڑی مشکل سے راضی ہُوا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے اسے بازوؤں میں لے کر گلے لگا لیا۔ اس سے اس کا حوصلہ بڑھ گیا اور اس کا دماغ میری سکیم پر چل پڑا۔ اس نے کہا کہ ڈی۔ ایس۔ پی تیس میل دور رہتا ہے۔ اسے ہم کس طرح اتنی جلدی اطلاع دے سکتے ہیں کہ اس وقت وہ عورت افضل کے کمرے میں ہے۔

میرے دماغ میں ایک ترکیب آگئی۔ میں نے یٹیین سے کہا کہ اس عورت کو کسی طرح بلوا کر مجھ تک پہنچا دو لیکن بہت جلدی۔ شام تک افضل آجائے گا۔ یٹیین نے کہا کہ یہ کوئی مشکل کام نہیں۔

ڈیڑھ گھنٹے بعد وہ عورت میرے گھر میں آگئی۔ وہ مجھ سے ڈر رہی تھی کیونکہ میں تھانیدارنی تھی۔ میں نے اسے بڑے پیار اور عزت سے بٹھایا اور اسے کہا کہ افضل جو سلوک اس کے ساتھ کر رہا ہے وہ میں جانتی ہوں اور میں یہ بھی جانتی ہوں کہ تم نیک اور پردہ دار عورت ہو۔ میں تمہیں اس جال سے نکالنا چاہتی ہوں۔

اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ میں اس کی نجات کے لئے کچھ کر رہی ہوں۔ وہ میری ہمدردی کو دھوکہ سمجھ رہی تھی۔ اس کے ساتھ مجھے بہت ہی سر کھپانا پڑا۔ میں نے اسے یہ بھی بتایا کہ اس واردات کے ساتھ اس کے خاوند کا تعلق نہیں۔ بہت دیر بعد اسے مجھ پر اعتبار آیا۔ میں نے اسے دو روز بعد کی رات بتا کر کہا کہ وہ گزشتہ رات جس وقت آئی تھی اسی وقت افضل کے اُسی کمرے میں آجائے۔ دن کو وہ تھانے میں آکر افضل کو بتائے کہ وہ رات کو آئے گی۔

وہ مان گئی اور چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد یٹیین آیا۔ میں نے اسے بتایا کہ اس عورت کو میں نے فلاں رات افضل کے پاس آنے کے لئے تیار کر لیا ہے۔ یٹیین نے کہا کہ ڈی۔ ایس۔ پی کو وقت پر یہاں لانا اس کا کام ہے۔ یٹیین نے مجھے بتا دیا تھا کہ وہ خود ڈی۔ ایس۔ پی تک نہیں جائے گا۔ شہر سے ایک آدمی کو بھیجے گا۔

مجھے احساس تھا کہ میری سکیم ناکام ہو گئی تو افضل مجھے طلاق دے دے گا اور یٹیین کو پریشان کرے گا۔ اس خطرے کے باوجود میں نے سکیم پر عمل شروع کر دیا تھا۔ مجھے ایک اور خطرہ نظر آرہا تھا۔ وہ یہ کہ یٹیین مجھے دھوکہ دے گا اور افضل کو ساری بات بتا دے گا۔

وہ رات آگئی۔ عورت آگئی۔ میں نے درز میں سے وہی منظر دیکھا جو دو تین رات پہلے دیکھا تھا۔ میں نے باہر کا دروازہ کھول دیا تھا۔ یٹیین کا پیغام مجھے دن کو مل گیا تھا کہ اس نے ڈی۔ ایس۔ پی کو اطلاع دے دی ہے۔ دیکھئے انگریزوں میں کیا کیا خوبیاں تھیں۔ مجھے اپنے صحن میں قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ میں باہر نکلی۔ یٹیین کے ساتھ ڈی۔ ایس۔ پی کی بجائے ایک انگریز انسپکٹر اور دو کانسٹیبل تھے۔ میں نے یٹیین کو اشارہ کیا کہ کام تیار ہے۔

انگریز انسپکٹر نے افضل کے ملاقاتی کمرے پر دستک دی۔ اندر سے افضل کی غصیلی اور بڑی اونچی آواز آئی ــــ "کیا کہتی ہو؟ ٹھہرو ذرا۔ میں آتا ہوں"۔

انگریز انسپکٹر نے اردو زبان میں کہا ــــ "دروازہ فوراً کھولو اور جس حالت میں ہو باہر آجاؤ" ــــ وہ دروازے پر ہاتھ مارتا رہا۔

دروازہ ایک دو منٹ بعد کھلا۔ عورت دوسرے دروازے سے نکل رہی

تھی۔ انگریز افسر نے اسے دوڑ کر پکڑ لیا۔ وہ اونچی آواز میں رونے لگی۔ انسپکٹر اسے اور افضل کو اپنے ساتھ لے گیا۔ آدھی رات کے وقت ٹیسین آیا۔ اس نے بتایا کہ افضل اور عورت کو انسپکٹر ڈاکٹر کے پاس لے گیا تھا۔ ڈاکٹر نے دونوں کا معائنہ کر کے تصدیق کر دی کہ انہوں نے ناجائز فعل کیا ہے۔ انسپکٹر نے عورت کا بیان لیا تو اس نے انسپکٹر کو بتا دیا کہ افضل نے اسے کس طرح دھمکیاں اور خاوند کی رہائی کا لالچ دے کر اپنے گھر بلایا تھا۔

انسپکٹر نے نقب زنی کے مُشتبہوں کے بیان لئے۔ انہوں نے بتایا کہ افضل ان سے رشوت مانگتا تھا۔ ٹیسین نے انسپکٹر کو بتایا کہ وہ اس واردات کی تفتیش کر سکتا ہے لیکن دوسرے دن تھانے میں ایک ہندو انسپکٹر آگیا۔ انگریز انسپکٹر نے رات تھانے میں بیان لیتے گزار دی۔ ٹیسین نے اسے بتا دیا تھا کہ افضل کو میں نے پکڑوایا ہے۔ دوسرے دن انسپکٹر میرے گھر آیا اور اس نے مجھ سے پوچھا کہ اپنے خاوند کے ساتھ مجھے کیا دشمنی تھی۔ میں نے اس سے کچھ بھی نہ چھپایا۔ افضل کے ساتھ میرا ایک ایک منٹ جس طرح گزرا تھا اسی طرح سنایا۔ انسپکٹر نے بڑی دلچسپی اور توجہ سے میری اتنی لمبی کہانی سنی۔ میں نے جب ٹیسین کا ذکر کیا تو وہ مسکرانے لگا۔ میں سمجھ گئی کہ وہ کیوں مسکرایا ہے۔ اسے میرے اور ٹیسین کے تعلقات پر شک ہُوا تھا۔ میں نے اس کا یہ شک رفع کر دیا۔

افضل کو انگریز انسپکٹر اپنے ساتھ لے گیا اور اس کے بعد تفتیش کا اور بیان لینے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ میں اُسی مکان میں رہی۔ ٹیسین میرے پاس آتا رہا۔ چونکہ یہ کیس انگریز ڈی۔ ایس۔ پی کے حکم سے ایک انگریز انسپکٹر نے پکڑا تھا اس لئے شہادتیں بڑی مضبوط اور بڑی جلدی فراہم ہو گئیں۔ مقدمہ سی۔ آئی۔ اے نے تیار کیا۔ مجھے ڈر تھا کہ افضل کو یہ تو پتہ چل ہی جائے گا کہ اسے میں نے پکڑوایا ہے اس لئے وہ یہ انتقامی کارروائی کرے گا کہ مجھے طلاق نہیں دے گا۔ میں نے ٹیسین کے ساتھ بات کی تو اس نے کہا کہ وہ انگریز انسپکٹر کے ساتھ بات کرے گا۔

دو تین روز بعد انگریز انسپکٹر خود ہی آگیا۔ وہ میرے گھر آیا۔ اس کے ساتھ

ٹیسین تھا۔ اس نے اس عورت کو جس کے ساتھ افضل پکڑا گیا تھا اور اس کے خاوند کو میرے گھر بلا لیا۔ مقدمے میں کچھ کسر رہ گئی تھی۔ اس کے لئے وہ ہم سے کچھ اور پوچھنے اور ہمیں کچھ بتانے آیا تھا۔

اس نے اپنا یہ کام مکمل کر لیا تو میں نے اس کے سامنے اپنا مسئلہ رکھ دیا۔ اسے کہا کہ مجھے افضل سے نفرت تھی۔ اب وہ نہ جانے کتنے برسوں کے لئے جیل جا رہا ہے اس لئے میں چاہتی ہوں کہ اس سے مجھے طلاق مل جائے جو یہ مجھے نہیں دے گا۔ ٹیسین نے اسے بتایا کہ ہمارے ملک میں عورت طلاق نہیں لے سکتی۔ ایک بدکردار خاوند بیوی کو پریشان کرنا چاہے تو اسے اس کے ماں باپ کے گھر بھیج دیتا ہے اور اسے مزید سزا یہ دیتا ہے کہ طلاق نہیں دیتا۔ بیوی عدالت میں طلاق کے لئے جا سکتی ہے لیکن دیوانی مقدموں کے کئی کئی سال فیصلے نہیں ہوتے۔

انگریز انسپکٹر کو میں نے بڑا موٹا شکار پھانس دیا تھا۔ وہ مجھ پر خوش تھا۔ اس نے کہا کہ اسے کسی سے طلاق لکھوانے کے اختیارات حاصل نہیں لیکن وہ کسی نہ کسی طریقے سے افضل سے طلاق لکھوا لے گا..... ایک ہفتے بعد وہ افضل سے طلاق لکھوا لایا۔ اس نے مجھے نہ بتایا کہ افضل سے وہ طلاق نامہ کس طرح لکھوا لایا ہے۔ بعد میں مقدمے کی سماعت کے دوران اس نے ٹیسین کو بتایا تھا کہ اس نے افضل کے ساتھ جھوٹا وعدہ کیا تھا کہ اس کا مقدمہ کمزور رکھا جائے گا اور وہ کوئی بڑا تجربہ کار وکیل کرے جو مقدمے کی کمزوری سے فائدہ اٹھا سکے۔

اس نے کوئی سا بھی طریقہ اختیار کیا ہو' مجھے طلاق مل گئی لیکن مجھ پر ایک اور حملہ ہو گیا۔ افضل کے لواحقین کو اطلاع مل گئی کہ وہ گرفتار ہو گیا ہے۔ اس کی ماں' اس کا باپ اور بھائی میرے پاس آگئے۔ اس وقت افضل جیل کی حوالات میں تھا۔ اس کے لواحقین اسے ملنے گئے۔ واپس آئے تو وہ اس قدر غصے میں تھے جیسے مجھے قتل کر دیں گے۔ افضل نے انہیں بتایا تھا کہ اسے میں نے پکڑوایا ہے۔

میں نے جھوٹ بولنے کی بجائے انہیں بتایا کہ افضل باہر کیا کرتا رہا ہے اور اس نے وہی بدکاری گھر میں شروع کر دی تھی۔ میں نے انہیں افضل کی ساری باتیں سنائیں مگر وہ ٹھنڈے نہ ہوئے۔ میں نے آخر تنگ آ کر انہیں کہا کہ وہ میرے

گھر سے نکل جائیں۔ میں اب ان کی کچھ نہیں لگتی۔ افضل نے مجھے طلاق دے دی ہے۔ انہوں نے مجھے انتقام کی دھمکیاں دیں جن کی میں نے پرواہ نہ کی۔ وہ سب سخت غصے میں چلے گئے۔

مقدمہ چلا۔ میں نے عدالت میں افضل کے خلاف سارا غبار نکالا جو میرے سینے میں رُکا ہُوا تھا۔ اس کے وکیل نے مجھ پر دو دن جرح کی۔ مجھے ایک بار غشی بھی آئی لیکن میری زبان سے کوئی ایسی بات نہ نکلی جو افضل کو شک کا فائدہ دے سکتی۔ دوسرے گواہ بھی آئے۔ پچیس روز مقدمہ چلا۔ افضل کو تین دفعات میں مجموعی طور پر نو سال سزائے قید ملی۔

میں اس دوران اسی مکان میں رہی۔ میری ماں آئی۔ چھوٹا بھائی بھی آیا۔ میں نے انہیں زیادہ دن رکنے نہ دیا۔ جب افضل کو سزا سنائی گئی تو مجھے افضل کے باپ کی طرف سے دھمکی کا پیغام ملا کہ وہ مجھے قتل کرا دے گا۔

اب مسئلہ یہ رہ گیا تھا کہ یٰسین کے ساتھ شادی کس طرح ہو۔ کیا یٰسین میرے گاؤں آئے یا یہیں خاموشی سے نکاح پڑھا لیا جائے لیکن یٰسین کا ایک چچا اسے اپنی بیٹی دینا چاہتا تھا اور یٰسین کے والدین بات پکی کر چکے تھے۔ میں اس مکان میں اکیلی رہتی تھی۔ یٰسین اس لئے میرے ساتھ نہیں رہتا تھا کہ لوگ بدنام کریں گے۔ اس کا حل یہی تھا کہ میں اپنی ماں کے پاس چلی جاؤں۔

میں نے اپنا سامان باندھا اور اپنی ماں کے پاس چلی گئی۔ میں آپ کو بتا چکی ہوں کہ دیہات میں ہماری حیثیت معمولی نہیں تھی۔ میں نے ماں کو بتا دیا کہ یٰسین کے ساتھ شادی کر رہی ہوں۔ اس نے کوئی اعتراض نہ کیا۔

سات آٹھ روز گزرے ہوں گے کہ یٰسین ہمارے گھر آیا۔ اس نے بتایا کہ اس کا چچا اسے دھمکیاں دے رہا ہے کہ اس نے اس کی بیٹی کے ساتھ شادی نہ کی تو اسے چچا اپنی بے عزتی سمجھے گا اور اپنی بے عزتی کا انتقام لے گا۔ دیہات کے لوگوں کی سوچیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ اس کے باوجود یٰسین نے چچا کی بیٹی کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

اس کے بعد یٰسین تین بار ہمارے گھر آیا۔ اس نے میرے ساتھ شادی کرنے

کے لئے حالات موافق کر لئے تھے۔ وہ چوتھی بار ہمارے گھر اس حالت میں آیا کہ اُسے دو سکھوں نے اٹھا رکھا تھا۔ ایک گولی اُس کے بائیں گھٹنے میں سے اور ایک اسی ٹانگ کی پنڈلی میں سے گزر گئی تھی۔ اس پر کسی نے دن دہاڑے گولی چلائی تھی۔ وہ وہیں گر پڑا تھا۔ وہ کھڈ نالوں کی جگہ تھی۔ اتفاق سے دو سکھ اُدھر سے گزرے۔ انہوں نے دیکھا کہ یٰسین بائیں ٹانگ گھسیٹ رہا تھا۔ سکھ اسے اس حالت میں دیکھ کر رک گئے۔ اُس نے ان سکھوں کو میرا گاؤں بتا کر کہا کہ وہ اسے میرے گھر پہنچا دیں۔ سکھ اسے اٹھا لائے۔ ظاہر ہے اس پر قاتلانہ حملہ ہُوا تھا۔

یٰسین کو ہسپتال پہنچایا اور تھانے رپورٹ درج کرائی۔ میں نے شک میں افضل کے باپ اور بھائیوں کے بیان لکھوا دیئے۔ تفتیش شروع ہو گئی۔ تھانیدار ہندو تھا۔ یہ تفتیش ایک اور کہانی ہے لیکن میں آپ کو صرف اپنی کہانی سناؤں گی۔ ہندو سب انسپکٹر نے تیسرے دن سراغ لگا لیا اور افضل کے دو بھائیوں کو گرفتار کر لیا۔ یہ سراغ ہمارے گاؤں کے ایک آدمی سے ملا تھا کہ یٰسین میرے گھر کبھی کبھی آتا ہے۔ یٰسین بس سے اتر کر میرے گاؤں کو پیدل آ رہا تھا۔ اسے دو میل پیدل چلنا تھا۔ افضل کا گاؤں قریب ہی تھا۔ ان کے میرے گاؤں والے رشتہ دار نے یٰسین کو دیکھ لیا اور افضل کے بھائیوں کو اطلاع دے دی۔ وہ گھوڑیوں پر آئے۔ ان کے پاس ریوالور تھا۔ وہ گھات میں بیٹھ گئے اور جب یٰسین قریب آیا تو ایک بھائی نے یٰسین پر ریوالور کی دو گولیاں چلائیں۔ یٰسین گر پڑا۔ بھائی بھاگ گئے لیکن پکڑے گئے۔ انہوں نے افضل کا انتقام لیا تھا۔

یٰسین ہسپتال میں تھا۔ ساتویں آٹھویں روز ڈاکٹر نے اسے کہا کہ اس کی ٹانگ گھٹنے سے کاٹنی پڑے گی۔ اس نے ٹانگ کاٹ دی۔ یٰسین ہمیشہ کے لئے معذور ہو گیا۔ وہ نوکری کے قابل نہیں رہ گیا تھا۔ اب اُسے کس نے اپنی بیٹی دینی تھی۔ اُس کی کٹی ہوئی ٹانگ ٹھیک ہو گئی تو میں اسے اپنے گھر لے آئی۔ افضل کے جس بھائی نے ریوالور فائر کیا تھا اسے سات سال سزائے قید ہوئی اور دوسرے کو تین سال۔

میں نے یٰسین کے ساتھ شادی کر لی اور اسے اپنے پاس ہی رکھ لیا۔ زمین بہت تھی۔ یٰسین کو کہیں نوکری کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔

اب افضل بھی اس دنیا میں نہیں ٹینین بھی نہیں۔ ٹینین اڑھائی برس گزرے 63 برس کی عمر میں فوت ہوگیا ہے۔ میں اس کی یادوں کے سہارے زندگی کے باقی دن پورے کر رہی ہوں۔

وہ خلاء میں زندہ رہا

دیہات میں تعلیم تو پہنچ گئی ہے لیکن تربیت نہیں پہنچی۔ تعلیم کے جانے سے دیہاتی معاشرے کی جن خرابیوں کو ختم ہو جانا چاہیے تھا وہ بدستور موجود ہیں۔ اس کے جو نتائج سامنے آتے ہیں ان کی ایک زندہ مثال پیش کرتا ہوں۔ میں ڈاکٹر ہوں لیکن ڈگری کی لحاظ سے ڈاکٹر رہ گیا ہوں۔ عملی طور پر نہیں کیونکہ پریکٹس چھوڑ دی ہے۔ پریکٹس چھوڑنے کی ایک وجہ تو عمر ہے۔ اس عمر میں اب اتنی محنت نہیں ہوتی۔ ایک بیٹی اور ایک بیٹے کو ڈاکٹر بنا کر کلینک ان کے حوالے کر دیا ہے۔ پریکٹس چھوڑنے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ اب علاج کے انداز بدل گئے ہیں۔ اب ڈاکٹر مرض کو نہیں' مریض کو دیکھتے ہیں کہ اس سے کتنے پیسے بٹورے جا سکتے ہیں۔

یہ تو ضمنی بات تھی جو میں نے لکھ دی ہے۔ میں ایک مریض کی بات سنانے لگا ہوں۔ ایک مدت بعد وہ میرے پاس آیا۔ میرے بیٹے اور بیٹی نے اسے دیکھنا چاہا تو اس نے مجھ سے ملنے کا اتنا اصرار کیا کہ کلینک سے اسے میرے گھر بھیج دیا گیا۔ میں اسے بھول چکا تھا' لیکن اس نے مجھے یاد رکھا تھا۔ اس نے جب ایک لمبا عرصہ پہلے کی باتیں سنائیں تو مجھے اس کا سارا کیس یاد آ گیا۔

مجھے اس کا نام بھی یاد آ گیا۔ وہ پہلے پہل میرے پاس آیا تھا تو جوان تھا اور اب وہ ریٹائر ہو چکا تھا۔ ریٹائر ہوئے کچھ سال گزر گئے تھے۔ وہ وقت سے پہلے ریٹائر ہوا اور بوڑھا بھی وقت سے پہلے ہی ہو گیا۔ عمر کے لحاظ سے اس کی جسمانی حالت یہ نہیں ہونی چاہیے تھی کہ اس کے سر کے آدھے بال رہ گئے تھے اور ایک بھی بال کالا نہیں تھا۔ اس کے ہاتھوں میں رعشہ تھا۔ چائے کی خالی پیالی بھی ہاتھ میں نہیں پکڑ سکتا تھا۔ یہ اعصابی کمزوری کی علامتیں ہیں۔ اسے کچھ اور امراض بھی لاحق ہو گئے تھے جن میں شوگر' بلڈ پریشر کی بے قاعدگی اور بے خوابی وغیرہ شامل تھے۔

مجھے توقع تھی کہ اس عمر میں آکر وہ کچھ سمجھ گیا ہوگا' لیکن وہ وہیں کا وہیں تھا جہاں میں نے اس کو جوانی میں چھوڑا تھا۔ وہ میرے پاس علاج کے لئے آیا تھا' لیکن اس نے جب اپنے امراض بیان کرنے شروع کئے تو ایسے لگتا تھا جیسے مریض وہ نہیں بلکہ میں ہوں اور وہ ڈاکٹر نہیں بلکہ تجربہ کار سپیشلسٹ ہے۔ اس کا یہی انداز اس کے تمام امراض کی جڑ تھا۔ یہ علمی انداز تھا جس کی تشریح مختصر الفاظ میں اس طرح ہو سکتی ہے کہ کسی چیز کو اس کے حقیقی رنگ میں نہیں بلکہ علمی یا کتابی رنگ میں دیکھا جاتا ہے۔ اس قسم کے لوگ فوراً" بحث میں اُلجھ جاتے ہیں اور صحیح بات کو کبھی تسلیم نہیں کرتے۔

میں نے یہ کیس دیہات میں تعلیم کے جانے سے شروع کیا ہے۔ یہ شخص جس کے اصلی نام کو پوشیدہ رکھنے کے لئے میں رشید لکھوں گا۔ دیہات کا رہنے والا تھا جہاں برادری سسٹم زور و شور سے جاری و ساری تھا۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ اس سسٹم میں کیا ہوتا ہے۔ گاؤں کے رسم و رواج بھی ویسے ہی تھے۔ لوگوں کا رہن سہن بھی ویسا ہی تھا۔ وہاں غلط فہمیاں دور کرنے کا رواج نہیں۔ کسی کی زیادتی کو معاف کرنا' بزدلی اور بے غیرتی سمجھا جاتا ہے۔ وہاں صرف وہ آدمی کامیاب زندگی بسر کر سکتا ہے جس کے دل میں کچھ اور اور زبان پر کچھ اور ہو۔ ایسے آدمی کو دنیادار کہا جاتا ہے۔

اُس گاؤں میں جہاں کبھی پرائمری سکول بھی نہیں ہُوا کرتا تھا' ہائی سکول بن گیا۔ پھر اس گاؤں سے ڈیڑھ دو میل دور کالج بن گیا۔ رشید نے میٹرک پاس کر لیا تو وہ کالج میں داخل ہونا چاہتا تھا' لیکن باپ نے اجازت نہ دی۔ رشید کو پڑھنے کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ شوق بھی ایسا کہ وہ کتابوں میں گم رہتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ جب وہ پہلے میرے پاس آیا تھا تو میں سمجھ گیا تھا کہ یہ کتابوں کی طرح باتیں کرنے کا عادی ہو گیا ہے۔ اس کی اس عادت میں فرار کا رجحان بھی تھا جو میرے لئے قابلِ فہم تھا۔ چاہئے تو یہ تھا کہ رشید دیہاتی معاشرے کو قبول کرتا' لیکن اس نے دیکھا کہ یہ معاشرہ یعنی لوگوں کا رہن سہن اور انداز و اطوار کتابوں کے مطابق نہیں تو اس نے

اس معاشرے کے خلاف اپنے دل میں حقارت پیدا کر لی۔ یہ تو میں بھی کہتا ہوں اور آپ بھی یہی کہتے ہوں گے کہ دیہاتی معاشرے کو سُدھرنا چاہئے۔ اُس سے بھاگنا تو کوئی علاج نہیں۔ اسے میں فرار ہی کہوں گا۔ ڈاکٹر معاشرے کے ہر فرد کو اتنی غور سے دیکھتا ہے کہ جسم کے ساتھ ساتھ اس کی ذہنیت اور اس کے ضمیر کو بھی دیکھ لیتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیں کہ ڈاکٹر معاشرے کا رازدان ہوتا ہے۔ اپنے اس مریض کے ذہن کو بھی میں سمجھ گیا تھا' لیکن اُس وقت تک معاملہ خاصا بگڑ چکا تھا۔

یہ بگاڑ اس طرح پیدا ہُوا کہ رشید نے دس جماعتیں پاس کر لیں تو باپ نے اُسے آگے پڑھنے سے روک دیا۔ اس کے ماں باپ تقریباً" ان پڑھ لوگ تھے۔ وہ غریب نہیں تھے' لیکن انہوں نے یہی بہتر سمجھا کہ بیٹا آگے نہ پڑھے۔ وہ یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ بیٹا دس جماعتیں پاس کر کے شہر میں چلا جائے اور نوکری کر لے۔ باپ کا ارادہ یہ تھا کہ زمین کے کچھ حصّے میں پھلوں کے درخت لگائے جائیں اور یہ بیٹا اس باغ کی دیکھ بھال کرے۔ اس کے دو بھائی تھوڑا تھوڑا پڑھ کر کھیتی باڑی میں لگ گئے تھے۔ رشید نے اس سکیم کو قبول نہ کیا۔

رشید نے ایک اور شغل اختیار کر لیا۔ یہ تھا رسالے اور ناول پڑھتے رہنا۔ میں سمجھ سکتا تھا کہ وہ افسانوں اور ناولوں کا شیدائی کیوں بن گیا تھا۔ اسے ناولوں میں وہ ماحول ملتا تھا جس میں وہ زندگی گزارنے کا تمنائی تھا۔ وہ سمجھ ہی نہیں سکتا تھا کہ افسانوی ماحول کا حقیقی زندگی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوتا لیکن رشید الفاظ کی دنیا کو حقیقی سمجھتا تھا اور اسی خیالی دنیا میں آباد ہونے کے لئے تڑپتا تھا۔ اس نے زندگی کا ایک ایسا آئیڈیل بنا کر ذہن میں رکھ لیا تھا جو کبھی بھی حقیقت کا رنگ اختیار نہیں کر سکتا۔ اگر کر بھی لے تو اس کے لئے دن رات محنت کرنی پڑتی ہے۔ آئیڈیلسٹ یعنی تصوّر پرست ہونے کا مطلب ہی یہ ہوتا ہے کہ یہ شخص جدّوجُہد سے مفرور ہے۔

آئیڈیل ازم میں اور حقیقی دنیا سے تعلق توڑ لینے میں رشید نے ایک مصنوعی سی برتری یا برتری کے احساس کے سوا کچھ حاصل نہ کیا سوائے حقارت کے۔ وہ

اپنے گھر کے افراد کو ہی نہیں بلکہ گاؤں کے ہر فرد کو پسماندہ اور حقیر سمجھنے لگا۔ اس نے یہ احمقانہ حرکت کی گاؤں کے لوگوں کو لیکچر دینے شروع کر دیئے۔ کل کا بچّہ بزرگوں کو اس قسم کے الفاظ کہنے لگا کہ تم لوگ پسماندگی سے نکلتے کیوں نہیں۔ گاؤں کے تمام آدمیوں کو ہر روز اکٹھا کیا کرو اور میں انہیں بتایا کروں گا کہ زندگی کس طرح بسر کی جاتی ہے۔

ایک بار مسجد میں اس نے تہذیبِ جدید کا بوگس سا لیکچر شروع کر دیا اور ایسی باتیں کیں جو مذہب کے خلاف جاتی تھیں۔ اس کے نتیجے میں اسے لوگوں نے مسجد سے دھکے دے کر باہر نکال دیا۔ اس کے باپ نے اور دو چچوں نے اپنے لڑکے کی بے عزتی کو اپنے خاندان کی بے عزّتی سمجھا اور گاؤں والوں سے تُو تکار تک نوبت پہنچی، لیکن گھر میں رشید کے باپ، ماں اور چچوں نے اس کی بہت بے عزّتی کی اور کہا کہ تم نے سارے خاندان کی بے عزتی کرا دی ہے۔

دیہات میں اگر لڑکا منہ زور یا بے لگام ہو جائے یا کسی اچھے یا بُرے طریقے سے زندگی کی عام پٹڑی سے اُتر جائے تو اس کا ایک علاج یہ کرتے ہیں کہ اس کی شادی کر دیتے ہیں۔ یہی نسخہ رشید کے لئے تجویز کیا گیا، لیکن اس نے صاف جواب دے دیا اور وجہ یہ بیان کی کہ وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرے گا اور کسی تعلیم یافتہ لڑکی کے ساتھ شادی کرے گا۔ اس کے لئے جس لڑکی کا رشتہ مانگا گیا تھا، اس لڑکی کے والدین نے اسے اپنی توہین سمجھا کہ لڑکے نے رشتہ قبول نہیں کیا۔ رشید کے اپنے ماں باپ الگ ناراض ہوئے۔

رشید نے اپنے لئے ایسے حالات پیدا کر لئے تھے جنہوں نے اس کے لئے گاؤں کی زندگی بہت ہی تلخ بنا دی تھی۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ دیہات کی زندگی ایسی بُری تو نہیں ہوتی کہ اسے حقارت سے دیکھا جائے اور اس سے فرار حاصل کیا جائے لیکن رشید نے اپنے آپ کو ذہنی مریض بنا لیا تھا۔ اس نے گاؤں سے بھاگ جانے کا ارادہ کر لیا اور چوری چوری پیسے اکٹھے کرنے شروع کر دیئے۔ ظاہر ہے کہ وہ گھر سے پیسے مارتا اور چراتا تھا۔ اس کے گھر میں پیسوں کی کمی نہیں تھی۔

ایک روز وہ گاؤں سے نکل گیا۔ اپنے گھر والوں پر اس نے یہ مہربانی کی تھی کہ

ایک رُقعہ لکھ کر چھوڑ آیا تھا جس میں اس نے کچھ اس قسم کے الفاظ لکھے تھے کہ میں جاہل اور گنوار لوگوں میں نہیں رہ سکتا اور میں اپنا مستقبل بنانے کے لئے جا رہا ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ میں کبھی واپس نہ آؤں۔ وہ دُور دراز کے شہر میں چلا گیا اور ایک انتہائی معمولی سے ہوٹل میں قیام کر لیا۔ یہاں میں اس کی تعریف کروں گا کہ اس نے یہ ضرور ذہن میں رکھا کہ کم سے کم پیسے خرچ کئے جائیں اور زیادہ سے زیادہ بھاگ دوڑ کی جائے۔ اس نے مجھ کو بتایا تھا کہ جس ہوٹل میں وہ ٹھہرا وہ دراصل غریبوں اور مزدوروں کا ہوٹل تھا جہاں سے دال اور روٹی اور پتلے شوربے والا گوشت ملتا تھا۔ تین چار الگ کمرے بھی تھے، لیکن رات کو باہر چارپائیاں بچھا دی جاتی تھیں۔

اُن دنوں بھاگ دوڑ کر کے سرکاری نہیں تو کسی چھوٹی موٹی فیکٹری میں نوکری مل جاتی تھی۔ نئی فیکٹریاں بن رہی تھیں۔ پرانی فیکٹریاں اور کمپنیاں ترقی کر رہی تھیں۔ اس طرح روزگار مل جاتا تھا۔ آج کی طرح بیروزگاری نہیں تھی۔ رشید کو کئی دفتروں کے دروازے پر دستک دینی پڑی۔ آخر درمیانے درجے کی ایک فیکٹری میں اسے سٹور کیپر کی نوکری مل گئی۔ وہ اس فیکٹری کے مینجر کے آگے بہت رویا تھا اور یہ جھوٹ بولا تھا کہ وہ یتیم اور بے گھر ہے اور اس کا دنیا میں کوئی بھی نہیں اور اس کی جو تھوڑی بہت زمین تھی اور جو مکان تھا اس پر بدمعاش قسم کے لوگوں نے قبضہ کر لیا ہے۔

مینجر نے اُس پر رحم نہیں کیا تھا بلکہ مینجر کی اپنی غرض تھی۔ اس نے رشید کو صرف نوکری ہی نہیں دی بلکہ اپنے گھر کا ایک کمرہ بھی دے دیا اور اس کو کہا کہ وہ اس سے کرایہ نہیں لے گا۔ کرائے کی جگہ رشید اس کے تین بچوں کو پڑھا دیا کرے۔ رشید کے لئے یہ سودا مہنگا نہیں تھا۔ اس نے قبول کر لیا۔ شہروں میں رہنا آسان نہیں ہوتا۔ آدھی تنخواہ کرائے اور بجلی پانی کے بلوں میں نکل جاتی ہے۔ رشید کے لئے یہ اچھی خاصی بچت تھی۔

رشید نے نوکری شروع کر دی اور مینجر کے گھر رہنے لگا۔ اس نے دنیا سے تعلق توڑ کر اپنا معمول یہ بنا لیا کہ دن کو نوکری کرتا اور شام کو بچوں کو پڑھاتا۔ اس

کے پاس پیسے ابھی کافی تھے۔ ان سے اس نے ایف اے کے کورس کی کتابیں خرید لیں۔ بچوں کو پڑھا کر کورس کی کتابیں پڑھتا۔ دن کو ایک آدھ کتاب ساتھ لے جاتا اور سٹور میں ذرا سی بھی فراغت ملتی تو وہ مطالعہ کرتا۔ بظاہر یہ معمول اور اس کی محنت قابلِ تعریف تھی، لیکن اس نے اپنے آپ پر یہ ظلم کیا کہ زندگی کی حقیقتوں سے رشتہ توڑ لیا اور یہ سمجھ بیٹھا کہ اصل زندگی اور صحیح دنیا کتابوں میں ہے۔

اس کی محنت ضائع نہ ہوئی۔ اس نے پرائیویٹ ایف اے کیا، پھر اسی طرح بی اے بھی کر لیا۔ مینجر کی نظرِ کرم سے اسے کمپنی میں ترقی مل گئی۔ رشید نے اسی طرح ایم اے بھی کر لیا اور اس نے مزید ہمت یہ کی کہ مقابلے کے ایک امتحان کی تیاری شروع کر دی اور اس میں بھی کامیاب ہو گیا۔ اس امتحان کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ رشید کو بڑے اچھے عہدے پر سرکاری ملازمت مل گئی۔

رشید کی ان کامیابیوں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ کتنا قابل اور باصلاحیت انسان تھا۔ اس کا دماغ اتنا تیز تھا کہ کسی بھی کتاب کے جو الفاظ ایک بار اس کی آنکھوں کے سامنے سے گزر جاتے تھے وہ اس کے ذہن پر نقش ہو جاتے تھے لیکن اس میں خامی یہ رہ گئی تھی کہ وہ الفاظ کی دنیا میں آباد ہو گیا تھا اور جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے کہ اس نے زندگی کی حقیقتوں سے تعلق توڑ لیا تھا۔ وہ بحث مباحثے میں زیادہ الجھتا تھا۔ اسے اگر بحث کے دوران یہ کہا جاتا کہ حقیقت کو دیکھو اور عملی پہلو کو سامنے رکھو تو اس کا جواب یہ ہوتا تھا کہ تم لوگوں نے کم علمی کی وجہ سے غلط حقیقتیں پیدا کر رکھی ہیں، اصل حقیقت کتابوں میں پڑھو اور علم حاصل کرو۔

رشید میں دوسری خامی یہ پیدا ہو گئی تھی کہ وہ دیہات کی زندگی خصوصاً اپنے گاؤں اور اپنی برادی سے متنفّر ہو گیا تھا۔ میرے ساتھ باتیں کرتے ہوئے اس نے کئی بار کہا کہ اپنے گاؤں اور اپنی برادری کی پسماندگی اور گنوار پن یاد آتا ہے تو مجھ پر وحشت طاری ہو جاتی ہے۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ میں یہ بھی ظاہر نہیں کرنا چاہتا کہ میں ان پسماندہ لوگوں میں سے ہوں۔

میرا خیال ہے کہ اس کے گھر کے افراد نے اسے ذہن سے اتار دیا تھا کیونکہ یہ ان کے کام کا آدمی نہیں تھا اور گاؤں میں رہ کر ان کی بے عزتی کا باعث بنتا تھا۔ اگر

انہیں یہ بیٹا اتنا ہی عزیز ہوتا تو اسے تلاش کرتے۔ پاکستان اتنا بڑا ملک تو نہیں کہ یہ انہیں نہ ملتا۔ وہ جب میرے پاس آیا تھا تو گاؤں سے نکلے ہوئے اسے دس سال سے زیادہ عرصہ گزر گیا تھا۔ رشید خود بھی کہتا تھا کہ گھر والوں نے خدا کا شکر ادا کیا ہو گا کہ میں گھر سے بھاگ آیا تھا۔

اس نے کرائے کا مکان لے لیا اور ایک نوکر بھی رکھ لیا۔ میں قارئین کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ اب وہ بڑھاپے کی عمر میں میرے پاس آیا تھا، اس سے پہلے وہ جوانی کی عمر میں ایک مریض کی حیثیت سے اُس وقت میرے پاس آیا تھا جب اُس کی شادی بھی ہو چکی تھی۔ اپنی یہ ہسٹری اُس نے مجھے اُس وقت سنائی تھی۔

میں نے اس وقت یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ اس شخص میں جو احساسِ کمتری تھا وہ برتری کے احساس میں تبدیل ہو چکا تھا۔ اسے اپنے ذہن میں یہ رکھنا چاہئے تھا کہ وہ اپنی محنت سے اس مقام تک پہنچا ہے پھر وہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا جس کی ذاتِ باری نے اس کی محنت کو قبول کیا اور اسے اتنی ترقی عطا کی ہے۔ یہ میرا تجزیہ ہے کہ اس نے ذہن میں یہ بٹھا لیا تھا کہ وہ سب سے اعلیٰ اور برتر انسان ہے اس لئے اسے افسری مل گئی ہے۔ افسری نے اس کا دماغ خراب کر دیا تھا۔

دو دوستوں نے جو اس کے ساتھی افسر تھے اسے شادی کرنے کے مشورے دینے شروع کر دیئے۔ اس نے بیوی کا بھی ایک آئیڈیل اپنے ذہن میں رکھا ہُوا تھا جسے وہ اس طرح بیان کرتا تھا کہ بیوی تعلیم یافتہ ہونی چاہئے اور اس میں پسماندگی نہ ہو۔ اس نے جب مجھے اپنی شادی کی باتیں اور اپنے دوستوں کی باتیں سنائیں تھیں تو میں سمجھ گیا تھا کہ اس کے ان دوستوں نے ایک رشتہ ذہن میں رکھا ہُوا تھا۔ دوستوں نے اسے لڑکی کے باپ سے ملوایا۔ رشید نے ہر کسی کو اپنے متعلق یہی بتا رکھا تھا کہ دنیا میں اس کا کوئی عزیز رشتہ دار زندہ نہیں اور اس کی زمین اور مکان پر غیروں نے قبضہ کر لیا ہے۔

لڑکی کے باپ کو رشید اس پہلو سے اچھا لگا کہ وہ اکیلا تھا۔ آپ جانتے ہیں کہ لڑکی کی شادی کر کے ہی والدین اس سے فارغ نہیں ہو جاتے، زیادہ پیچیدہ اور بڑے ہی بُرے مسئلے شادی کے بعد پیدا ہوتے ہیں۔ یہ مسئلے پیدا کیے جاتے ہیں

زیادہ تر ساس اور نندیں مسائل پیدا کرتی ہیں۔ لڑکیوں والے لڑکی کا رشتہ ایسی جگہ دینا پسند کرتے ہیں جہاں ساس اور نندیں نہ ہوں یا ساس ہو اور کوئی نند نہ ہو۔ اس پہلو کو دیکھتے ہوئے رشید بڑا اچھا رشتہ تھا۔ وہ اکیلا تھا اور سرکاری افسر بھی تھا۔ لڑکی کے باپ نے اپنی بیٹی کا رشتہ رشید کو دے دیا۔

رشید کی یہ بہت بڑی خوش نصیبی تھی کہ اسے ایک خوشحال گھرانے کی لڑکی مل گئی اور سامان اتنا ملا کہ اس کا گھر بھر گیا۔ فرنیچر اور دیگر سامان ایسا تھا جو اس کی حیثیت کے افسروں کے گھروں میں ہوتا ہے۔ اب بھی اس نے خدا کا شکر ادا کرنے کی بجائے اپنے دماغ کو اور زیادہ اونچا کر لیا۔ وہ اپنے کسی نہ کسی ساتھی افسر کو اپنے گھر مدعو کرتا اور اپنی افسری کی نمائش کر کے اسے خوشی ہوتی تھی۔

شادی کے فوراً" بعد اس نے اپنی بیوی کو تین چار کتابیں لا کر دیں اور اسے کہا کہ وہ انہیں پڑھے اور اس کے مطابق ازدواجی زندگی بنائے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے یہ کوشش کی کہ اس کی بیوی عملی زندگی سے ہٹ کر اور حقیقت کو نظر انداز کر کے ازدواجی زندگی کو ان کتابوں کے سانچے میں ڈھالے۔ یہ اس کی بہت بڑی غلطی تھی۔ یہ میرا تجربہ اور مشاہدہ ہے کہ ازدواجی زندگی کے حقائق اور اس کے متعلق کتابوں میں لکھے ہوئے فلسفے میں بہت بڑا فرق ہے بلکہ ان میں تضاد بھی پایا جاتا ہے۔

رشید نے دوسری حماقت یہ شروع کر دی کہ بیوی کے ساتھ پیار محبت اور ہنسی مذاق کی بجائے سنجیدہ باتیں شروع کر دیں جو لیکچر کی صورت میں ہوتی تھیں۔ اس کی بدقسمتی یہ ہوئی کہ جو لڑکی اسے ملی وہ شگفتہ مزاج تھی اور وہ اپنی عمر کی لڑکیوں کی طرح زندہ دل تھی۔ رشید جب میرے پاس آیا تو اُس وقت اُس کی شادی کو ایک سال گزر گیا تھا۔ وہ میرے پاس یہ شکائت لے کر آیا تھا کہ اس کے پیٹ میں اینٹھن سی ہوتی ہے' دل پر کبھی کبھی گھبراہٹ طاری ہو جاتی ہے' نیند بھی اچھی طرح نہیں آتی اور ایسی ہی کچھ اور تکلیفیں تھیں جو اس نے بتائیں۔ میں نے اس سے کچھ علامات پوچھیں۔ جب وہ سامنے آئیں تو مجھے یہ شخص اعصاب زدگی کا مریض نظر آیا۔ وہ اپنے آپ کو ہر وقت TENSE رکھتا تھا۔

اُس وقت میں اس کی اس بیک گراؤنڈ سے واقف نہیں تھا۔ میں اس کی ان تکالیف کو جسمانی سمجھا۔ معدے کی دوائیاں دینے کے علاوہ اسے اعصابی طاقت کے انجکشن بھی لکھ دیئے۔ پھر وہ میرے پاس آتا رہا اور میں اسے دوائیاں دیتا رہا۔ میں اسے نیند کی گولیاں نہیں دینا چاہتا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ جوان آدمی ہے' اسے اسی عمر میں نیند کی گولیوں کا سہارا نہ دیا جائے۔ اس کے تیسرے یا چوتھے پھیرے پر میں نے محسوس کر لیا تھا کہ اس کی NERVOUS TENSION کی کوئی گھریلو وجہ ہوگی۔ میں نے اس سے پوچھا تھا اور اس نے کہا تھا کہ وہ مطمئن زندگی گزار رہا ہے۔ ڈاکٹروں کے پاس اتنا وقت کہاں ہوتا ہے کہ وہ مریض کی فیملی بیک گراؤنڈ اور جذباتی معاملات کی لمبی لمبی کہانیاں سننے بیٹھ جائیں۔ یہ نفسیات کے ڈاکٹروں کا کام ہوتا ہے اور اگر کوئی نفسیاتی مرض ہو تو نفسیاتی علاج ہوتا ہے جسے سائیکو تھراپی کہتے ہیں اور جو ہمارے ملک میں ناپید ہے۔ نفسیات کے ڈاکٹر بھی ذہنی سکون کی گولیاں لکھ دیتے ہیں' لیکن رشید کو میں ابھی نفسیاتی مریض نہیں سمجھتا تھا۔

اس کے بعد وہ میرے پاس نہ آیا۔ چھ سات مہینے گزر گئے۔ وہ میرے ذہن سے اتر گیا۔ مریضوں کی کمی نہیں تھی۔ اس ہجوم میں عام سے ایک مریض کو یاد رکھنا ممکن نہیں ہوتا۔ چھ سات مہینے بعد مجھے ایک سرکاری دفتر میں کام پڑ گیا۔ میں متعلقہ دفتر گیا تو رشید نے مجھے دیکھ لیا۔ وہ اسی محکمے میں تھا۔ مجھے دیکھ کر دوڑا آیا اور پوچھا کہ میں کیوں آیا ہوں۔ میں نے اسے اپنا کام بتایا۔ اس کے یاد کرانے پر مجھے یاد آیا کہ وہ میرا مریض رہ چکا ہے۔ وہ مجھے اپنے دفتر میں لے گیا اور جو کام ڈیڑھ پونے دو مہینوں سے رُکا ہُوا تھا وہ اس نے دس پندرہ منٹوں میں کرا دیا۔

"کیا آپ میری دوائیوں سے صحت یاب ہو گئے تھے؟" ـــ میں نے پوچھا۔

"نہیں ڈاکٹر صاحب!" ـــ اس نے جواب دیا ـــ "اب تو حالت اور بُری ہو گئی ہے۔ تین مہینوں سے ویلیم اور رات نیند کو گولی کھا رہا ہوں"۔

"ان سے کچھ افاقہ محسوس ہوتا ہے؟" ـــ میں نے پوچھا۔

"جب تک گولی کا اثر رہتا ہے کچھ بہتر محسوس کرتا ہوں" ـــ اس نے کہا ـــ "لیکن یہ کوئی علاج تو نہیں ایسے محسوس کرتا ہوں جیسے خلا میں زندگی بسر کر رہا

ہوں۔ تصوّر اور حقیقت کا فرق بھی محسوس نہیں ہوتا"۔

اُس نے جن الفاظ میں اپنی یہ کیفیت بیان کی وہ کتابی الفاظ تھے۔ وہ علمی رنگ میں بات کر رہا تھا۔ میں اس سے کوئی حقیقی بات پوچھتا تھا تو وہ فلسفیانہ انداز میں مجھے علمی پہلو سنا دیتا تھا۔ تب مجھے شک ہوا کہ یہ کوئی نفسیاتی معاملہ ہے اور اُس کی کوئی اور ہی بیک گراؤنڈ ہے۔

"کیا آپ کسی ایسی پریشانی میں مبتلا ہیں جس کا آپ کے پاس کوئی علاج نہیں؟" —— میں نے پوچھا اور کہا —— "یہ کوئی نفسیاتی یا ذہنی معاملہ معلوم ہوتا ہے"۔

"ہاں ڈاکٹر صاحب!" —— اس نے آہ بھر کر کہا —— "معاملہ کچھ ایسا ہی ہے"۔

"آپ نے مجھے اُسی وقت بتا دیا ہوتا جب آپ میرے پاس آئے تھے" —— میں نے کہا۔

"بتانا تو چاہتا تھا" —— اُس نے کہا —— "لیکن اُس وقت میں اُسے جسمانی تکلیف سمجھتا تھا۔ پھر میں نے اس لئے بھی آپ کو اپنی بیک گراؤنڈ نہ بتائی کہ آپ کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا"۔

"اب بتا دیں" —— میں نے کہا —— "میں پورا وقت دوں گا اور توجہ سے سنوں گا۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ سے یہ گولیاں چھڑوا دوں"۔

اس آدمی نے میرا کام کروا کے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا تھا۔ یہ نہ کراتا تو معلوم نہیں میرا کام کب تک لٹکا رہتا۔ میں پہلی بار اپنی درخواست کے پیچھے اس دفتر میں آیا تھا۔ مجھے احساس ہو گیا تھا کہ کچھ دینے دلانے کے بغیر یہ کام نہیں ہو گا۔ میں نے رشید کو وقت دے دیا اور اسے کہا کہ وہ میرے کلینک میں آنے کی بجائے میرے گھر آجائے۔ میں نے اسے اپنا گھر سمجھا دیا جو کلینک سے تھوڑی ہی دور تھا۔

وہ اگلے روز میرے گھر آگیا۔ اس نے میرے کہنے پر اپنی گزاری ہوئی زندگی کی تفصیل سنانی شروع کر دی۔ یہ تفصیل پہلے سنا چکا ہوں۔ اس کے بعد اس کے لئے ایسے حالات پیدا ہو گئے جو اس نے خود پیدا کیے تھے اور ان کا اس کے پاس کوئی علاج نہیں تھا۔ میں پہلا شخص ہوں جسے وہ اپنی بیک گراؤنڈ اور تمام حالات سنا رہا

تھا۔ وہ میری دوائیاں چھوڑ کر ایک اور ڈاکٹر کے پاس چلا گیا تھا۔ اس ڈاکٹر کو اس نے اپنی ذہنی علامات بتائیں تو اس نے اسے پانچ ملی گرام ویلیئم دن میں تین بار اور رات کو ایک گولی اے ٹی ون (دو ملی گرام) لکھ دیں۔

اس کے ساتھ ایک عجیب ڈرامہ ہُوا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ حقیقی زندگی میں ایسے ڈرامے ہو ہی جاتے ہیں جو بظاہر عجیب لگتے ہیں لیکن یہ عجوبہ نہیں ہوتے۔ جب وہ میرے پاس آیا تھا۔ پھر اس نے آنا چھوڑ دیا تھا' اس کے چند دنوں بعد کا واقعہ ہے کہ رشید ایک پارک میں ٹہل رہا تھا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ اس وقت اس کی ذہنی حالت بہت ہی دگرگوں ہو رہی تھی۔ کسی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور اسے ایک عورت کی آواز سنائی دی —— "بھائی جان!" —— اس نے دیکھا۔ وہ ایک نوجوان لڑکی تھی جس کی عمر بائیس تئیس سال لگتی تھی۔ رشید کے لئے یہ لڑکی اجنبی تھی۔ لڑکی نے اس کا نام لے کر کہا کہ آپ وہی ہیں۔ لڑکی نے اسے اس نام سے پکارا جس سے اسے گھر اور گاؤں والے پکارا کرتے تھے۔

لڑکی نے اپنا نام بتایا۔ اس نے پورا نام بھی بتایا اور چھوٹا نام بھی پھر اس نے اپنے باپ کا پھر اپنی ماں کا نام لیا تو رشید کی یہ حالت ہو گئی جیسے اسے چکر آگیا ہو —— یہ لڑکی رشید کی چھوٹی بہن تھی۔ رشید جب گاؤں کو خیرباد کہہ کر نکلا تھا تو اس کی اس بہن کی عمر سات آٹھ سال تھی۔ رشید کا اسے نہ پہچاننا قدرتی بات تھی کیونکہ اب یہ لڑکی جوان تھی۔

"تم یہاں کیا کر رہی ہو؟" —— رشید نے حیرت اور بے رخی سے پوچھا۔

"نرسنگ کا کورس کر رہی ہوں" —— لڑکی نے جواب دیا —— "ہوسٹل میں رہتی ہوں..... آپ کہاں رہتے ہیں؟ میں آپ کے پاس آجاؤں گی"۔

اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ بہن نے اپنے گمشدہ بھائی کو پا کر کیسے جذبات کا اظہار کیا ہو گا اور اس نے کیا کچھ کہا ہو گا لیکن رشید کے جذبات بالکل سرد رہے۔ وہ حیران بھی ہُوا کہ اس کی بہن کس طرح شہر میں آگئی ہے۔ بہن نے اس کو بتایا کہ گھر میں باپ کے مرنے کے بعد کیا تبدیلیاں آئی ہیں اور وہ کس طرح میٹرک پاس کر کے نرسنگ کے کورس کے لئے منتخب ہوئی ہے۔ وہ رشید کی طرح گاؤں سے بھاگ کر

نہیں آئی تھی۔ اس کے بڑے بھائی کے ایک گہرے دوست نے کوشش کر کے اسے نرسنگ کے کورس کے لئے منتخب کرایا تھا۔

رشید کو اس کی بہن بتا رہی تھی کہ وہ شہر میں کس طرح آئی ہے۔ وہ خوشی کا اظہار بھی کر رہی تھی کہ اسے بھائی مل گیا ہے اور اب وہ بھائی کے ساتھ رہے گی۔ اس نے رشید سے یہ بھی پوچھا کہ وہ یہاں کیا کرتا ہے اور اس نے شادی کی ہے یا نہیں، لیکن رشید بُت بنا کھڑا رہا۔

"بھائی جان!" — بہن نے اس سے پوچھا — "کیا آپ مجھے دیکھ کر خوش نہیں ہوئے؟"

"نہیں!" — رشید نے روکھا سا جواب دیا — "تم میری بہن ہو میرا خُون ہو لیکن میں یہ رشتے توڑ چکا ہوں"۔

"کیا بہن بھائی کا رشتہ بھی ٹوٹ سکتا ہے بھائی جان؟"

"کیوں نہیں ٹوٹ سکتا؟" — رشید نے اپنے مخصوص علمی انداز میں کہا — "یہ تو اتفاق کی بات ہے کہ ہم دونوں ایک ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئے تھے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ایک ماں کے پیٹ سے پیدا ہونے والے ایک دوسرے کے قیدی بن جائیں"۔

رشید نے اپنی بہن کو جو فلسفہ سنایا تھا وہ سارے کا سارا مجھے سنایا اور مجھے بھی ایسے انداز سے سنایا جیسے میں کچھ بھی نہیں جانتا تھا اور وہ مجھے سمجھا رہا تھا۔ پھر اس نے اپنی بہن کو ایسی بات کہی جسے میں اور آپ گھٹیا کہیں گے لیکن اس نے یہ بات کچھ فخر سے مجھے سنائی۔ بہن اس سے التجا کر رہی تھی کہ وہ اسے اپنے ساتھ رکھے۔

"میری مجبوری سمجھنے کی کوشش کرو" — رشید نے اپنی بہن سے کہا — "میں نے دن رات اور کئی سال محنت کر کے شہری سوسائٹی میں افسری کا مقام حاصل کیا ہے۔ ایک امیر گھر کی لڑکی کے ساتھ میری شادی ہو گئی ہے۔ ان لوگوں نے صرف اس لئے اپنی بیٹی مجھے دی ہے کہ وہ مجھے کسی بڑے ہی اعلیٰ اور اونچے درجے کے خاندان کا آدمی سمجھتے ہیں۔ میں نے انہیں اور ہر کسی کو اپنے متعلق یہ

بتایا ہے کہ میں دنیا میں اکیلا رہ گیا ہوں اور میری جائیداد پر غیروں نے قبضہ کر لیا ہے..... میں اب افسر ہوں اور لوگ مجھے سلام کرتے ہیں۔ اگر میں تمہیں اپنے ساتھ رکھ لوں تو میری اصلیت ظاہر ہو جائے گی۔ لوگ مجھے چھوٹا آدمی سمجھنے لگیں گے..... اور تم میری بیوی، اس کے رشتہ داروں اور میرے ملنے والوں کو کیا بتاؤ گی کہ تم نرس بنو گی؟"

"آپ مجھے نرسنگ سے ہٹا لیں بھائی جان!" — اس کی بہن نے کہا — "اور مجھے کالج میں داخل کرا دیں..... ہاں..... میں یہ سب کو بتاؤں گی کہ بچپن میں مجھے نانی لے گئی تھی"۔

"مجھے ذلیل نہ کرو" — رشید نے کہا — "میں اپنی وہ جڑیں کاٹ چکا ہوں جنہوں نے مجھے گاؤں کی گندی زمین میں جکڑ رکھا تھا"۔

بہن میں دیہات والی خودداری اور غیرت زندہ تھی۔ اس نے جب دیکھا کہ بھائی اپنے آپ کو آسمان سے اترا ہوا فرشتہ اور اسے بہت ہی گھٹیا سمجھ رہا ہے تو اُس نے بھائی سے کہا کہ اپنی جڑیں کاٹنے والے سُکھی نہیں رہا کرتے۔ یہ کہہ کر بہن چلی گئی۔

رشید نے مجھے یہ بھی کہا کہ اس کی بہن بڑی خوبصورت لڑکی ہے اور ایسی لڑکیاں شہر میں آ کر اور پھر نرسنگ کا پیشہ اختیار کر کے ٹھیک نہیں رہ سکتیں۔

میں خود ڈاکٹر ہوں۔ مجھے اُس کی یہ بات بہت بُری لگی کہ نرسنگ کے پیشے میں لڑکیاں ٹھیک نہیں رہتیں، لیکن میں نے اُسے کچھ بھی نہ کہا۔ میں اسے یہ کہنا چاہتا تھا کہ وہ بے غیرت آدمی ہے کہ اس نے اپنی جوان بہن کو دھتکار دیا۔ اگر اسے بہن کے خراب ہونے کا اتنا ہی درد تھا تو اُسے اپنے ساتھ رکھ لیتا، لیکن میں نے اسے کچھ بھی نہ کہا۔ وہ کوئی بات سننے کے موڈ میں نہیں تھا۔ وہ تو مجھے سمجھا رہا تھا کہ اس کی سوچ بالکل صحیح ہے۔

"رشید صاحب!" — میں نے اسے کہا — "آپ نے اپنی بہن کو قبول نہیں کیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ لاشعوری طور پر اس کا اچھا ردِ عمل نہیں ہُوا جس کا آپ پر اثر پڑا ہے"۔

"نہیں ڈاکٹر صاحب!" — اس نے کہا — "بہن کو اپنے ساتھ نہ رکھنے کے فیصلے کا مجھ پر اچھا ہی اثر ہُوا ہے کیونکہ میں اچھی طرح سمجھتا ہوں کہ میں نے یہ فیصلہ کیوں کیا تھا۔ مجھ پر اثر کچھ اور ہے۔ معلوم نہیں اس کا آپ کے پاس کوئی علاج ہے یا نہیں۔ بہن کی اس ملاقات کے تین چار مہینے کے بعد وزیرِ اعلیٰ کو ڈنر پر مدعو کیا گیا۔ یہ سرکاری ڈنر ہوتے ہیں جن میں افسروں کی حاضری لازمی ہوتی ہے۔ افسر اپنی بیویوں کو ساتھ لے جاتے ہیں۔ میں بھی بیوی کو ساتھ لے گیا۔ ڈنر شروع ہونے سے پہلے سب دو دو چار چار کی ٹولیوں میں اِدھر اُدھر کھڑے باتوں میں مصروف تھے۔ زیادہ افسر وزیروں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر انہیں سلام کر رہے تھے۔ سینئر افسروں نے وزیرِ اعلیٰ کو نرغے میں لے رکھا تھا۔ چاپلوسی کے کرتب دکھائے جا رہے تھے۔ ایسا ہر افسر برسرِ اقتدار پارٹی کی تعریفیں اور وفاداری کا اظہار کر رہا تھا۔ صرف میں تھا جو اپنی بیوی کے ساتھ الگ کھڑا تھا.....

"بیوی میرے ساتھ تو کھڑی تھی لیکن میں محسوس کر رہا تھا کہ ذہنی طور پر میرے ساتھ نہیں۔ میں اس کے ساتھ کوئی بات کرتا تھا تو وہ ویسے ہی ہاں کر دیتی تھی۔ وہ اس طرح اِدھر اُدھر دیکھتی تھی جیسے کسی کو ڈھونڈ رہی ہو۔ میں کوئی بات کر رہا تھا لیکن بیوی کسی اور طرف دیکھ رہی تھی۔ یکلخت اس نے اپنا بازو ہلایا اور بڑے اشتیاق سے مسکرائی۔ میں نے اس طرف دیکھا۔ وہ ایک جوان سا افسر تھا جو ہاتھ اوپر کر کے ہلا رہا تھا۔ میں اسے جانتا تھا۔ وہ اچھی شہرت کا آدمی نہیں تھا۔ میں جو بات کر رہا تھا وہ ادھوری ہی رہنے دی۔ میری بیوی نے ذرا سا بھی نوٹس نہ لیا کہ میں کچھ کہہ رہا تھا اور میں بات پوری کئے بغیر چپ ہو گیا ہوں.....

"بیوی کا یہ رویّہ تو شادی کے ایک مہینے بعد ہی شروع ہو گیا تھا..... میں آپ کو صاف الفاظ میں بتاتا ہوں ڈاکٹر صاحب! پہلے تو بیوی مجھ سے بیزار رہنے لگی پھر مجھ سے دور ہٹنے لگی۔ میں سمجھ گیا کہ بیوی مجھے یا میری عادات کو پسند نہیں کرتی۔ ڈِنر پر اس کی یہ حرکت جو میں نے آپ کو سنائی ہے میرے لئے نئی یا عجیب نہیں تھی۔ اس نے اپنی دوستیاں پیدا کر لی تھیں۔ اس کی دوستیاں دوسروں کی بیویوں کے

ساتھ بھی تھیں اور ایسے آدمیوں کے ساتھ بھی جن کی ابھی شادی نہیں ہوئی تھی۔ ڈِنر پر اس کی یہ حرکت مجھے قدرتی طور پر بُری لگی۔ میں اتنا بیزار ہُوا کہ میرے دل میں آئی کہ وہاں سے چلا جاؤں۔ شائد میں چلا ہی جاتا' لیکن مجھے ایک عجیب چیز نظر آئی جس نے مجھے جھنجھوڑ دیا۔ میں نے وہاں اپنی بہن کو دیکھا.....

"بہن کو وہاں دیکھ کر مجھے غصہ آنے کی بجائے اطمینان ہوا کہ میں نے اُسے اپنے ساتھ نہ رکھ کر اچھا کیا تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ میری بہن نے کسی افسر کے ساتھ یا کسی اور مہمان کے ساتھ دوستی لگا رکھی ہے اور اس آدمی نے اسے اپنی بیوی ظاہر کیا ہو گا اور اس طرح اسے اپنے ساتھ لے آیا۔ میں اس کی طرف سے منہ پھیرنے ہی لگا تھا کہ ایک جواں سال افسر اس کے پاس آ کھڑا ہُوا اور اس نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ دونوں مسکرا رہے تھے۔ بہن نے ابھی مجھے نہیں دیکھا تھا۔ پھر اس نے مجھے دیکھ لیا۔ اس کے ہونٹوں سے مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ اس کے ساتھ جو افسر تھا اسے میں جانتا تھا اور میں یہ بھی جانتا تھا کہ وہ ایسی بُری شہرت کا آدمی نہیں تھا۔ اس نے بھی مجھے دیکھا اور میری بہن کو ساتھ لے کر میرے پاس آ گیا"۔

رشید نے یہ واقعہ بھی مجھے پوری تفصیل سے سنایا اور اپنی اُس وقت کی جذباتی کیفیت بھی بتائی جب اس کی بہن ایک آدمی کے ساتھ اس کے سامنے کھڑی تھی۔ اس آدمی نے رشید کی بہن کا رشید کے ساتھ اس طرح تعارف کرایا کہ یہ میری بیوی ہے۔

"بیوی؟" — رشید نے کچھ حیرت اور کچھ حقارت سے پوچھا — "تم نے شادی کب کی ہے؟ کیا اتنی خاموشی سے شادی کی ہے کہ کسی کو پتہ ہی نہ چلا؟"

"ہاں رشید صاحب!" — اس نے کہا — "شادی اس قسم کی تھی کہ خاموشی سے کرنی پڑی"۔

رشید نے مجھے بتایا کہ یہ آدمی اس کے محکمے میں صرف افسر ہی نہیں تھا بلکہ سوسائٹی میں اونچا مقام رکھنے والے خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ رشید کو حیرت یہ

دیکھ کر ہوئی کہ اس کی بہن کے چہرے پر بیزاری یا ناپسندیدگی کا تاثر تھا اور وہ رشید کی طرف ٹیڑھی آنکھ سے دیکھتی تھی جیسے اس کی طرف دیکھنا بھی نہ چاہتی ہو۔ رشید کے منہ سے بے اختیار نکل گیا کہ یہ تو میری بہن ہے"۔

"جھوٹ" ـــ بہن نے کہا ـــ "میں اس کی بہن نہیں"۔

رشید کی بہن کا خاوند حیرت سے کبھی رشید کو کبھی اس کی بہن کو دیکھتا تھا کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ معاملہ ایسا تھا جسے اس کی بہن کا خاوند نظرانداز نہیں کر سکتا تھا۔ وہ دونوں کو الگ لے گیا۔ رشید نے دیکھا کہ اس کی اپنی بیوی وہاں نہیں تھی۔ ایک طرف لے کر جا کر رشید کی بہن کے خاوند نے پوچھا کہ یہ کیا قصہ ہے۔ رشید چونکہ کہہ چکا تھا کہ یہ میری بہن ہے اس لئے اسے اسی بات پر قائم رہنا پڑا۔ خاوند نے اس کی بہن سے پوچھا کہ یہ کیوں کہا ہے کہ یہ اس کا بھائی نہیں۔ بہن نے رشید کو جو ذلیل کرنا شروع کیا تو کوئی کسر رہنے نہ دی۔ اس نے کھل کر بتایا کہ اس نے اس کی بہن ہونے سے کیوں انکار کیا تھا۔

"میں نے جب اسے بتایا تھا کہ میں نرسنگ کی ٹریننگ لے رہی ہوں اور ہوسٹل میں رہتی ہوں تو اس نے مجھے کہا تھا کہ میں افسر ہوں اور تم ساتھ رہیں تو میری بے عزتی ہوگی" ـــ رشید کی بہن نے حقارت سے کہا ـــ "اب اسے پتہ چلا ہے کہ میں اسی جیسے ایک افسر کی بیوی ہوں تو اس نے باچھیں کھلا کر کہا کہ یہ میری بہن ہے..... اُس وقت اُس نے یہ بھی نہ سوچا کہ میری بہن شہر میں اکیلی ہے' یہ کہیں چَلن خراب نہ ہوتی پھرے۔ میں ایسے اوچھے اور کمینے آدمی کو اپنا بھائی نہیں کہہ سکتی"۔

رشید کے لئے یہ چوٹ بہت بری تھی۔ بعد میں رشید کو پتہ چلا کہ اُس کی بہن کے خاوند نے اس کی بہن کو کہیں دیکھا تھا۔ وہ اسے اتنی اچھی لگی کہ اپنے باپ کو ناراض کر کے اس نے خاموشی سے اس لڑکی کے ساتھ شادی کر لی۔ اس کی ماں اس کے ساتھ تھی۔ پھر باپ بھی راضی ہو گیا تھا۔

اپنی بیوی کے متعلق رشید نے مجھے سنایا کہ اسے پتہ ہی نہ چلا کہ وہ کس وقت اس سے ہٹ کر کسی اور کے پاس چلی گئی تھی۔ اپنی بہن کی باتوں سے رشید اتنا

دلبرداشتہ ہُوا کہ وہ اپنی بیوی کو وہیں چھوڑ کر ڈنر شروع ہونے سے پہلے ہی گھر چلا گیا۔ اس کی بیوی کم و بیش دو گھنٹوں بعد گھر آئی اور اس پر برس پڑی کہ وہ اسے وہاں ڈھونڈتی رہی آخر اکیلی واپس آئی۔

"تمہیں میری کیا ضرورت ہے؟" ـــ رشید نے کہا ـــ "وہاں تم اکیلی نہیں تھیں۔ مجھے تو یہ بھی پتہ نہیں چلا کہ تم کس وقت مجھے اکیلا چھوڑ کر اپنے کسی دوست کے پاس چلی گئی تھیں"۔

"آپ کی ان باتوں کی وجہ سے مجھے آپ سے دور ہٹنا پڑتا ہے" ـــ بیوی نے کہا ـــ "آپ کے پاس سنجیدگی اور خشک اور بے معنی فلسفے کے سوا ہے ہی کیا"۔

رشید نے مجھے بتایا کہ اس کی بیوی کی فطرت اس سے بالکل اُلٹ تھی۔ یہ میں بتا چکا ہوں کہ اس نے دوستی کا اپنا ایک حلقہ بنا لیا تھا۔ رشید نے ایسا کوئی الزام تو نہ لگایا نہ میں کوئی رائے دوں گا کہ اس کی بیوی کا چال چلن بھی خراب ہو گیا تھا۔ چال چلن جیسا بھی تھا' رشید کو ذہنی مریض بنانے کے لئے یہی کافی تھا کہ بیوی نے اسے دھتکار دیا تھا۔ وہ ہر وقت اس سے بیزار رہتی تھی۔ رشید کے لئے گھر میں ذرا سا بھی سکون نہ رہا۔ اس کی شخصیت تو تھی ہی نہیں۔ اگر تھی تو یہ کاغذی شخصیت تھی' الفاظ کی بنی ہوئی تھی۔ زندگی کی ایک حقیقت نے الفاظ کو بکھیر دیا اور رشید ٹوٹ پھوٹ گیا' فلسفے بیکار ثابت ہوئے۔ کتابوں نے بھی وفا نہ کی۔

پھر وہ طوفان آیا کہ رشید کا رہا سہا سکون اور اطمینان بھی اُڑ گیا۔ یہ اس طرح ہُوا کہ اس کی بہن کے خاوند نے دفتر میں رشید کی اصلیت مشہور کر دی۔ اس سے اس کا اعصابی نظام بُری طرح متاثر ہُوا۔

"رشید صاحب!" ـــ میں نے کہا ـــ "اپنی اصلیت کے متعلق آپ اتنے حسّاس اور شرمسار کیوں ہیں؟"

اس نے اپنے مخصوص انداز میں ایک کتابی قسم کی وضاحت شروع کر دی' لیکن میں نے اسے روک دیا۔

"آپ کا اصل مرض یہ ہے" ـــ میں نے کہا ـــ "ایک خوبصورت چیز کو آپ نے بدصورت قرار دے کر اسے اپنے لئے الرجی کا باعث بنا رکھا ہے۔

دیہات کا ذکر آپ یوں کرتے ہیں جیسے آپ شہر کے کسی غلیظ احاطے میں پیدا ہوئے تھے۔ میں آپ کو صرف یہ علاج بتا سکتا ہوں کہ اپنی سوچوں کو اور اپنے ذہنی رجحان کو بدل ڈالیں۔ اپنی جڑیں جہاں ہیں وہیں رہتی ہیں۔ وہ نہیں کٹ سکتیں۔ جس کسی نے بھی انہیں کاٹنے کی کوشش کی وہ اسی حال تک پہنچا جس تک آپ پہنچ گئے ہیں۔ یوں بھی آپ سمجھ سکتے ہیں کہ جڑیں کٹ جائیں تو درخت سوکھ جاتا ہے۔ اسے دیمک کھاتی ہے یا جلانے کے کام آتا ہے۔

میں نے اسے سمجھانے کی بہت کوشش کی، انسانی فطرت' نفسیات اور سوشیالوجی پر بڑا لمبا لیکچر دیا' لیکن وہ اپنے فلسفے کی دلدل سے نہ نکل سکا۔ وہ بیزاری کے عالم میں چلا گیا۔ میں اتنا بوڑھا ہو گیا کہ پریکٹس بھی چھوڑ دی اور وہ پھر میرے پاس آگیا۔ اب تو میں نے اسے بالکل ہی نہ پہچانا۔ عمر میں وہ مجھ سے بہت چھوٹا تھا لیکن مجھ سے زیادہ بوڑھا لگتا تھا۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اس نے اپنا تعارف کرایا تو بڑی مشکل سے مجھے یاد آیا۔ میں نے اس نے حال احوال پوچھا تو اس نے بتایا کہ اس کی عمر ذہنی سکون اور نیند کی گولیاں کھا کھا کر گزر رہی ہے۔ میں نے اولاد کے متعلق پوچھا تو اس نے بیزاری کا اظہار کیا۔ کہنے لگا کہ تین بیٹے ہیں' لیکن اپنی ماں کی ہی سنتے ہیں۔ میرے ساتھ تو انہوں نے کبھی بات ہی نہیں کی۔

وہ ویسے ہی میرے پاس آگیا تھا۔ میں نے صحت کے متعلق پوچھا تو کہنے لگا کہ ہر وہ خرابی موجود ہے جو بڑھاپے میں ہوتی ہے۔

"ڈاکٹر صاحب!" ــــ رشید نے آہ بھر کر کہا ــــ "یوں معلوم ہوتا ہے جیسے میں نے خلاء میں زندگی گزاری ہے"۔

یہ کہہ کر وہ آہستہ آہستہ چلتا میرے گھر سے نکل گیا۔ جاتے جاتے کہنے لگا کہ یہاں سے گزر رہا تھا کہ آپ یاد آگئے ــــ میرے ساتھ یہ اس کی آخری ملاقات تھی۔

ــــــــ ❖ ــــــــ

گناہ گزیدہ

کہانی جو میں سنانے لگی ہوں' ایک نفسیاتی مریض کا کیس ہے۔ یہ ہمارے پروفیسر نے کلاس کو تفصیل اور تجزیئے کے ساتھ سنایا تھا۔ یہ کیس غالباً" پاکستان بننے سے چند سال پہلے شروع ہُوا تھا۔ جو لوگ نفسیات کے علم سے واقف نہیں' وہ اس ذہنی مریض کو بے غیرت کہیں گے۔ شاید اس کہانی کو افسانہ بھی سمجھا جائے گا۔ لوگ کہتے ہیں کہ ایسی کہانیاں سچّی نہیں ہو سکتیں' لیکن نفسیات کی دنیا میں اس سے زیادہ ناقابلِ یقین واقعات بھی سچے ہوتے ہیں۔

انسان کا ذہن لاشعور ایک تاریک غار کی طرح ہے جس کے متعلق کوئی نہیں بتا سکتا کہ کتنی دُور تک لمبا اور کتنا چوڑا ہے اور اس کے اندر کیا کچھ چھپا ہُوا ہے۔ اس کے اندر بھول بھلیّاں ہیں۔ یہ کیس پڑھیں تو آپ کو کچھ وجوہات معلوم ہو جائیں گی جو انسان کو انسانیت کی سطح سے گرا دیتی ہیں۔

اُس وقت مریض کی عمر پینتیس سال تھی۔ اسے اس کا بڑا بھائی ایک ڈاکٹر کے پاس لے گیا تھا۔ اسے تکلیف یہ تھی کہ نیند نہیں آتی تھی۔ تمام رات جاگ کر گزارتا تھا۔ رات جاگنے کی وجہ سے اسے ہر وقت غصہ آیا رہتا تھا۔ وہ کسی کام کے قابل نہیں رہا تھا۔ وہ کسی سرکاری محکمے میں ملازم تھا۔ آمدنی کا کوئی اور ذریعہ بھی تھا۔

ڈاکٹر نے اسے نیند کی گولیاں دے دیں۔ ان سے اسے نیند تو آجاتی تھی لیکن وہ نیند میں بستر سے اٹھ کر صحن میں ایک چکر میں چلنے لگتا یا باہر نکل جاتا تھا۔ صبح اسے گھر والے بتاتے تھے کہ رات کو وہ چلتا پھرتا رہا ہے لیکن اسے یاد نہیں ہوتا تھا۔ گھر والے رات کو اس کی نگرانی کرنے لگے۔ نیند میں جب وہ چلتا تھا تو اس کا ہاتھ پکڑ کر جدھر لے جاتے' وہ اندھوں کی طرح ادھر ہی چل پڑتا تھا۔ اُس کی

آنکھیں بند ہوتی تھیں۔ اس سے بات کی جاتی تو وہ "ہوں' ہاں" کے سوا کچھ نہیں بولتا تھا۔

ڈاکٹر کو بتایا گیا کہ یہ نیند میں چلتا ہے۔ اسے SOMNAMBULISM کہتے ہیں۔ اس مرض کے مریض کو گہری نیند میں چلتے ہوئے اپنے حواس پر قابو ہوتا ہے لیکن وہ بیرونی آوازوں اور اثرات سے بے خبر رہتا ہے اور صبح اسے یاد نہیں ہوتا کہ وہ رات کو کیا کرتا رہا ہے۔

ڈاکٹر نے اس مرض کی کوئی دوائی دے دی لیکن یہ مرض دوائیوں سے ٹھیک نہیں ہو سکتا۔ اس وقت لوگ بہت کم بیمار ہوتے تھے' اس لئے ڈاکٹروں کے پاس اتنا وقت ہوتا تھا کہ وہ بڑی تسلی اور اطمینان سے مریض کو دیکھتے اور اس کی ذہنی یعنی نفسیاتی حالت معلوم کرنے کی بھی کوشش کرتے تھے۔ اس مریض کا علاج جو ڈاکٹر کر رہا تھا' وہ زیادہ مخلص اور محتاط تھا۔ اس نے مریض کے بڑے بھائی سے مزید علامات معلوم کیں۔

نئی علامات یہ معلوم ہوئیں کہ مریض کی بیوی سات آٹھ سال پہلے مر گئی تھی۔ ایک ہی بچّہ تھا جس کی عمر آٹھ سال کے لگ بھگ تھی۔ مریض اپنے اس اکلوتے بیٹے کے ساتھ پیار کرنے کی بجائے اس کے ساتھ بات بھی نہیں کرتا تھا۔ مریض کی یہ دوسری بیوی تھی۔ وہ مر گئی تو مریض ابھی جوان تھا۔ اسے ایک اور شادی کر لینی چاہئے تھی۔ خاندان کے سب لوگ اسے تیسری شادی کے لئے مجبور کرتے رہے لیکن اس نے ایسا انکار کیا کہ اسی پر قائم رہا۔ ڈاکٹر کو یہ بھی بتایا گیا کہ مریض زیادہ تر خاموش اور اپنے ہی خیالوں میں گم رہتا ہے اور اسے غصہ بہت آتا ہے۔

مریض کے بڑے بھائی نے جب یہ دیکھا کہ ڈاکٹر اتنی زیادہ دلچسپی لے رہا ہے اور بے تکلفی سے باتیں کرتا ہے تو اس نے ڈاکٹر کو بتایا کہ اسے محلے کے اور اپنے خاندان کے دو تین بزرگوں نے کہا تھا کہ اسے (مریض کو) کسی سیانے ڈاکٹر کے پاس لے جاؤ' اسے کوئی دماغی تکلیف ہے۔

بڑے بھائی نے ڈاکٹر کو جب یہ بات بتائی تو ڈاکٹر کا یہ شک پکا ہو گیا کہ اس

مرض کے پس منظر میں نفسیاتی عوامل کام کر رہے ہیں۔ مریض پر اپنے ذہنِ لاشعور کا بڑا سخت قبضہ تھا۔ نیند میں چلنا نفسیاتی خلفشار یا گھٹن کا نتیجہ ہوتا ہے۔ ایک روز مریض ڈاکٹر کے ہاں لے جایا گیا تو ڈاکٹر نے اسے اپنے پاس بٹھا کر اس کے بھائی کو گھر بھیج دیا۔ اس سے پہلے مریض نے ڈاکٹر کو صرف یہ بتایا تھا کہ اسے نیند نہیں آتی۔ اس کے بعد اس نے بتایا کہ اسے نیند تو آ جاتی ہے لیکن ایسے لگتا ہے جیسے وہ نیند میں بے آرام اور بے چین رہتا ہے۔

ڈاکٹر نے اب بدلے ہوئے زاویے سے اسے دیکھنا شروع کیا۔ دیکھنے کا مطلب یہ ہے کہ مریض کے ذہن میں جو کچھ تھا' ڈاکٹر وہ باہر نکلوانے کی کوشش کرنے لگا۔ ڈاکٹر تھانیدار نہیں ہوتا کہ ڈرا کر یا مار پیٹ کر مریض سے اقبالِ جرم کرا لے۔ یہ مریض ڈاکٹر سے کچھ چھپانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن ڈاکٹر نے اس سے وہ راز لے لیا جو اسے سونے نہیں دیتا تھا اور گولیوں سے وہ سو جاتا تھا تو یہ راز اسے نیند میں چلاتا رہتا تھا۔

یہ راز بالکل وہی ہے جسے محترم ڈاکٹر نصیر۔ اے۔ شیخ اور محترم میم۔ الف نے اپنی مشہور و معروف کتاب "زندہ رہو جوان رہو" میں ہر زاویے سے بیان کیا ہے۔ اس مریض کا نام مجھے معلوم نہیں کیا تھا۔ میں ناصر کہہ لیتی ہوں۔ اس نے ڈاکٹر کو اپنا ماضی سنایا۔ اس کا باپ ویسا ہی تھا جیسے ہمارے معاشرے میں باپ ہوتے ہیں۔ ناصر کا باپ زبردست ڈکٹیٹر تھا۔ اپنی ہر بات کو جابر سلطان کے حکم کی طرح منواتا تھا۔ کوئی بچّہ یا گھر کا کوئی بڑا فرد کوئی جائز بات یا حرکت کرتا تو بھی باپ ڈانٹ دیتا تھا۔ گھر میں کسی کو اجازت نہیں تھی کہ اپنی مرضی سے کوئی نہایت معمولی سی بھی حرکت کرتا۔

ناجائز اور طنزیہ ٹوکا ٹوکی' ڈانٹ ڈپٹ اور مار پیٹ نے ناصر میں گھٹن پیدا کر دی جس کا لازمی نتیجہ جذباتی انتشار تھا۔ اس میں قوتِ ارادی اور خود اعتمادی جیسے اوصاف پیدا نہ ہو سکے۔

ناصر کی نفسیاتی مشینری اسی ڈھنگ سے چلنے لگی جو ڈھنگ اسے جذباتی گھٹن نے دیا تھا۔ یہ ایک قدرتی ردِّعمل تھا جس سے ناصر بچ نہیں سکتا تھا۔ کوئی جوان'

خواہ وہ لڑکی ہے یا لڑکا' اس ردِّ عمل اور نفسیاتی عمل سے بچ نہیں سکتے۔ ان دنوں فحش رسالے اور ناول اتنے زیادہ نہیں ہُوا کرتے تھے جتنے آج کل ہیں' لیکن فحاشی کسی نہ کسی حد تک ادب میں موجود تھی۔ ادبی رسالوں میں ادب کے لیبل سے ایسے افسانے چھپا کرتے تھے جن میں ننگی تحریروں والے ناول بھی لکھے جاتے تھے۔ ان کی تعداد بہت ہی کم تھی لیکن لڑکیوں اور لڑکوں کے ہاتھ لگ جاتے تھے۔ البتہ آج کی نسبت اتنا فرق ضرور تھا کہ ایسے ناول آج کل کی طرح کھلے بندوں نہ ملتے تھے نہ پڑھے جاتے تھے۔

ناصر نے ڈاکٹر کو بتایا کہ ایک تو اسے چھُپ چھُپ کر سگریٹ پینے کی عادت ہو گئی اور دوسرے یہ کہ کسی دوست سے اسے ایک ناول مل گیا۔ اس نے اس عجیب طرح کی لذت دی۔ یہ لاہور شہر کی کہانی ہے۔ اس شہر میں لذّت مہیّا کرنے والی تحریریں مل جاتی تھیں۔

ناصر کا ذہن بھٹک گیا اور اسے اخلاقی تباہی کی طرف لے گیا۔ وہ اخلاقی انحراف کا شکار ہو گیا۔ اس کی جسمانی طاقت تو کم ہونی ہی تھی' نفسیاتی توانائی بھی کمزور ہو گئی۔ اسے ان کمزوریوں کا اندازہ اس وقت ہُوا جب اکیس برس کی عمر میں اس کی شادی ہو گئی۔ اس شہر میں اسے ملازمت مل گئی تھی۔ اس کی برادری لمبی چوڑی تھی۔ بیس اکیس برس کی عمر میں شادی نہ ہو تو برادری باتیں بناتی تھی کہ انہیں کوئی رشتہ نہیں دیتا۔

ناصر شادی کے لئے نہ جسمانی طور پر تیار تھا نہ ذہنی طور پر' لیکن حکم تھا کہ وہ شادی کرے۔ شادی کر کے ناصر نے اشتہاری حکیموں کے پاس جانا شروع کر دیا۔ جس باپ کی پیدا کی ہوئی گھُٹن نے اسے اس حال تک پہنچایا تھا' وہ اب بھی اس پر حکم چلاتا' ڈانٹتا اور طنزیہ لہجے میں بات کرتا تھا۔

میاں بیوی میں کھچاؤ پیدا ہو گیا۔ ناصر نے ڈاکٹر کو صاف الفاظ میں بتایا کہ اس کی بیوی جوان لڑکی تھی' وہ اس سے کسی طرح بھی خوش یا مطمئن نہیں تھی۔ جسمانی کمزوری کے علاوہ ناصر کی جو خامی اس کی بیوی کو بری لگتی تھی' وہ یہ تھی کہ اس میں زندہ دلی کا نام و نشان نہ تھا۔ ہر وقت رُوٹھا ہُوا رہتا اور اس کی زبان سے

صرف شکائتیں ہی نکلتی تھیں۔ وہ بیوی پر حکم چلا کر اپنے آپ کو اس پر غالب کرنے کی کوشش کرتا تھا۔

"ڈاکٹر صاحب!" — ناصر نے ڈاکٹر کو بتایا — "بدکاری کے خیالات ہر وقت مجھ پر غالب رہتے تھے۔ تصوّر فحش اور گندے۔ یہ میرے اوپر آسیب بن کر سوار ہو گئے تھے۔ خیالوں کے لحاظ سے میں بالکل حیوان تھا"۔

یہ ایک قسم کا پاگل پن ہوتا ہے جسے EROTOMANIA کہتے ہیں اور SATYROMANIA بھی۔ اس کا باعث یہ ہوتا ہے کہ انسان ذہنی طور پر یعنی تصوّروں میں لذّت حاصل کرتا رہتا ہے۔

شادی کو دو سال ہو گئے تو ناصر کی ماں اور بہنوں نے اس کی بیوی سے بازپُرس شروع کر دی کہ ابھی تک اس نے بچّہ کیوں نہیں پیدا کیا۔ پہلے پہل بیوی انہیں ٹالتی رہتی' پھر اس نے تنگ آ کر ناصر کی بہنوں سے کہا کہ اپنے بھائی سے پوچھو۔ اس سٹیج پر آ کر اس نفسیاتی کیس میں چار دیواری کی دنیا کے اثرات شامل ہو گئے۔ بہنیں اپنے بھائی کے متعلق یہ سننا گوارا نہ کر سکیں کہ وہ اولاد پیدا کرنے کے قابل نہیں۔ ایک روز بیوی نے ناصر کی ماں کو بھی کہہ دیا کہ اپنے بیٹے کا ڈاکٹری معائنہ کراؤ۔ چار دیواری کی دنیا کی مائیں اپنی بہوؤں کی زبان سے ایسی باتیں کب برداشت کرتی ہیں۔ لہٰذا گھر میں کھچاؤ شروع ہو گیا۔

ناصر کی بیوی میکے جاتی تو جتنے دن کہہ کے جاتی اس سے زیادہ دن گزار کر آتی۔ اس کی ماں نے اسے بھڑکایا اور حوصلہ دیا تو وہ ناصر کو اور اس کی ماں اور بہنوں کو کھری کھری سنانے لگی۔ ناصر نے اسے دبانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ بیوی کی آنکھ سے آنکھ ملانے کے قابل نہیں تھا۔

شادی کا چوتھا سال پورا ہونے والا تھا کہ ناصر کی بیوی میکے گئی اور ناصر کے بلانے کے باوجود نہ آئی۔ وہ خود لینے گیا تو اس کی ساس نے اس کی بے عزتی کر دی۔ بیوی نے اس کے ساتھ آنے سے انکار کر دیا۔ ناصر کے باپ نے ڈکٹیٹرشپ چلائی اور ناصر کو حکم دیا کہ وہ اپنی بیوی سے کہے کہ وہ نہیں آئے گی تو اسے طلاق دے دی جائے گی۔

ناصر نے کسی کے ہاتھ بیوی کو رقعہ لکھ کر بھیجا اور اس میں طلاق کی دھمکی لکھی۔ اس کا بیوی کے باپ کی طرف سے جواب آیا کہ طلاق دے دو۔ بیوی نے ناصر کو الگ رُقعہ بھیجا جس میں اس نے لکھا تھا کہ تم تو مرد ہی نہیں ہو۔ اس کے علاوہ بھی اس نے ناصر کو ناقابلِ برداشت طعنے لکھے۔

ناصر کے باپ نے طلاق بھیج دی۔ ناصر تو جیسے مر ہی گیا تھا۔ طلاق کے فوراً بعد ناصر کی بیوی اور اس کی ماں نے ہر طرف مشہور کر دیا کہ ناصر اولاد پیدا کرنے کے قابل نہیں۔ اس پروپیگنڈے میں ناصر کی بیوی کے خاندان کی دوسری عورتیں بھی شامل ہو گئیں۔ یہ باتیں مردوں کی محفلوں کا موضوع بن گئیں۔ ناصر اور اس کے خاندان کی بہت رسوائی ہوئی۔

ناصر کو ماں باپ نے، بہنوں اور بڑے بھائی نے کہنا شروع کر دیا کہ وہ فوراً دوسری شادی کرے اور لوگوں کو دکھا دے کہ وہ اولاد پیدا کر سکتا ہے اور یہ کہ نقص اس کی بیوی میں تھا۔

"میں دوسری شادی نہیں کرنا چاہتا تھا" ـــــ ناصر نے ڈاکٹر کو بتایا ـــــ "میں تو کہتا تھا کہ خودکشی کر لوں۔ میں شادی کے قابل تھا ہی نہیں لیکن باپ کے حکم کو ٹالنا میرے لئے بہت مشکل تھا"۔

مخالف خاندان کا پروپیگنڈہ اتنا پُر اثر ثابت ہُوا کہ برادری میں کوئی بھی خاندان ناصر کو لڑکی دینے پر تیار نہ ہُوا۔ یہ بڑی بے عزتی والی بات تھی۔ طلاق دیئے چھ سات مہینے گزر گئے تھے۔ ناصر کی پہلی بیوی نے دوسری شادی کر لی تھی۔ تین چار مہینے مزید گزرے تو ناصر کو خبر ملی، بلکہ اس تک خبر پہنچائی گئی کہ اس کی پہلی بیوی ماں بننے والی ہے۔ یہ خبر پھیلنے لگی اور ناصر کے خلاف ایک بار پھر پہلے والا پروپیگنڈہ ہونے لگا۔

ناصر کی برادری میں ایک گھرانہ غریب سا تھا۔ وہاں چار بہنیں تھیں۔ بڑی دو شادی کے قابل ہو گئی تھیں لیکن برادری والے اس وجہ سے اس گھر سے رشتہ نہیں مانگتے تھے کہ وہاں سے جہیز ملنے کی توقع نہیں تھی حالانکہ بڑی بہن خوبصورت

لڑکی تھی۔ اس دوران پاکستان معرضِ وجود میں آگیا۔ ناصر جیسے بہت سارے سرکاری ملازموں کی قسمت اس طرح جاگ پڑی کہ سرکاری دفتروں میں نیچے سے اوپر کے درجوں تک ہندو اور سکھ ملازم تھے۔ وہ ہندوستان چلے گئے تو ان کی جگہیں اس طرح پر کی گئیں کہ بعض سینئر کلرکوں کو افسر بنا دیا گیا۔ ناصر کو بھی اُسی طرح ترقی مل گئی۔

"سچی بات ہے ڈاکٹر صاحب!" ـــــ ناصر نے ڈاکٹر کو بتایا ـــــ "مجھ میں اخلاق اور کردار تو تھا ہی نہیں۔ مسلمانوں کی سیاسی سرگرمیوں اور پاکستان حاصل کرنے کی جدّوجُہد کے ساتھ میں نے ذرا سا بھی تعلق اور واسطہ نہیں رکھا تھا۔ میں اپنے تصوّروں کی دنیا کا آدمی تھا۔ مجھے جب اسی محکمے میں جہاں میں کلرک تھا گزیٹیڈ آفیسر کلاس ٹُو بنا دیا گیا تو مجھے خیال آیا کہ یہاں تو اوپر کی آمدنی بھی ہوتی ہے۔ میں نے اس آمدنی میں بھی ہاتھ مارنا شروع کر دیا۔ اسی دوران میرا باپ فوت ہو گیا..... ایک روز اطلاع ملی کہ میری پہلی بیوی کا لڑکا پیدا ہُوا ہے۔ میرے دل پر ایسی چوٹ پڑی کہ اپنے سامنے ہر چیز گھومتی ہوئی نظر آنے لگی"۔

اس کی پہلی بیوی کے خاندان کی عورتوں نے ناصر کے گھر کی عورتوں تک ایسے ایسے طعنے پہنچائے کہ وہ جل بُھن گئیں۔ وہ ناصر کے پیچھے پڑ گئیں کہ وہ شادی کرے اور بچّہ پیدا کر کے دکھا دے۔ ناصر نے ڈاکٹر کو بتایا کہ اسے احساس تھا کہ وہ بچّہ پیدا نہیں کر سکے گا اور اسے دوسری شادی نہیں کرنی چاہئے لیکن جس انسان کی شخصیّت ہوتی ہی نہیں یا ناصر کی طرح بہت ہی کمزور ہوتی ہے اسے اپنی اَنا کا بہت ہی خیال رہتا ہے۔ ایسے انسان حسّاس ہوتے ہیں۔ ان کی ذہنی حالت بارود کی طرح ہوتی ہے۔ ذرا چنگاری قریب جائے تو بارود پھٹ جاتا ہے۔ یہی نفسیاتی حالت ناصر کی تھی۔ اس نے پکا ارادہ کر لیا کہ دوسری شادی کرے گا۔

اس نے اس غریب گھرانے کی بڑی لڑکی کا رشتہ اس طرح حاصل کر لیا کہ رشوت کی آمدنی سے لڑکی کے ماں باپ کو کچھ رقم دی اور جہیز کی مکمل رعایت دے دی۔ شادی اس طرح کی کہ گھر کے تین چار افراد کو ساتھ لے جا کر نکاح پڑھوایا اور دلہن کو لے آیا۔ ناصر کے کہنے کے مطابق، غریب گھر کی لڑکی روپے پیسے والے گھر

آکر مرعوب ہوئی لیکن وہ بحیثیت خاوند اپنا رعب نہ جما سکا۔ اس میں یہ تبدیلی ضرور آئی کہ پہلی بیوی پر وہ اپنے باپ کی طرح ڈانٹ ڈپٹ اور حکم دینے کے انداز سے اپنی مردانگی کا رعب جمانے کی کوشش کرتا تھا مگر دوسری بیوی کے آگے وہ سر جُھکا کر رکھنے لگا۔

اپنی کمزوریوں کو چھپانے کے لئے یا اپنی کمزوریوں کا ہرجانہ دینے کے لئے اس نے بیوی کو قیمتی کپڑے پہنانے شروع کر دیئے اور اسے زیورات سے لاد دیا۔ حرام کی آمدنی سے اس نے غریب گھرانے کی لڑکی کو شہزادی بنا دیا۔ اس کا برقعہ اتروایا دیا اور اسے پکچروں کا عادی بنا دیا۔ اس کے دو اثرات ہوئے۔ ایک یہ کہ لڑکی کا گھریلو پن ختم ہو گیا۔ وہ گھر کا کام کاج کرتی ہی نہیں تھی۔ دوسرا اثر یہ کہ وہ بن ٹھن کر رہنے اور سیر سپاٹے کی عادی ہو گئی۔

تھوڑے ہی عرصے میں تیسرا اثر بھی سامنے آنے لگا۔ لڑکی اپنی فطرتی ضرورت سے آزاد نہیں رہ سکتی تھی۔ اس نے مجبور ہو کر ناصر کو پہلے اشاروں میں پھر صاف الفاظ میں بتایا کہ وہ اپنا علاج کرائے۔ ناصر طاقت کے انجکشن اور وقتی اثر والی دوائیاں لیتا ہی رہتا تھا۔ ان دوائیوں کے بُرے اثرات بھی ہوتے ہیں جو ناصر کے جسم کو کھا رہے تھے۔

نوبت یہاں تک پہنچی کہ اس بیوی کا رویہ بھی پہلی بیوی جیسا ہو گیا۔ ناصر نے اس کی منت سماجت کی کہ وہ اس پر پردہ ڈالے رکھے' ورنہ برادری میں اور لوگوں میں اس کی بہت بے عزتی ہو گی۔

اس کی بے عزتی تو ہو ہی رہی تھی۔ شادی کو دو سال ہو گئے تھے۔ اس کی پہلی بیوی ایک اور بچے کی ماں بن چکی تھی۔ لوگوں کی توجہ ناصر پر تھی یا نہیں' وہ محسوس کرتا تھا کہ سب لوگ اس پر نظریں جمائے ہوئے ہیں کہ اس کی دوسری بیوی سے بھی بچہ پیدا ہوتا ہے یا نہیں۔ اس کی پہلی بیوی کا دوسرا بچہ پیدا ہُوا تو ناصر کو دوسری کاری ضرب لگی۔ احساس کمتری کا شکار تو وہ پہلے ہی تھا' پھر وہ ایک اور نفسیاتی مرض میں مبتلا ہو گیا جسے ہم PERSECUTION MANIA کہتے ہیں۔ اس کا مریض یہ سمجھتا ہے کہ دنیا کا ہر شخص اس پر انگلیاں اٹھا رہا ہے اور اس

کا مذاق اُڑا رہا ہے۔ اگر کوئی کسی کے مذاق پر ہنسے اور اسے مریض دیکھ لے تو وہ سمجھتا ہے کہ یہ شخص اس پر ہنس رہا ہے۔

ایک تو ناصر میں یہ نفسیاتی نقص پیدا ہو چکا تھا' دوسرے یہ حقیقت بھی تھی کہ اس کی پہلی بیوی کے لواحقین اسے بڑے گندے الفاظ میں بدنام کر رہے تھے۔ اس کی اپنی شخصیت ریت کی بنی ہوئی تھی۔ تیز ہوا چلی تھی تو ریت اُڑنے لگتی تھی۔ اس نے اپنی بیوی سے کئی بار کہا ــــ "مجھے صرف ایک بچّہ چاہئے۔ پھر دشمنوں کے منہ بند ہو جائیں گے"۔

ناصر زندہ دل نہیں تھا۔ ایسے آدمی کے دوست نہیں ہُوا کرتے لیکن اس کے پاس حرام کے پیسے کی کمی نہیں تھی۔ اس سے وہ ملنے جلنے والوں کو کھلاتا پلاتا تھا۔ اس طرح اس نے کھانے پینے والے تین چار دوست بنا رکھے تھے۔ ان میں سے کوئی نہ کوئی دوسرے چوتھے روز اس کے گھر بھی آ جاتا تھا۔ ناصر اب الگ مکان میں رہتا تھا۔ اس کی ماں اس کے بڑے بھائی کے ساتھ رہتی تھی۔

ایک روز ناصر کے گھر اس کا ایک دوست آیا۔ اس کی بیوی نے چائے وغیرہ بنا کے رکھی۔ ناصر نے چونک کر کہا کہ اسے سرکاری کام کے سلسلے میں ایک جگہ جانا تھا۔ اس نے دوست سے کہا کہ وہ اس کی بیوی کے پاس بیٹھے اور چائے پی کر جائے۔ اس طرح وہ اپنی بیوی کو اپنے دوست کے پاس بٹھا کر چلا گیا اور کم و بیش تین گھنٹوں بعد واپس آیا۔ اس روز کے بعد ناصر نے یہی وطیرہ اختیار کر لیا کہ اس کا کوئی دوست گھر آتا تو ناصر کو اچانک کوئی کام یاد آ جاتا اور وہ بیوی کو دوست کے پاس بٹھا کر گھر سے نکل جاتا۔ پھر اس نے بیوی کو دوستوں کے گھروں میں لے جانا شروع کیا اور پھر اسے اکیلے دوستوں کے گھروں میں جانے کو کہنے لگا۔

یہ ذرا عجیب سا معلوم ہوتا ہے کہ جس لڑکی کو غربت سے نکال کر شہزادی بنایا گیا اور اسے مردوں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کی آزادی دی گئی' اس نے اپنا چال چلن ٹھیک رکھا۔ اس نے ناصر سے کہا کہ وہ اس کے دوستوں کے ساتھ اکیلے بیٹھنا پسند نہیں کرتی۔ ناصر نے اسے کہا کہ اسے پسند کرنا چاہئے۔ اس نے بیوی سے یہ بھی کہا کہ وہ اسے ماڈرن بنانا چاہتا ہے۔

ایک سال اور گزرا تو بیوی نے ناصر کو بتایا کہ وہ ماں بننے والی ہے، لیکن (جیسا کہ ناصر نے ڈاکٹر کو بتایا) بیوی خوش نہیں تھی۔ ناصر نے اپنے متعلق نہ بتایا کہ اس کا ردِ عمل کیا تھا۔

وہ وقت آیا کہ بچّہ پیدا ہُوا۔ وہ لڑکا تھا۔ اس موقعہ پر ناصر کی ماں اور ایک شادی شدہ بہن اس کے گھر آگئی تھیں۔ بہت خوشیاں منائی گئیں۔ ناصر نے عملی طور پر سب کو بتا دیا تھا کہ وہ بچّہ پیدا کر سکتا ہے۔ اس نے دشمنوں کے منہ بند کر دیئے تھے۔

بچہ جب دو اڑھائی مہینے کا ہو گیا تو ناصر کی بیوی اپنے ماں باپ کے ہاں چلی گئی۔ پہلے اس نے کہا کہ وہ ایک مہینہ میکے رہے گی لیکن مہینہ گزر جانے کے باوجود بھی وہ نہ آئی۔ ناصر نے اسے اپنے گھر لانے کی ضد نہ کی۔

"میں چاہتا تھا وہ جتنا عرصہ اپنے ماں باپ کے پاس رہنا چاہتی ہے، رہے" —— ناصر نے ڈاکٹر کو بتایا —— "میں اپنے تصوّروں میں مگن رہتا تھا۔ ہر بار میرے تصوّروں میں نئی عورت آتی تھی۔ میں بازاری عورتوں کے پاس بھی چلا جاتا اور پیسے لٹاتا تھا۔ میرے ذہن میں اس کے سوا اور کچھ تھا ہی نہیں"۔

تین مہینے اور گزر گئے تو ایک رات بیوی ناصر کے گھر آئی۔ بچّہ اس کے ساتھ نہیں تھا۔ اس کے تیور بدلے ہوئے تھے۔ اس نے ناصر کے ساتھ بڑی تچّی اور صاف باتیں کیں۔ مجھے جس طرح یہ باتیں سنائی گئی تھیں، اگر میں نے اس طرح سنائیں تو لمبی ہو جائیں گی۔ میں موٹی موٹی باتیں اُسی کی زبان سے سنا دیتا ہوں۔

"میں نے تمہیں بچّہ دے دیا ہے" —— بیوی نے ناصر سے کہا —— "اس کے بدلے تم مجھے طلاق دے دو۔ میں نے تمہارے ساتھ یہ عرصہ اس لئے گزارا ہے کہ تم نے میرے ماں باپ کی غربت پر رحم کیا اور بغیر جہیز کے مجھے قبول کر لیا۔ تم نے انہیں پیسے بھی دیئے، پھر تم نے مجھے اجازت دی کہ میں اپنے ماں باپ کی مالی مدد کرتی رہا کروں، پھر تم نے مجھے بڑا اونچا درجہ دیا اور مجھے بیگم بنا دیا، لیکن میرے لئے یہی کافی نہیں تھا۔ میں انسان ہوں۔ عورت ہوں۔ میں ماں بننا چاہتی تھی مگر تم اپنے آپ کو جانتے ہو.....

"میں شاید اپنے ان جذبات کو مار دیتی اور تمہارا ساتھ کبھی نہ چھوڑتی لیکن تم نے ایک ایسا طریقہ اختیار کر لیا جسے کوئی باعصمت عورت برداشت نہیں کر سکتی۔ تم اپنے کسی نہ کسی دوست کو میرے پاس بٹھا کر خود کسی کام کے بہانے باہر چلے جاتے تھے۔ پہلے پہل میں یہی سمجھی کہ تمہیں واقعی کوئی ضروری کام یاد آگیا ہے لیکن تم نے اسے ایک عادت بنا لیا اور اس کے ساتھ مجھے یہ کہا کہ تمہیں ایک بچّہ چاہیئے تاکہ تم دشمنوں کے منہ بند کر سکو تو میرے کان کھڑے ہوئے۔ مجھے شک ہُوا کہ تم میرا حوصلہ بڑھا رہے ہو کہ میں تمہارے کسی دوست کے ساتھ تعلقات پیدا کر لوں اور ایک بچّہ پیدا کروں"۔

"ڈاکٹر صاحب!" —— ناصر نے ڈاکٹر کو بتایا —— "آپ سمجھتے ہوں گے کہ میری بیوی نے مجھ پر بڑا ذلیل الزام لگایا ہے..... یہ الزام نہیں تھا ڈاکٹر صاحب! اس کا شک بالکل صحیح تھا۔ میں اسی لئے اپنی بیوی کو کسی نہ کسی دوست کے پاس تنہا بٹھا دیتا تھا کہ وہ ایک بچّہ پیدا کر دے"۔

قارئین شاید اسے سچ نہیں مانیں گے کہ کوئی خاوند بے غیرتی کی اس حد تک بھی پہنچ سکتا ہے لیکن انسانی نفسیات اس سے بھی زیادہ بے غیرتی کو سچ مانتی ہے۔ ناصر پاگل پن کی حدود میں داخل ہو چکا تھا۔ اسے MORAL INSANITY کہتے ہیں اور PATHOMANIA بھی۔ اس ذہنی تباہی میں مریض کو اخلاقی اور بداخلاقی، غیرت مندی اور بے غیرتی کی تمیز نہیں رہتی۔ یہ ذہن پر جنسیّت کو سوار کیے رکھنے کا نتیجہ تھا۔

اس رات ناصر کو اُس کی بیوی نے جو کھری کھری باتیں سنائیں، وہ مختصراً اس طرح ہیں۔ جیسا ناصر تھا ویسے ہی اس کے دوست تھے۔ وہ تین چار تھے۔ ہر ایک نے ناصر کی بیوی کے ساتھ غلط قسم کی بے تکلفی پیدا کرنے کی کوشش کی لیکن اس جوان لڑکی نے کسی کو بھی جائز بے تکلفی سے آگے نہ بڑھنے دیا۔ اس نے کئی بار ارادہ کیا کہ ناصر کو بتا دے، لیکن وہ ناصر کی نیّت کو سمجھ گئی اور اس کے دوستوں سے اپنا دامن بچاتی رہی۔

آخر ناصر کے ایک دوست کا جادو چل گیا۔ اس نے ناصر کی بیوی کے ساتھ

تعلقات پیدا کرلئے۔ ناصر نے ڈاکٹر کو بتایا کہ اس کا یہ دوست بدمعاش اور زندہ دل آدمی ہے۔ ناصر کی بیوی نے جو بچّہ پیدا کیا تھا وہ اس کے اس دوست کا بچّہ تھا۔

"میں نے تمہیں بچہ دے کر تمہارے دشمنوں کا منہ بند کردیا ہے" ــــ بیوی نے ناصر سے کہا ــــ "تمہاری عزت بچ گئی ہے۔ میں کل بچّہ تمہارے حوالے کر دوں گی۔ مجھے طلاق دے دو۔ میں اب اس آدمی کی بیوی بن کے رہوں گی جو میرے قابل ہے اور میرے دل کو اچھا لگا ہے۔ وہ اس بچّے کا باپ ہے۔ اگر تم طلاق نہیں دو گے تو تمہاری جو ذرا سی عزت رہ گئی ہے وہ بھی ختم ہو جائے گی۔ میں تمہارا پول کھول دوں گی"۔

ناصر کی بیوی کو معلوم تھا کہ ناصر بڑا کمزور انسان ہے۔ اس میں جرأت اور مردانگی کا نام و نشان نہیں' اس لئے وہ دلیری سے اسے دھمکیاں دے رہی تھی۔ ناصر سوائے منت سماجت کے کر ہی کیا سکتا تھا۔ وہ اس نے کی مگر بیوی نے طلاق کی ضد نہ چھوڑی۔ دوسرے دن ناصر کی بیوی کی ایک خالہ بچہ ناصر کے حوالے کر گئی۔ ناصر نے اپنی ماں کو جا کر بتایا۔ بھوؤں کو بتایا۔ وہ بہت حیران ہوئیں کہ بچّہ پیدا ہونے کے بعد ناصر کی بیوی کو کیا ہو گیا ہے۔

ناصر نے اصل بات پوشیدہ رکھی اور بیوی کو تحریری طلاق بھیج دی۔ وہ الگ مکان سے اپنے بڑے بھائی کے گھر چلا گیا۔ اس کی ماں اور بھاوج نے بچّے کو سنبھال لیا اور بچّے کی ماں کے خلاف پروپیگنڈہ شروع کر دیا کہ وہ بدچلن تھی۔

"ڈاکٹر صاحب!" ــــ ناصر نے ڈاکٹر کو بتایا ــــ "میری نیند اُس وقت کم ہونی شروع ہو گئی تھی۔ میرے ضمیر پر ایک ایسے گناہ کا بوجھ پڑ گیا جس کا ذکر آج پہلی دفعہ آپ کے ساتھ کر رہا ہوں۔ پانچ چھ روز بعد مجھے پتہ چلا کہ میری دوسری بیوی گھر سے غائب ہو گئی ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ اپنے بچّے کے باپ کے ساتھ چلی گئی ہو گی۔ وہ شخص شادی شدہ تھا۔ میں نے ویسے ہی اس کا پتہ کرایا تو معلوم ہُوا کہ وہ بھی کہیں گیا ہُوا ہے۔ پندرہ بیس روز بعد وہ واپس آ گیا۔ میں اُسے اپنا مجرم نہیں سمجھتا تھا۔ میں نے خود ہی موقع دیا تھا کہ وہ جرم کرے لیکن وہ مجھ سے دُور دُور رہنے لگا۔ میں نے بھی اس کے ساتھ قطع تعلق کر لیا.....

"اب میں اسی خبر کے انتظار میں تھا کہ اس نے میری دوسری بیوی کے ساتھ شادی کر لی ہے لیکن خبر یہ ملی کہ میری بیوی اپنے گھر پہنچ گئی ہے۔ اس کے بعد لوگوں کی زبانی سنا کہ اپنے کسی آشنا کے ساتھ چلی گئی تھی اور عیش و عشرت کر کے واپس آ گئی ہے۔ پہلے اس گھر سے برادری والے اس لئے رشتہ نہیں لیتے تھے کہ وہاں سے جہیز نہیں ملے گا اور اب میری دوسری بیوی نے اپنے خاندان کے منہ پر ایسی کالک مل دی کہ جس کسی کے دل میں اس گھر سے رشتہ لینے کا خیال تھا وہ بھی پیچھے ہٹ گیا"۔

ناصر کو اپنی بیوی کے بچّے کے ساتھ ذرا سا بھی لگاؤ نہیں تھا۔ اس کے گھر والے اس بچے کو اسی کا بچّہ سمجھتے تھے۔ وہ حیران ہوتے تھے کہ ناصر کو بچّے کے ساتھ پیار نہیں۔ ناصر پہلے ہی نفسیاتی مریض تھا۔ اب ایک انتہائی گھناؤنے گناہ کے احساس نے اسے پاگل بنانا شروع کر دیا۔ ڈیڑھ ایک سال گزرا تو مشہور ہونے لگا کہ ناصر کی دوسری بیوی باقاعدہ عصمت فروش تو نہیں بنی لیکن پردے پردے میں یہ اس کا پیشہ بن گیا ہے۔ ناصر کے دوست نے اسے کہیں لے جا کر خراب کیا اور اسے شادی سے صاف جواب دے دیا۔ وہ آخر پسماندہ خاندان کی لڑکی تھی۔ ناصر نے اسے بہت اونچا چڑھا دیا تھا مگر وہ پھر تنگ دستی اور پسماندگی والے ماحول میں چلی گئی۔ اس کا بھٹک جانا عین قدرتی تھا۔

"ڈاکٹر صاحب!" ــــ ناصر نے ڈاکٹر کو بتایا ــــ "میرے ضمیر پر پہلے ہی گناہوں کا بوجھ تھا۔ اب مجھے یہ گناہ پریشان کرنے لگا کہ اپنی دوسری بیوی کو اس اخلاقی تباہی میں مَیں نے پھینکا ہے"۔

یہ تمام عناصر جو میں بیان کر چکی ہوں ناصر کو پاگل پن تک پہنچانے کے لئے کافی تھے۔ اس کی نیند بالکل ختم ہو گئی اور وہ بڑی تلخ بے چینی سے دوچار رہنے لگا۔ ڈاکٹر نے اسے نیند کی گولیاں دی تھیں جن سے اسے نیند تو آ جاتی تھی لیکن وہ نیند میں چلتا پھرتا تھا۔ اس نے ڈاکٹر کو بتایا کہ خواب میں وہ یہی دیکھتا ہے کہ وہ بڑے ڈراؤنے سے ویرانے میں چلا رہا ہے۔

ڈاکٹر پر یہ کیس واضح ہو چکا تھا لیکن یہ کیس فزیشن کا نہیں تھا پھر بھی ڈاکٹر نے

اسے بتایا کہ وہ اپنی ذات کے بکھرے ہوئے ٹکڑے اکٹھے کرنے کی کوشش کرے۔ ڈاکٹر نے اسے یہ علاج بھی بتایا کہ وہ اپنی دوسری بیوی کو پھر نکاح میں لے لے اور اپنے گناہوں کا ازالہ کرے۔ ڈاکٹر نے یہ کہہ تو دیا لیکن وہ جانتا تھا کہ یہ نفسیات کے ڈاکٹر کا کیس ہے جو سائیکو تھراپی سے ہی ٹھیک ہو سکتا ہے۔ ہمارے ملک میں یہ طریقہ علاج نہ ہونے کے برابر ہے۔ ڈاکٹر نے اسے زیادہ طاقت والی مسکن گولیاں دے دیں اور اس کے بڑے بھائی کو بتایا کہ اسے ذہنی امراض کے کسی ڈاکٹر کے پاس لے جائے۔

کوئی ایک مہینہ گزرا ہو گا کہ ناصر کا بڑا بھائی ڈاکٹر کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ ناصر ایسی گہری نیند سو گیا ہے جس سے کبھی کوئی نہیں جاگا۔ یہ حادثہ یوں ہُوا کہ ناصر کو نیند میں چلنے کا مرض تھا۔ وہ نیند ہی میں کہیں باہر نکل گیا۔ گھر والے اس پر نظر تو رکھتے تھے لیکن اس رات کسی کی آنکھ نہ کھل سکی۔ صبح کسی نے انہیں اطلاع دی کہ ناصر کی لاش سڑک پر پڑی ہے۔ جا کر دیکھا تو صاف پتہ لگتا تھا کہ کوئی کار یا ٹرک یا کوئی گاڑی اُسے کچل گئی ہے۔

❖

درد کا رشتہ

عورتوں کی کہانیاں آپ "چار دیواری کی دنیا" کے عنوان سے سناتے رہتے ہیں۔ ان میں ہر کہانی کسی ایک عورت یا کسی ایک چار دیواری کی کہانی نہیں ہوتی۔ یہ ہر گھر کی کہانیاں ہیں اور یہ سارے معاشرے کی کہانیاں ہیں۔ آپ کی ان کہانیوں کو اسی لئے ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا ہے کہ ہر شخص کو ان کہانیوں میں اپنی ہی تصویر نظر آتی ہے۔

میں آپ کو ایک عورت کی کہانی سنا رہی ہوں۔ یہ صرف چار دیواری کی کہانی نہیں' جذبات اور جذبے کی دل میں اتر جانے والی داستان ہے۔ میں نے جب یہ کہانی سنی تھی اُس وقت میری عمر صرف بارہ تیرہ برس تھی۔ اُس وقت ملک کے حالات بھی ایسے تھے کہ یہ کہانی میری روح تک اُتر گئی اور میں سر تاپا جذبات کا سلگتا ہُوا انگارہ بن گئی تھی۔ اب میرے سب سے بڑے بیٹے کی عمر اتنی ہی ہے لیکن میرے ان جذبات کو میرے بچّے نہیں سمجھ سکتے۔ میں جب انہیں یہ کہانی سناتی ہوں تو وہ محض اسے وقت گزاری کا بہانہ سمجھ کر سن لیتے ہیں۔ میں ان بچّوں سے مایوس نہیں۔ اگر قوم پر کوئی بُرا وقت آیا تو یہ بچّے بھی جذبات کا دہکتا ہُوا لاوہ بن جائیں گے۔

اس عورت کا نام عذرا ہے۔ بوڑھی ہو چکی ہے اور اس کے بچّے بال بچّوں والے ہیں۔ اس کی شادی پاکستان بننے سے کچھ مہینے پہلے ہوئی تھی۔ یہ ایک طرح سے اس کی پسند کی شادی تھی۔ الطاف جس سے عذرا کی شادی ہوئی تھی' پڑھا لکھا آدمی تھا اور تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد اپنے قصبے میں ہی کاروبار کرتا تھا۔ عذرا بھی میٹرک پاس تھی۔ اس کے قصبے میں لڑکیوں کا کوئی کالج نہیں تھا۔ اگر الطاف اور عذرا میں شادی سے پہلے ایک دوسرے کے لئے پسندیدگی نہ ہوتی تو عذرا یہ

شادی کبھی نہ کرتی کیونکہ اُس وقت ان کے گھر کے حالات ایسے تھے کہ عذرا جیسی لڑکی شادی کے لئے تیار نہ ہوتی۔ عذرا کا بڑا بھائی لاپتہ تھا۔ وہ تحریکِ پاکستان کا کارکن تھا اور اکثر گھر سے باہر رہا کرتا تھا لیکن گھر والوں کو پتہ ہوتا تھا کہ کہاں ہے۔ تحریک کے آخری دنوں میں اسے پولیس نے گرفتار کرلیا اور پھر باوجود کوشش کے اس کا کوئی پتہ نہ چل سکا۔ جہاں جہاں سے سراغ مل سکتا تھا پتہ کیا گیا لیکن عذرا کے بھائی کا کوئی پتہ نہ چلا۔ اس کے ساتھیوں نے اتنا ہی بتایا کہ وہ گرفتار ہو گیا تھا۔ ماں باپ رو پیٹ کر چُپ ہو رہے اور انہوں نے عذرا کے ہاتھ پیلے کر دیئے۔

پاکستان بننے کے فوراً بعد کشمیر میں جنگ شروع ہو گئی۔ یہ جنگ حکومتوں کی باقاعدہ جنگ نہیں تھی بلکہ کشمیر کے مسلمانوں کی ڈوگرہ حکومت اور بھارتی فوج کے خلاف جنگ تھی۔ اس جنگ کے سپاہی وہ رضاکار بھی تھے جو پاکستان میں اپنا گھر بار، دفتر، کاروبار اور تعلیمی ادارے چھوڑ کر کشمیر کی اس جنگ میں کشمیریوں کے شانہ بشانہ لڑنے کے لئے پہنچ گئے تھے۔ ان رضاکاروں میں الطاف بھی شامل تھا۔

عذرا اور اس کے خاوند کو پاکستان بننے کے بعد ہجرت نہیں کرنی پڑی کیونکہ وہ لوگ پہلے ہی اس علاقے میں آباد تھے جو اب پاکستان میں شامل ہے لیکن ملک کے معاملے میں وہ بڑی جوشیلی لڑکی تھی۔ درحقیقت اس کا سارا خاندان ہی ایسا تھا۔ الطاف اور عذرا کی پسندیدگی کی وجہ بھی یہی تھی کہ الطاف بڑھ چڑھ کر آزادی کی تحریک میں حصّہ لے رہا تھا۔

پاکستان بننے کے تھوڑے ہی عرصہ بعد جب کشمیر کی جنگ ابھی جاری تھی، عذرا کا بھائی واپس آ گیا۔ عذرا کو جب بھائی کے واپس آنے کا پتہ چلا تو وہ بہت خوش ہوئی لیکن جب اس نے اپنے بھائی کو دیکھا تو اداس ہو گئی۔ اس کے بھائی کا بایاں بازو بالکل خشک ہو کر اکڑ گیا تھا۔ اس کے بھائی نے بتایا کہ پولیس نے اس پر بہت تشدد کیا اور اسی تشدد کے نتیجے میں اس کے بازو کی کوئی نس مُردہ ہو گئی جس سے بازو اکڑ گیا اور عذرا کا بھائی معذور ہو گیا۔ وہ اپنے شہر سے کوئی ڈیڑھ سو میل دور ایک شہر کی جیل سے رہا ہوا تھا۔ تحریکِ پاکستان کے زمانے میں پولیس انگریزوں کا اقتدار بحال رکھنے کے لئے بے پناہ تشدد کیا کرتی تھی۔ سیاسی مخالفین پر تشدد ہی پولیس کی

اصل ڈیوٹی تھی۔ میرے ابّو بتاتے ہیں کہ پولیس کی اس ڈیوٹی میں پاکستان بننے کے بعد کوئی تبدیلی نہیں آئی۔

عذرا کو اپنے اس بھائی سے بہت پیار تھا۔ وہ فخر کیا کرتی تھی کہ اس کا بھائی تحریکِ پاکستان کے لئے گرفتار ہوا ہے۔ وہ چاہتی تھی کہ اُس کی شادی کے موقع پر اس کا بھائی بھی اس کے پاس ہو لیکن وہ پوچھنے والوں سے اکثر کہا کرتی تھی —— "مجھے اس کا کوئی غم نہیں کہ میرا بھائی شادی میں شریک نہیں۔ وہ اس سے بھی اعلیٰ مقصد پورا کرنے کے لئے گیا ہُوا ہے"۔

اس کی یہ بھی خواہش تھی کہ اُس کا بھائی جہاد کشمیر میں بھی شریک ہو لیکن جب اس نے دیکھا کہ اس کے بھائی نے ایک اعلیٰ مقصد کے حصول کے لئے کیا قربانی دی ہے تو وہ اداس ہو گئی۔

ایک رات عذرا نے خواب دیکھا کہ بڑے زور کا طوفان ہے۔ آندھی اتنی شدید کہ اس کے کمرے کی چھت بھی اُڑ گئی اور پچھلی دیوار بھی گر گئی اور تیز ہوا اس کا دوپٹہ اُڑا کر دُور لے گئی۔ عذرا اس خواب کے بعد پریشان رہنے لگی۔ وہ الطاف کے بارے میں فکر مند تھی۔ اتنے میں کشمیر کی جنگ ختم ہو گئی اور رضاکار واپس آنے شروع ہو گئے لیکن الطاف لوٹ کر نہ آیا۔ عذرا کے سسر اور والد نے اس کی تلاش شروع کر دی لیکن اس کا کچھ پتہ نہ چلا۔ تقریباً چھ ماہ بعد اس کے دو ساتھیوں نے آ کر بتایا کہ الطاف شہید ہو گیا تھا۔ بھارتی فضائیہ کی فائرنگ سے بہت سے رضاکار اور دو تین فوجی شہید ہو گئے تھے۔ الطاف بھی ان میں شامل تھا۔ عذرا نے اس خبر پر یقین نہ کیا۔ اس نے سب سے کہا کہ الطاف ضرور واپس آئے گا۔ وہ زندہ ہے۔ الطاف کے ساتھی رضاکاروں نے یہ بھی بتایا تھا کہ تمام شہیدوں کو مقبوضہ کشمیر کے لوگوں نے دفن کر دیا تھا —— تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ الطاف کی شہادت کی سرکاری اطلاع بھی آ گئی —— اب عذرا شہید کی بیوہ تھی۔

اس اطلاع نے عذرا پر سکتہ طاری کر دیا۔ گھر میں ماتم برپا ہو گیا۔ عورتوں کی آہ و بکا سے آسمان بھی لرز اٹھا لیکن عذرا خاموش تھی۔ اس کے چہرے پر کسی قسم کا کوئی تاثر نہ تھا۔

ایک روز عذرا نے اچانک قہقہہ لگایا۔ گھر والوں نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا۔ عذرا نے ہنستے ہوئے سب سے کہا ——"الطاف نے تم سب کو خوب بیوقوف بنایا ہے۔ وہ زندہ ہے۔ آؤ دکھاؤں"۔

وہ سب کو کمرے میں لے گئی اور الطاف کی تصویر کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگی ——"وہ بیٹھا ہے الطاف" —— پھر تصویر سے مخاطب ہو کر بولی ——"الطاف! تم اتنی دیر سے کیوں آئے ہو؟ دیکھو سب نے تمہیں مُردہ سمجھ لیا ہے۔ لوگ تمہیں رو رہے ہیں اور تم کمرے میں چھپ کر بیٹھے ہو۔ چلو باہر چلو۔ لوگوں کو اپنی صورت تو دکھاؤ" —— وہ الطاف کی تصویر کے ساتھ باتیں کرنے لگی۔ یہ منظر اتنا دلدوز تھا کہ عورتوں کی چیخیں نکل گئیں۔

محلّے کی کوئی عورت عذرا کے گھر اظہارِ افسوس کے لئے آتی تو عذرا اس کے بولنے سے پہلے ہی کہہ دیتی ——"الطاف کشمیر سے آ گیا تھا۔ مال لینے کراچی چلا گیا ہے" —— وہ الطاف کے نام بڑے طویل خط لکھ کر سسر کو دیتی اور کہتی کی لیٹر بکس میں ڈال دینا۔ بعد میں پتہ چلا کہ سسر یہ خط باہر لے جا کر پھاڑ دیا کرتا پوسٹ نہیں کرتا تھا۔ ایک روز عذرا نے سب کو بتایا کہ الطاف کا خط آیا ہے کہ وہ ابھی کچھ عرصہ کراچی میں رکے گا۔ اس نے سب کو خط دکھایا۔ گھر والوں نے دیکھ لیا کہ عذرا کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہُوا خط ہے لیکن سب اُسے یہی کہتے رہے کہ الطاف کا خط ہے۔

بعض اوقات رات کو اس کے کمرے سے باتیں کرنے کی آواز آتی۔ اس کی ساس دروازہ کھول کر دیکھتی تو وہ دیواروں سے باتیں کر رہی ہوتی۔ رات کو بعض دفعہ اس کا کمرہ خالی ہوتا۔ اس کو تلاش کرتے۔ وہ صحن میں بیٹھی ہوتی۔ اس کا منہ آسمان کی طرف ہوتا اور ہونٹ ہل رہے ہوتے تھے۔

عذرا کے ماں باپ اسے اپنے گھر لے جانے کے لئے آئے۔ عذرا نے ان کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ بولی ——"الطاف کو کراچی سے واپس آ لینے دیں۔ ان کے ساتھ ہی آؤں گی" —— ساس اور سسر نے عذرا کی ماں سے کہا کہ اسے یہیں رہنے دیں۔ وہ عذرا کو اپنے شہید بیٹے کی نشانی سمجھتے تھے اور اسے اپنے سینے سے لگا

کر رکھنا چاہتے تھے۔

چند مہینے گزرنے کے بعد عذرا کی ذہنی حالت پاگل پن تک پہنچ گئی۔ اب وہ محلّے کی عورتوں کے لئے تماشہ بن گئی تھی۔ جیسا کہ چار دیواری کی دنیا کا دستور ہے' عورتیں بظاہر اس سے ہمدردی کرنے آتی تھیں لیکن درحقیقت وہ اس کا تماشہ دیکھتی تھیں۔ وہ تماشہ ہی تو تھی کہ خاوند مر گیا تھا اور وہ اکیلی بیٹھی یوں باتیں کرتی تھی جیسے خاوند اس کے پاس بیٹھا ہو۔

ہمارے ہاں نفسیاتی علاج آج بھی ناپید ہے اور اُس وقت تو بالکل ہی اس کا کوئی تصوّر نہیں تھا حالانکہ عذرا کے والد اور سسر پڑھے لکھے لوگ تھے چونکہ یہ علاج باقاعدہ میسّر نہیں تھا اس لئے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ نفسیاتی علاج تو آج بھی نہیں ہوتا۔ بڑے بڑے ماہرینِ نفسیات نفسیاتی طریقۂ علاج کی بجائے مریض کو ذہنی سکون اور نیند کی گولیوں کا عادی بنا دیتے ہیں۔

عذرا کے بارے میں بعض محلے والوں نے کہا کہ اس پر کسی شر شرار کا سایہ ہے۔ انہوں نے عذرا کے ساس سسر کو مشورہ دیا کہ کسی پہنچ والے بزرگ کو دکھاؤ۔ عذرا کی ایک سہیلی نے کہا کہ اس پر شہید کی روح کا سایہ ہے۔ پہنچ والے بزرگ اس کا کچھ نہیں کر سکتے لیکن اس کی کسی نے نہ سنی۔

عذرا کے میکے کی عورتوں نے ایک اور بات مشہور کر دی کہ عذرا کی ساس نے اس پر تعویذ کرا دیئے ہیں تاکہ وہ کسی اور سے شادی نہ کر سکے۔ اس طرح کی افواہیں ہماری چار دیواری کی خصوصی افواہ ساز فیکٹریوں میں راتوں رات تیار ہوتی ہیں۔ ان افواہوں کا توڑ کرنے کے لئے جواب میں الزام تراشی شروع ہوتی ہے اور اس طرح خاندانی جھگڑے شروع ہو جاتے ہیں۔ عذرا جوانی کے آغاز میں ہی بیوہ ہو گئی تھی۔ اس کا دماغی توازن بگڑ چکا تھا۔ اس کی حرکتوں اور باتوں سے شک یہی ہوتا تھا کہ اس پر کوئی آسیبی اثر ہے لیکن حقیقت یہ ہے ہمارے معاشرہ ہی آسیب زدہ ہے اس لئے عذرا جیسی لڑکیوں کے اصل روگ کو کوئی نہیں سمجھتا۔

عذرا کے ماں باپ کوئی جھگڑا مول لینے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ ان کے سر پر آسمان گر پڑا تھا۔ ایک ہی بیٹا تھا۔ وہ اپاہج ہو گیا۔ بیٹی بیوہ ہو کر پاگل ہو گئی۔ اس

غم کے ساتھ یہ پریشانی کہ بیٹی سسرال سے آتی نہیں تھی۔ کہتی تھی کہ اس کا خاوند کراچی سے واپس آئے تو آؤں گی۔ انہوں نے اس کا علاج کرانے کے بہانے اس کے سُسر سے اسے اپنے گھر لے جانے کی درخواست کی۔ سسر راضی ہو گیا۔ ساس نے مخالفت کی لیکن وہ عذرا کو گھر لے آئے۔ عذرا کے والد اور بھائی کا خیال تھا کہ پیر فقیر اور شرا شر سب ڈھکوسلے ہیں۔ لڑکی پر صدمے کا اثر ہے اور اس کا علاج یہی ہے کہ اس کی شادی کر دی جائے۔ ان کا سب سے بڑا مسئلہ بھی یہی تھا۔ عذرا ابھی بیس سال کی ہوئی تھی اور اس کا رشتہ مانگنے والے بھی موجود تھے لیکن عذرا کی ماں نے جب بھی اسے شادی کے لئے کہا اس نے زور دار قہقہہ لگایا اور اچانک سنجیدہ ہو کر چھت کی طرف یوں دیکھنے لگی جیسے چھت پر اپنے قہقہے کو تلاش کر رہی ہو۔

اس کے بعد ماں باپ اور بھائی اس کے پیچھے پڑ گئے کہ تمہارے غم کا علاج دوسری شادی ہے۔ رشتہ عذرا کے لئے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ وہ جوان تھی‘ خوش شکل تھی‘ پڑھی لکھی تھی اور اچھے خاندان کی لڑکی تھی۔ اس کی اپنی برادری میں اس کے لئے ایک سے ایک اچھا رشتہ موجود تھا لیکن ایسی ذہنی حالت میں اسے قائل کرنا بہت مشکل تھا۔ اس کا جواب وہی تھا ــــ قہقہہ لگانا اور سنجیدہ ہو جانا۔

ساری عورتوں نے جب ایک ہی رٹ لگائی تو عذرا کی ماں نے بھی تسلیم کر لیا کہ عذرا پر کسی شر شرار کا اثر ہے یا اس کی ساس نے اس پر تعویذ کرا دیئے ہیں۔ عذرا کی ماں اپنے خاوند اور بیٹے کو بتائے بغیر محلے کے مولوی صاحب کے پاس گئی۔ مولوی صاحب نیک آدمی تھے۔ وہ تھوڑا بہت دین کا علم بھی رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ انہوں نے اپنی روزی کا ایک اور ذریعہ بھی پیدا کر رکھا تھا۔ وہ تھا "کتاب نکالنا"۔ وہ کوئی حساب کتاب کر کے غیب کی باتیں بتا دیا کرتے تھے اور مولوی صاحب شاید خود بھی حیران ہوتے ہوں گے کہ لوگ ان کی باتوں کو سچ مان لیتے تھے۔

مولوی صاحب نے کتاب سے حساب کتاب کیا اور عذرا کی ماں کو بتایا دیا کہ عذرا جادو تعویذ کے زیر اثر ہے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ عذرا پر شیطانی کلام سے تعویذ کئے گئے ہیں۔ انہوں نے شیطانی اثرات کو رفع کرنے کے لئے کوئی وظیفہ بھی

بتایا اور قرآن کی کچھ سورتیں بھی بتائیں کہ پڑھ کر عذرا پر پھونک دی جائیں۔ اس کے ماں باپ نے یہ سب کچھ کیا لیکن کوئی افاقہ نہ ہُوا۔ اُس کے بعد عذرا کو بستی کے قریب ہی ایک پیر صاحب کے پاس لے جایا گیا۔ پیر صاحب نے عذرا کی ماں کو تسلّی دی کہ تشویش کی کوئی بات نہیں۔ بعض روحیں خدا کو پیاری ہوتی ہیں۔ خدا ان روحوں کو زمین سے اٹھاتا نہیں۔ وہ روحیں اللہ کے نیک بندوں میں حلول کر جاتی ہیں۔ عذرا میں بھی کوئی ایسی ہی روح حلول کر گئی ہے۔

عذرا پیر صاحب کو دیکھ کر ہنس ہنس کر دوہری ہو گئی۔ اس نے اتنے قہقہے لگائے کہ سب کو گماں گزرا جیسے وہ پیر صاحب کا مذاق اُڑا رہی ہو۔ پیر صاحب نے کچھ تعویذ دیئے کہ بچّی کے گلے میں ڈال دیں۔ پیر صاحب کے علاج سے بھی کوئی افاقہ نہ ہُوا تو اسے ایک عامل کے پاس لے گئے۔ اس عامل کو دیکھتے ہی عذرا وہاں سے گھر بھاگ آئی۔ عامل نے عذرا کی ماں کو بتایا کہ عذرا پر کسی بد روح کا سایہ ہے۔ اس نے مرچیں دم کر کے دیں کہ عذرا کو ان کی دھونی دی جائے تو بدرُوح بھاگ جائے گی۔ یہ علاج بھی کر کے دیکھا۔ عذرا کو اس سے بھی کوئی افاقہ نہ ہُوا۔

پاکستان بننے کے بعد ہندو اور سکھ بھارت چلے گئے تھے۔ قصبے میں ان کے مکان ابھی تک خالی پڑے تھے۔ مہاجرین جو بھارت سے اپنے نئے وطن آئے تھے ان کی اکثریت ابھی تک ریفیوجی کیمپوں میں پڑی تھی اور کچھ مہاجر ہندوؤں اور سکھوں کے خالی مکانوں میں آباد ہو گئے تھے۔ عذرا کے قصبے میں مشرقی پنجاب کے ایک ہی قصبے کے مہاجر آباد ہوئے۔

ان مہاجرین میں ایک جوان آدمی بھی تھا جس کا نام ابرار تھا۔ جب مہاجرین کو عذرا کے مسئلے کا علم ہُوا تو انہوں نے عذرا کی ماں کو بتایا کہ ابرار کا خاندان مشرقی پنجاب کا مشہور گدی نشین خاندان تھا اور اس خاندان کا ہر فرد "پہنچا ہوا بزرگ" رہا ہے۔ انہوں نے عذرا کی ماں کو مشورہ دیا کہ عذرا کے بارے میں ابرار سے بات کریں۔ نیک آدمی ہے‘ سیّد ذات ہے اور پہنچے ہوئے بزرگوں کی اولاد ہے‘ وہ عذرا کو ضرور ٹھیک کر دے گا۔

عذرا کی ماں ابرار سے ملی۔ ابرار ایک خوش شکل آدمی تھا۔ مشرقی پنجاب میں

اس کے خاندان کی پیری مریدی چلتی تھی لیکن یہاں آکر اس نے یہ سلسلہ شروع نہیں کیا تھا۔ اس کی گفتگو میں بہت اثر تھا۔ نظروں سے ذہین آدمی لگتا تھا۔ عذرا کی ماں اس سے متاثر ہو گئی۔

اس نے ابرار کو عذرا کا سارا پس منظر سمجھایا کہ کیسے عذرا پاکستان کے لئے دیوانی تھی۔ کیسے اس کا بھائی لاپتہ ہُوا اور پاکستان کی خاطر معذور ہو کر گھر پہنچا اور کیسے اس نے اب اپنے سہاگ کی قربانی دی ہے۔ ان پے در پے صدموں سے اب اس کا دماغ اُلٹ گیا ہے۔ اس نے ابرار کو یہ بھی بتایا کہ عذرا کی اس ذہنی کیفیت کی وجہ سے اس کی شادی بھی ممکن نہیں حالانکہ رشتے موجود ہیں۔

ابرار نے عذرا کی ماں کو دلاسہ دیا کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ وہ عذرا کو ٹھیک کر لے گا۔ اس نے کہا کہ عذرا کو میرے پاس اکیلا بھیج دیں۔

ابرار اکیلا رہتا تھا۔ عذرا کی ماں عذرا کو اکیلا بھیجنے سے گھبرائی۔ اسے ابرار پر پورا یقین تھا لیکن عذرا کے باپ اور بھائی سے ڈرتی تھی کہ اگر ان کو پتہ چل گیا تو باپ بیٹا طوفان کھڑا کر دیں گے۔ پھر بھی اس نے جرأت سے کام لیا اور عذرا کو ابرار کے پاس بھیج دیا۔

پہلے روز جب عذرا کو ابرار کے پاس جانے کو کہا گیا تو اس کا جواب وہی تھا۔ قہقہہ اور یک دم سنجیدگی۔ واپس آئی تو اس کی دماغی حالت وہی تھی۔ دو تین روز تک یہی کیفیت رہی۔ عذرا کو زبردستی ابرار کے پاس بھیجنا پڑتا تھا۔ عذرا کی ماں ابرار سے بھی مایوس ہو گئی۔

ایک روز یوں ہُوا کہ عذرا کو ابرار کے پاس جانے کو کہا گیا تو اُس نے نہ قہقہہ لگایا نہ سنجیدگی کا مظاہرہ کیا بلکہ خاموشی سے اٹھ کر خود ہی ابرار کے پاس چلی گئی۔ عذرا کی ماں نے سکھ کا سانس لیا کہ عذرا میں تندرست ہونے کے آثار پیدا ہو گئے ہیں۔

اس کے بعد عذرا ابرار کے پاس جاتی رہی۔ اسے اب وہاں جانے کے لئے کہنے کی ضرورت بھی نہیں پڑتی تھی۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ ماں نے اسے روکا کہ اب نہ جایا کرو مگر وہ پھر بھی جاتی رہی۔ اس نے تھوڑی بہت باتیں کرنی شروع

کر دی تھیں۔ اس نے قہقہے لگانے چھوڑ دیئے اور سنجیدہ ہو گئی۔ اب وہ دیواروں سے باتیں بھی نہیں کرتی تھی۔ اس پر خاموشی طاری رہنے لگی۔

ایک روز جب وہ ابرار کے گھر سے واپس آئی تو بہت روئی۔ اس کی ماں پریشان ہو گئی۔ اس نے عذرا سے پوچھا کہ کیا بات ہے۔ عذرا نے کچھ نہ بتایا۔ اِدھر جب عورتوں نے دیکھا کہ عذرا پر ابرار کے وظیفوں اور دعاؤں نے بہت اثر کیا ہے۔ تو لوگوں نے ابرار کے پاس جانا شروع کر دیا۔ ہمارے معاشرے میں ہر آدمی روگی ہے۔ لوگ اپنے دُکھوں سے نجات پانے کے لئے شارٹ کٹ طریقے کے قائل ہیں اسی لئے پیروں فقیروں کی دکانداری خوب چلتی ہے لیکن ابرار نے لوگوں کو واپس بھیجنا شروع کر دیا۔ وہ لوگوں کے آگے ہاتھ جوڑتا تھا کہ خدا کے لئے مجھے غلط نہ سمجھو۔ میں کوئی پیر فقیر یا پہنچ والا نہیں۔ تم جیسا عام انسان ہوں۔ اُدھر ابرار کے ہم وطن بھی حیران تھے کیونکہ مشرقی پنجاب میں ابرار کے خاندان کا سارا گزارا پیری مریدی پر تھا اور اب ابرار اس سے منہ موڑتا تھا۔

ابرار نے عذرا کو ٹھیک کر لیا تھا لیکن جن لوگوں کو ابرار نے مایوس کیا تھا انہوں نے یہ مشہور کر دیا کہ عذرا اور ابرار کے تعلقات قابلِ اعتراض ہیں۔ عذرا اسی لئے ٹھیک ہو گئی ہے کہ اسے ابرار سے جسمانی تسکین مل جاتی ہے۔

میں نے پہلے بھی بتایا ہے کہ عذرا ایک خوبصورت اور کم عمر لڑکی تھی۔ اس کے لئے رشتوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ برادری میں اس کے لئے لڑکا تلاش کرنے کی مہم شروع ہوئی تو عذرا نے اس پر اعتراض کیا۔ اس نے اپنی ماں سے کہا کہ وہ شادی نہیں کرے گی۔ ماں نے اس کو دنیا کی اونچ نیچ سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن اس پر کوئی اثر نہ ہُوا۔ آخر اُس نے تنگ آکر کہا — ''اگر آپ نے میری شادی ضرور کرنی ہے تو میں شاہ صاحب (ابرار) کے علاوہ اور کسی سے شادی نہیں کروں گی''۔

ماں یہ سن کر سناٹے میں آگئی۔ اس نے بیٹی کے ساتھ بہت سر کھپایا لیکن بیٹی اپنی ضد پر اڑی رہی۔ ماں نے اپنے خاوند اور بیٹے کے ساتھ بات کی۔ خاوند نے بیوی کو لعن طعن کی کہ تم نے بیٹی کو ایسے شخص کے پاس کیوں بھیجا تھا۔ وہ پیر فقیر

نہیں' کوئی فراڈیا ہے جس نے ہماری بیٹی کو ورغلایا ہے۔ عذرا کا بھائی بہت جوش میں تھا۔ وہ ابرار کو قتل کرنے پر تیار ہو گیا۔ باپ نے اسے بڑی مشکل سے ٹھنڈا کیا اور کہا ـــ "جو ہو گیا سو ہو گیا۔ اس میں غلطی ہماری اپنی ہے۔ میں برادری کے بزرگوں سے بات کرتا ہوں۔ اگر یہ شخص فراڈیا ہے تو اسے اس محلّے سے نکلوا دیں گے"۔

برادری کے بزرگوں کو جب پتہ چلا تو وہ بہت پریشان ہوئے۔ عذرا کے والد پڑھے لکھے تھے اور وہ پیروں فقیروں کی اصلیت سمجھتے تھے لیکن برادری کے بزرگ کسی پیر سے الجھنے کا تصوّر بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ان کے نزدیک شاہ صاحب خدا کے مقبول بندے تھے جنہوں نے عذرا کے سر سے آسیب اتار دیا تھا۔ شاہ صاحب کو ناراض کر کے وہ گاؤں کے لئے خدا کا قہر مول نہیں لینا چاہتے تھے لیکن دوسری طرف وہ یہ بات بھی برداشت نہ کر سکتے تھے کہ عذرا کا رشتہ کہیں اور ہو۔ شاہ صاحب بے شک نیک آدمی تھے' اچھے خاندان کے تھے لیکن وہ ان کی برادری کے نہیں تھے۔ عذرا کا رشتہ ابرار کے ساتھ طے کرنے کا مطلب ان کے نزدیک ساری برادری کے منہ پر کالک ملنے کے برابر تھا۔ عذرا کے والد اس لئے اس رشتے کے حق میں نہیں تھے کہ وہ ابرار کو اچھا آدمی نہیں سمجھتے تھے۔ برادری کے بزرگ ابرار کو اچھا آدمی سمجھتے تھے لیکن وہ ان کی ذات برادری کا آدمی نہ تھا۔

بزرگوں نے بہت غور کیا کہ اس مسئلے کا حل کیا ہو لیکن ان کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ آخر کار عذرا کے تایا نے کہا کہ شاہ صاحب سے ہی بات کر لیتے ہیں۔ انہوں نے ہمارا بہت بڑا مسئلہ حل کیا ہے' شاید ان کی روشن ضمیری ہماری رہنمائی کر دے۔

برادری کے بزرگ ابرار کے پاس گئے اور اس سے اپنا مسئلہ بیان کیا۔ عذرا کے والد نے غصے میں آ کر ابرار کو بہت کچھ کہہ دیا۔ اس پر الزام تراشی کی جسے ابرار سکون سے سنتا رہا۔ آخر کار بزرگوں نے عذرا کے والد کو چپ کرا دیا۔

"آپ لوگوں کی مہربانی ہے کہ آپ خود میرے پاس تشریف لائے ہیں" ـــ ابرار نے ٹھہر ٹھہر کر بولنا شروع کیا ـــ "اگر آپ لوگ مجھے حکم دیتے تو میں خود

آپ کے پاس حاضر ہو جاتا۔ میں کوئی پیر یا پہنچ والا نہیں۔ آپ کی طرح کا ایک عام انسان ہوں۔ میں نے آپ کی بیٹی کا جو علاج کیا ہے' وہ میں نے تعویذوں اور پھونکوں سے نہیں کیا۔ میں نے اس کے درد سے ہی اس کا علاج کیا ہے"۔

"اور اس کے دکھ سے ناجائز فائدہ اٹھا کر اسے ورغلا لیا" ـــ عذرا کے باپ نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"میری بات غور سے سنو میرے بزرگوار!" ـــ "کون جانے کس نے کس کے دکھ سے فائدہ اٹھایا ہے۔ میں نے آپ کو پہلے بھی بتایا ہے کہ میں کوئی پہنچ والا شخص نہیں' ایک گناہگار انسان ہوں لیکن آپ کی اطلاع کے لئے عرض کرتا ہوں کہ میں فراڈیا اور جعل ساز بھی نہیں۔ میرے اور عذرا کے درمیان درد کا رشتہ ہے۔ آپ کے بیٹے نے پاکستان کے لئے اپنا بازو قربان کیا ہے۔ آپ کی بیٹی نے کشمیر کو اپنا سہاگ پیش کیا اور اسی صدمے نے اس کے ذہن پر اثر کیا۔ آپ نے پاکستان اور اس کی بقا کے لئے قربانیاں دی ہیں۔ میں انہیں قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ میں نے عذرا کو یہی سمجھانے کی کوشش کی کہ جو قربانیاں تم نے دی ہیں ان کو اپنا دکھ نہ بناؤ.....

"پہلے روز جب عذرا میرے پاس آئی تو میری کوئی بات نہیں سنتی تھی۔ میں نے اسے اپنی مثال دی۔ میں نے اسے بتایا کہ میں نے پاکستان کے لئے کیا دیا ہے۔ آپ لوگوں نے وہ سارے منظر اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ میں اکیلا ہوں لیکن میں اکیلا نہیں ہوں۔ میرے پیاروں کی یادیں میرے ساتھ ہیں۔ ذرا اس منظر کا تصوّر کریں جب میرے باپ کو جسے ہندو مسلمان سب عزت کی نظر سے دیکھتے تھے سرِراہ گولی مار کر شہید کر دیا گیا تھا۔ میرے دو جوان بھائی سکھوں کا مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہوئے۔ میری ماں کو جس ظالمانہ طریقے سے قتل کیا گیا وہ منظر بھی میرے سامنے ہے۔ میرے شیر خوار بھتیجے کو جس طرح برچھی میں پرویا گیا وہ بھی میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ میری بھاوج کے جسم کے نازک حصوں کو جس طرح مجروح کر کے اسے اذیّت ناک طریقے سے قتل کیا گیا' وہ منظر بھی میری یاد پر نقش ہے۔ میری معصوم بہن جس کے دامن پاک بازی پر

فرشتے بھی سجدے کرتے تھے' اس کے سر سے چادر نوچنے کا منظر بھی میں نے دیکھا ہے۔ سر کا زخم کھانے سے پہلے بے ہوش ہو جانے تک میں نے اپنی بہن کی چیخیں سنی ہیں جو اپنے ہی صحن کے کنوئیں میں کود گئی تھی۔ وہ مسلمان کی بیٹی تھی۔ اس نے مسلمان کی' آپ لوگوں کی آبرو بچانے کے لئے اپنی جان قربان کر دی.....

"میں نے عذرا کو بتایا کہ جب میں ایک بیل گاڑی میں پاکستان کے سفر کے لئے روانہ ہُوا' میرا سارا خاندان کٹ چکا تھا۔ میں اکیلا رہ گیا تھا۔ پاکستان کے اس خونچکاں سفر کے راستے پر کٹے ہوئے انسانی اعضاء آج تک میری یادوں میں مہیب ہیولوں کی طرح رقص کرتے ہیں۔ درختوں سے لٹکے ہوئے آبرو باختہ نسوانی جسم اور ماؤں کے مُردہ سینوں سے چمٹے ہوئے مُردہ بچے مجھے بھی پاگل کرنے کے لئے کافی تھے لیکن میں نے اپنا ذہن اپنے قبضے میں رکھا.....

"میں نے عذرا سے کہا کہ اگر میں بھی اپنے پیاروں کی قربانی دینے کے بعد پاگل ہو جاتا تو لاکھوں دوسرے لوگ بھی پاگل ہو جاتے۔ ہم پاگل ہو جاتے تو پاکستان کا کیا بنتا جس کی خاطر ہم نے اتنی قربانیاں دی ہیں۔ میں نے اسے کہا —— 'عذرا! الطاف بیمار ہو کر بھی مر سکتا تھا۔ تمہارے بھائی کا بازو کسی حادثے میں بھی بیکار ہو سکتا تھا لیکن ذرا سوچو۔ ان کی یہ قربانیاں کتنے عظیم مقصد کے لئے تھیں۔ تمہیں تو فخر کرنا چاہئے اور اپنے ہوش و حواس پر قابو رکھنا چاہئے'.....

"مجھے معلوم تھا کہ عذرا پر صدمے کا اثر ہے اور مجھے یقین تھا کہ اس کا علاج یہی ہے کہ اس کو ایک اور صدمہ پہنچایا جائے۔ میں نے اسے کہا —— 'عذرا! آگ اور خون کے طوفان سے گذر کر آنے کے بعد زندہ رہنا بے غیرتی ہے لیکن میں نے اس سارے ظلم کا انتقام لینا ہے۔ میں نے وہ نسل تیار کرنی ہے جو ہندوؤں اور سکھوں سے اس ظلم کا بدلہ لے گی' —— میں نے عذرا سے یہ بھی کہا —— 'عذرا! اپنے شوہر اور اپنے بھائی کی قربانی کو ضائع نہ کرو۔ عہد کرو کہ تم شادی کرو گی اور اپنے بچوں کو بھی پاکستان پر قربان ہونے کے لئے پالو گی۔ تم اپنی کُوکھ کو بنجر نہ ہونے دو۔ ماں بنو۔ پاکستان کے لئے غازی اور شہید پیدا کرو.....

"مجھے معلوم تھا میرے بزرگوار! کہ عذرا جذبے والی لڑکی ہے۔ نتیجہ میری

توقع کے مطابق نکلا۔ میں نے اس کے جذبات کو جھٹکے دیئے انہوں نے اسے سکتے سے نکال لیا اور وہ آپ کے سامنے ہے۔ وہی عذرا جو الطاف کی شہادت سے پہلے ہُوا کرتی تھی"۔

عذرا کے بزرگ ابرار سے شکوے شکائتیں کرنے گئے تھے لیکن اس کی تقریر سن کر ان سب کے آنسو نکل آئے۔ ابرار کا یہ جذبہ تھا جس کی وجہ سے اس کی باتیں برادری کے بزرگوں کے دل میں اتر گئیں۔

"اب اگر عذرا مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہے" —— ابرار کہہ رہا تھا —— "تو اس کی یہ وجہ نہیں کہ میں نے اسے ورغلا لیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم دونوں میں درد کا اور جذبے کا رشتہ ہے۔ یہ جذبہ ایک مرد اور ایک عورت کا جذبہ ہے۔ دو سچے پاکستانیوں کا جذبہ ہے۔ عذرا کو اس کا مقصد میں نے دکھا دیا ہے۔ منزل اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ کر اس نے اپنا ذہن اپنے قابو میں کر لیا ہے۔ آپ عذرا کے بزرگ ہیں۔ اگر آپ مجھے اس قابل نہیں سمجھتے تو میں آپ سے شکوہ نہیں کروں گا۔ میں نے اپنا دل کھول کر آپ کے آگے رکھ دیا ہے"۔

یہ تو ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ عذرا کے بزرگ ابرار سے عذرا کی شادی نہ کرتے۔ ابرار پڑھا لکھا آدمی تھا اور اب تو سب لوگوں نے' جنہوں نے اس کی باتیں سنی تھیں' اسے دل سے پسند کرنا شروع کر دیا تھا۔ چنانچہ عذرا اور ابرار کی شادی ہو گئی۔

ان کی شادی سے ڈیڑھ سال بعد ان کی پہلی بیٹی پیدا ہوئی —— اور ان کی وہ بیٹی میں ہوں —— "میں نے یہ کہانی ابو' امی اور نانی اماں سے پوچھ کر لکھی ہے —— ابو اور امی کے درمیان درد کا رشتہ ہے اور پاکستان کے اس درد کو وہ اپنے سینے میں بسائے ہوئے ہیں۔ میں بھی کوشش کرتی ہوں کہ اس درد کی دولت کو عام کروں لیکن کبھی کبھی محسوس ہوتا ہے جیسے میری اولاد کے لئے درد کی یہ دولت کوئی عجیب شے ہے۔ میرے ابو اپنے نواسے نواسیوں اور قوم کے دوسرے بچوں کے مستقبل سے مایوس نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ وقت آنے دو۔ قوم پر مرمٹنے کا جذبہ ان کھلنڈرے بچوں کو بھی مجاہد بنا دے گا۔

ایک بار میں نے ابو سے پوچھا کہ انہوں نے اپنی خاندانی روایت کے مطابق پیری مریدی کیوں نہیں شروع کی۔ انہوں نے ہنس کر مجھے ٹال دیا۔ پھر تھوڑی دیر بعد کہنے لگے —— "معصومہ بیٹی! میں پاکستان کا بیٹا ہوں اور پاکستان کو کام کرنے والوں اور خون دینے والوں کی ضرورت ہے۔ پیروں، فقیروں اور ان کے تعویذوں کی نہیں"۔

حق مہر جو بیوی نے ادا کیا

کہانی جو میں آپ کو سنانے لگی ہوں یہ اصل میں میری ایک سہیلی کی کہانی ہے لیکن یہ ہمارے پورے معاشرے کی صحیح تصویر ہے۔ کسی کا انجام کچھ ہوتا ہے اور کسی کا کچھ اور ہی ہوتا ہے لیکن میری سہیلی کی کہانی کا انجام پڑھ کر آپ معلوم نہیں کیا محسوس کریں۔ بہرحال انجام عجیب و غریب ہے جس کو اخلاقیات اور مذہب کے ٹھیکیدار بالکل پسند نہیں کریں گے۔ میں اپنا تبصرہ کیے بغیر آپ کو کہانی سنا دیتی ہوں۔

بیٹیوں والوں کی یہ خواہش اور کوشش ہوتی ہے کہ بیٹی کے لئے امیر کبیر گھرانہ ملے۔ جو چیزیں دیکھنے والی ہوتی ہیں وہ بالکل نہیں دیکھی جاتیں۔ یہ تو ایک جُوّا ہوتا ہے بعض اچھے لوگ بُرے نکل آتے ہیں بعض بُرے لوگ بڑے اچھے ثابت ہوتے ہیں۔ میری سہیلی کے لئے بھی اس کے ماں باپ نے ایک امیر گھرانہ ڈھونڈ لیا اور رشتہ طے ہو گیا۔ پھر شادی ہو گئی۔

ہم نے اپنی اس سہیلی ناظرہ کو جب اپنے دولہا کے ساتھ کار میں بیٹھے بازار جاتے دیکھا تو ہم سب سہیلیوں نے رشک کیا کہ گھر اور خاوند ملے تو ایسا ملے۔ ناظرہ کا خاوند اچھی شکل و صورت والا اور اچھی طبیعت والا آدمی تھا۔ اس کا ذاتی کاروبار تھا جو لاکھوں کا تھا۔ ناظرہ کے ماں باپ بھی بہت خوش تھے لیکن ناظرہ اتنی خوش نظر نہیں آتی تھی جتنا کہ اسے خوش ہونا چاہئے تھا۔ میں اس کی ہمراز سہیلی ہوں۔ ہم نے اکٹھے بی۔ اے کیا تھا۔ میں نے ایک روز ناظرہ سے پوچھا کہ مجھے ایسے لگتا ہے جیسے وہ اپنی ازدواجی زندگی میں کچھ کمی محسوس کر رہی ہے۔ اس نے پھیکی سی مسکراہٹ سے کہا کہ کچھ مزا نہیں آ رہا۔ میں نے اس کے دل سے بات نکالنے کی بہت کوشش کی مگر اس نے کوئی ٹھوس شکایت نہ کی صرف اتنا اور کہا کہ میرے

خاوند کی شکل و صورت جتنی اچھی ہے اگر وہ اتنا ہی زندہ دل ہوتا تو زندگی کا مزا آجاتا۔

چھ سات ماہ بعد میری بھی شادی ہو گئی اور میں اپنے خاوند کے ساتھ اپنے گھر سے سینکڑوں میل دور چلی گئی۔ کبھی میکے آنا ہوتا تو ناظرہ کے ساتھ مختصر سی ملاقات ہو جاتی اور کبھی یہ بھی نہ ہوتی۔ جو سہیلیاں ملتی تھیں' ان سے میں ناظرہ کے متعلق ضرور پوچھتی تھی۔ وہ کہتی تھیں کہ ناظرہ پریشان تو نہیں لیکن خوش بھی نہیں۔

دو سال بعد مجھے اپنی امی کا خط ملا جس میں انہوں نے لکھا کہ ناظرہ نے اپنے خاوند سے طلاق لے لی ہے اور دوسری شادی کرلی ہے۔ میں نے ان الفاظ کو کئی بار پڑھا مجھے اپنی آنکھوں پر شک ہوتا تھا کہ لکھا ہُوا کچھ اور ہے اور میں کچھ اور پڑھ رہی ہوں۔ سات آٹھ مہینوں بعد میں میکے آئی۔ ناظرہ کا اتا پتا معلوم کیا۔ وہ اپنے ہی شہر میں تھی۔ میں یہ سن کر حیران ہوئی کہ اس نے طلاق اور شادی کا فیصلہ اپنے ماں باپ سے پوچھے بغیر کیا تھا۔

یہاں آپ ضرور کہیں گے کہ ناظرہ آزاد خیال اور کوئی ایسی ویسی لڑکی ہو گی۔ میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ وہ صاف ستھرے کردار کی لڑکی تھی اور اس کے خیالات بڑے ہی اچھے تھے۔ کنواری لڑکیاں مل بیٹھتی ہیں تو اپنے ہونے والے خاوندوں کے بارے میں ضرور باتیں کرتی ہیں اور کچھ لڑکیاں غلط باتیں بھی کر گزرتی ہیں۔ ناظرہ نے کبھی ایسا ویسا لفظ منہ سے نہیں نکالا تھا۔ صرف یہ کہا کرتی تھی کہ خاوند چاہے غریب ہو' بدصورت ہو' جیسا کیسا بھی ہو' محبت کرنے والا ہونا چاہئے۔ میں تو صرف یہ دیکھوں گی کہ میرے خاوند کے دل میں میری محبت ہے یا نہیں۔ یہ الفاظ وہ محاورے کی طرح بولا کرتی تھی کہ میں پیٹ پوجا کی نہیں روح کے پیار کی قائل ہوں۔

میں پہلی فرصت میں ناظرہ کے دوسرے خاوند کے گھر پہنچی۔ گھر آسانی سے مل گیا اور ناظرہ اکیلی مل گئی۔ اب میں نے دیکھا کہ اس کا چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کا حسن تھا لیکن اب میں نے اس کی آنکھوں میں ایسی چمک دیکھی جیسے اس کی آنکھیں بھی مسکرا رہی ہوں میں نے اس سے

پوچھا کہ ناظرہ! یہ تم نے کیا کیا؟ اس نے جو جواب دیا' وہ میں آپ کو اپنے الفاظ میں سناتی ہوں۔ اس نے بڑی لمبی بات سنائی تھی۔ میں ذرا مختصر سناتی ہوں۔

اس کا پہلا خاوند جتنا خوبرو اور امیر تھا اتنا ہی تنگ نظر اور پیسے کا پجاری تھا۔ شادی کے فوراً" بعد اس نے پہلی حرکت یہ کی کہ ناظرہ کو سلامی کے جو چار پانچ ہزار روپے ملے تھے' وہ خاوند نے ایک ایک پیسے کا حساب کر کے اس سے لے لئے۔ پھر اس نے دونوں طرف کے زیورات اپنے سامنے رکھ کر گنے' ایک کاغذ پر ان کی باقاعدہ لسٹ بنائی اور اٹھا کر بنک کے لاکر میں رکھ آیا۔ ناظرہ کے کانوں میں چھوٹے چھوٹے بندے اور اُنگلی میں صرف اکیلی انگوٹھی رہ گئی۔

جب پاکستان بنا میں اُس وقت بہت چھوٹی تھی۔ میرے ابّا جان ہندوؤں کی کاروباری ذہنیت کی باتیں سنایا کرتے تھے تو میں کہا کرتی تھی کہ یہ مبالغہ ہے۔ ہندوؤں کے اس محاورے کو میں صرف محاورہ سمجھا کرتی تھی کہ چمڑی جائے دمڑی نہ جائے' لیکن اب ناظرہ نے اپنے خاوند کی باتیں سنائیں تو مجھے ماننا پڑا کہ پیسے کا پیار اور کاروباری پن انسان کو کتنی پستی میں گرا دیتا ہے۔ اس نے بتایا کہ شادی کے فوراً" بعد خاوند نے ایک نوکر کو چھٹی دے دی اور ناظرہ سے کہا کہ اب تم آگئی ہو اس لئے دوسرے نوکر کی ضرورت ختم ہو گئی ہے۔ گھر میں صرف ایک نوکرانی رہ گئی۔ ہانڈی روٹی ناظرہ کرنے لگی لیکن اس کا خاوند شام کو آکر پورا حساب لیتا تھا کہ ہانڈی روٹی پر کیا خرچ آیا ہے۔ نوکرانی کو اگر ناظرہ تازہ روٹی اور سالن دے دیتی تو خاوند مصیبت کھڑی کر دیتا۔

اس طرح کی بیشمار باتیں ہیں جو ناظرہ مجھے سناتی رہی۔ ان سے صاف پتہ چلا کہ ناظرہ کے خاوند کو صرف پیسے سے پیار تھا۔ صحیح معنوں میں اس کا ایمان یہ تھا کہ چمڑی جائے دمڑی نہ جائے۔ اگر آپ مزید وضاحت چاہتے ہیں تو میں آپ کے پرچے کا ہی حوالہ دے دیتی ہوں کہ ہندوؤں کا ایک اصول یہ ہے جو پنڈت چانکیہ نے انہیں دیا ہے کہ اگر تمہیں اپنا نقصان ہوتا نظر آئے تو اپنی بیوی کو بھی چھوڑ دو اور نقصان سے بھاگو۔ یہ سمجھ لیں کہ بس یہ تھا ناظرہ کا خاوند۔ اگر کبھی اسے کار میں بٹھا کر کہیں لے جاتا تو ناظرہ کو یہ ضرور جتاتا کہ ایک بوتل یا سوا بوتل یا ڈیڑھ بوتل

پٹرول لگ گیا ہے اور یہ ضرور کہتا تھا کہ اب آٹھ دس دن تک کار کو ذہن سے نکال دینا۔

ناظرہ کے خاوند میں یہ ایک عجیب عادت تھی کہ ناظرہ کو اپنے تین چار دوستوں کے گھروں میں ضرور لے جاتا تھا۔ ناظرہ کہتی ہے کہ وہ دراصل میری نمائش کرتا تھا کہ دیکھو میری بیوی کتنی خوبصورت ہے۔ اگر کوئی دوست اس کے گھر آجاتا تو اس کی زبانی آؤ بھگت خوب کرتا تھا لیکن صرف ایک بوتل منگوا کر دوست کو پلا دیتا تھا۔

ناظرہ نے ڈیڑھ برس بڑی مشکل سے کاٹا۔ ایک روز خاوند نے اسے کہا کہ کراچی ایک مال اترا ہے۔ اگر وہ میرے ہاتھ لگ جائے تو ڈیڑھ لاکھ کا منافع ہو سکتا ہے۔ میں نے حساب کیا ہے۔ میرے پاس رقم ہے لیکن چالیس ہزار کم پڑتے ہیں۔ تم اپنے گھر سے کچھ رقم لا دو۔

ناظرہ اپنے ابا جان سے دس پندرہ ہزار تو لا ہی سکتی تھی لیکن اس خیال سے کہ یہ شخص رقم ہضم کر جائے گا اور واپس نہیں کرے گا کہہ دیا کہ اس کے ابا جان کے پاس تو دو چار سو روپیہ بھی دینے کے لئے نہیں۔ خاوند نے کہا کہ وہ جن سے کچھ رقم ادھار لے سکتا تھا ان سے بھی اب ملنی مشکل ہے۔

ناظرہ نے کوئی دلچسپی نہ لی۔ ویسے ہی اس کی ہاں میں ہاں ملاتی رہی اور وہ مختلف ذرائع سوچتا رہا جہاں سے رقم مل سکتی تھی۔ آخر اسے ایک آدمی یاد آیا ——

"دیکھو ناظرہ!" —— خاوند نے کہا —— "صرف ارشد ہے جو دینا چاہے تو ایک لاکھ روپیہ بھی دے سکتا ہے۔ اس کی اکیلی جان ہے۔ بیوی کو وہ طلاق دے چکا ہے۔ تم اسے اچھی طرح جانتی ہو۔ وہ کئی بار ہمارے گھر میں آیا ہے لیکن وہ رقم دے گا نہیں"۔

"کیوں؟" —— ناظرہ نے پوچھا —— "وہ تو مجھے بڑا اچھا آدمی لگتا ہے۔ تم اسے کہو تو سہی"۔

"نہیں وہ انکار کر چکا ہے" —— خاوند نے کہا —— "اگر تم اس کے پاس جاؤ تو شاید تمہیں دے دے"۔

ناظرہ مجھے بتاتی ہے کہ اسے یہ بات اچھی نہ لگی۔ خاوند کے ساتھ اس کے

دوستوں کے پاس بیٹھنا کچھ اور بات ہوتی ہے لیکن اکیلے کسی غیر مرد کے پاس جانا ناظرہ کو اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ ناظرہ نے اس کے پاس جانے سے انکار کر دیا لیکن خاوند ناظرہ کے پیچھے ہی پڑ گیا۔ یہاں تک کہ ان کی آپس میں تُو تُو مَیں مَیں ہو گئی۔ ناظرہ کے سینے میں اس لیچڑ خاوند کے خلاف غبار بھرا ہُوا تھا جو اُس نے کبھی بھی نکالنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ اندر ہی اندر اپنے آپ کو کھاتی رہتی تھی۔ ازدواجی زندگی میں یہ ان کا پہلا جھگڑا تھا۔

خاوند نے اسے ڈرانے کے لئے یہ الفاظ کہہ دیئے کہ میں تمہیں عیش کراتا ہوں۔ اگر میں تمہیں گھر سے نکال دوں تو تمہیں کوئی پوچھے بھی نہیں۔

یہ الفاظ چنگاری کی طرح ناظرہ پر گرے۔ ناظرہ بے قابو ہو گئی۔ اس کے منہ میں جو آیا اس نے خاوند کو کہہ ڈالا۔ اسے ہندو بنیا بھی کہا۔ یہودی بھی کہا۔ پیسے کا پجاری بھی کہا۔

بات بہت بڑھ گئی لیکن ناظرہ کا خاوند آخر کاروباری آدمی تھا۔ اس نے صلح صفائی کی باتیں شروع کر دیں اور آہستہ آہستہ ناظرہ کو ٹھنڈا کرتے کرتے یہاں تک لے آیا کہ وہ ارشد کے پاس ایک بار چلی جائے اور اس سے چالیس ہزار روپیہ ایک مہینے کے وعدے پر قرض لے آئے۔

ناظرہ اُسی وقت چلی گئی لیکن وہ ٹھنڈی نہیں ہوئی تھی۔ اس کا دماغ چکرا رہا تھا۔ وہ دراصل اس گھر سے اور اس خاوند سے تھوڑی سی دیر کے لئے دور چلی جانا چاہتی تھی۔ ارشد کو وہ جانتی تھی کہ وہ زندہ دل آدمی ہے اور اچھا آدمی ہے۔ ارشد سے اسے کوئی ایسا ویسا خطرہ نہیں تھا۔

ارشد اسے گھر میں اکیلا مل گیا۔ ناظرہ کو دیکھ کر وہ کچھ حیران سا ہُوا اور کچھ خوش بھی ہُوا۔ اس نے پوچھا ناظرہ تم اکیلی کیسے؟

"چالیس ہزار روپیہ قرض لینے آئی ہوں" —— ناظرہ نے کہا —— "دے سکیں یا نہ دے سکیں، جواب دے دیں"۔

"میں دے تو ضرور دوں" —— ارشد نے کہا —— "تمہیں میں انکار نہیں کر سکتا۔ اپنی ذات کے لئے چالیس کی بجائے اَسّی ہزار مانگو حاضر کروں گا لیکن تمہارے

سیٹھ کو ایک پیسہ نہیں دوں گا۔ اسے کہو کہ پہلے جو دس ہزار روپیہ دو سال سے میرا دبا رکھا ہے وہ واپس کرو"۔

"وہ اپنی جان دے دے گا" ۔۔۔ ناظرہ نے کہا ۔۔۔ "رقم نہیں دے گا"۔

یہاں سے ناظرہ نے اپنے خاوند کے لیچڑ پن کی باتیں شروع کر دیں۔ وہ بیچاری جلی بھُنی ہوئی تھی۔ ارشد نے اسے اس کے خاوند کی وہ باتیں سنائیں جو ناظرہ کو بھی معلوم نہیں تھیں۔ ارشد نے کہا کہ وہ تو گندی نالیوں میں سے مچھلیاں پکڑنے والا انسان ہے۔ میں حیران ہوں کہ تم جیسی لڑکی اس کے ساتھ کس طرح گزارہ کر رہی ہے۔

ناظرہ کے آنسو نکل آئے۔ اس نے مجھے یہ سارا قصہ سناتے ہوئے بتایا کہ ارشد کچھ ویسے بھی اسے اچھا لگتا تھا جس کی وجہ صرف یہ تھی کہ ارشد ہنسنے ہنسانے کی باتیں کیا کرتا تھا۔ ناظرہ نے اپنا دل کھول کر ارشد کے آگے رکھ دیا۔ وہ کہتی ہے کہ ارشد کو وہ ایک ایسا مرد نہیں سمجھتی تھی جو اسے غلط معنوں میں اچھا لگا ہو۔ وہ بتاتی ہے کہ ارشد کی نیت بھی کچھ ایسی ویسی نہیں تھی۔ وہ ہمراز سہیلیوں کی طرح باتیں کرتے رہے ناظرہ نے یہ باتیں اپنی ماں کے ساتھ بھی کبھی نہیں کی تھیں۔ صرف ایک بار اس نے ماں سے کہا تھا کہ امی! کس گھٹیا آدمی کے پلے تم نے مجھے باندھ دیا ہے۔ اس کی امی نے اسے ڈانٹ کر چپ کرا دیا اور کہا تھا کہ تم عرب کے بادشاہ کے ساتھ شادی کرنا چاہتی تھی؟ خدا کا شکر ادا کرو کہ تمہیں اتنا امیر اور اتنا خوبصورت خاوند مل گیا ہے۔ اس کے بعد ناظرہ نے ماں کے ساتھ کبھی بھی اپنے خاوند کی کوئی بات نہ کی۔

ارشد نے اس کی باتیں اور شکائتیں اتنی دلچسپی اور اتنی ہمدردی سے سنیں کہ ناظرہ نے ازدواجی زندگی میں پہلی بار روحانی سکون محسوس کیا۔ اس سکون کا اثر تھا کہ ناظرہ کے آنسو بہنے لگے۔ پھر وہ سسکیاں لینے لگی۔ ارشد اس کے پاس آ بیٹھا اور اپنا بازو اس کے کندھے پر رکھ کر اس طرح اسے اپنے ساتھ لگا لیا جس طرح ماں اپنے روتے ہوئے بچے کو گود میں لے لیتی ہے۔ ناظرہ نے روحانی سکون سے بڑھ کر بھی کچھ محسوس کیا۔

جب ناظرہ کا غبار آنسوؤں نے نکال دیا تو ارشد اس سے ہٹ کر پرے جا بیٹھا۔

ناظرہ حیران ہوئی کہ ارشد کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے۔

"آپ کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر مجھے یقین نہیں آتا کہ کوئی مرد کسی عورت کا دکھ سن کر رو بھی سکتا ہے" ۔۔۔ نارہ نے کہا۔

"تمہاری حیرت پر مجھے حیرت نہیں ہوئی" ۔۔۔ ارشد نے کہا ۔۔۔ "مجھے اپنی قسمت پر رونا آ گیا تھا۔ تمہیں معلوم ہے کہ میں اپنی بیوی کو طلاق دے چکا ہوں۔ تمہیں شاید وجہ معلوم نہیں ہوگی۔ لمبی بات کیا سناؤں۔ وہ بھی پیسے کی پجارن تھی۔ خدا نے میرے کاروبار میں خوب برکت ڈالی ہے۔ پیسے کی کمی نہیں لیکن وہ پیسہ ہی پیسہ کرتی رہتی تھی۔ میں اسے کہا کرتا تھا کہ میری تمام کمائی تمہارے لئے ہے لیکن عجیب لڑکی تھی کہ پیسے کا ہی پیار تھا"۔

"تو کیا اسے یہ احساس نہیں تھا کہ آپ کا پیسہ اسی کے گھر میں رہتا ہے؟" ۔۔۔ ناظرہ نے کہا ۔۔۔ "اور اس سارے روپے پیسے کی مالک وہی تھی"۔

"وہ اپنے ماں باپ کا گھر بھر رہی تھی" ۔۔۔ ارشد نے کہا ۔۔۔ "مجھے اس چکر میں ڈال کر کہ میں بہت خرچ کرتا ہوں وہ پیسے اُڑا کر اپنے ماں باپ کو دے آتی تھی۔ میں یہ دیکھتے ہوئے بھی یہ ظاہر کرتا تھا کہ مجھے کچھ پتہ نہیں کہ وہ کیا کر رہی ہے وہ مجھے بالکل ہی بدھو اور انجان سمجھنے لگی۔ اُس کا پیار بالکل کاروباری تھا۔ پیار کے معاملے میں مَیں کچھ جذباتی ہوں اور سچے پیار کی اتنی ہی ضرورت محسوس کرتا ہوں جتنی جسم خوراک کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔ ماں کا پیار اس کے ساتھ قبر میں دفن ہو گیا پیچھے ایک بہن رہ گئی تھی۔ وہ بھی تین سال ہوئے اللہ کو پیاری ہو گئی ہے۔ والد صاحب پہلے ہی فوت ہو چکے تھے۔ میں ان سب کا پیار اپنی بیوی سے مانگتا تھا لیکن اسے پیسے سے پیار تھا۔ ایک بار اسی طرح جس طرح تمہارے خاوند کو کچھ رقم کی ضرورت آ پڑی ہے۔ مجھے صرف دس ہزار کی کمی محسوس ہوئی۔ بڑا اچھا سودا تھا۔ میں کسی سے قرض لینے کو پسند نہیں کرتا۔ بیوی سے کہا کہ اپنا زیور دے دو۔ میں بنک میں رکھ کر دس پندرہ ہزار روپیہ لے لوں گا۔ اس نے صاف انکار کر

دیا۔ میں نے تمہارے خاوند سے کہا کہ میرا دس ہزار واپس کر دو۔ مہینے ڈیڑھ مہینے بعد پھر لے لینا۔ اس نے کہا کہ ابھی ابھی میری شادی ہوئی ہے۔ ساری رقم ادھر لگ گئی ہے.....

"مجھے بڑا غصہ آیا۔ میں نے دوسرے دن اپنی بیوی کو غصے سے کہا کہ اپنا تمام زیور نکالو۔ اس نے کہا کہ وہ تو میں کل شام اپنی ماں کے پاس چھوڑ آئی ہوں۔ میں پہلے ہی بھڑکا ہوا تھا۔ میں نے اسے کہا کہ ابھی اٹھو اور تم بھی ماں کے پاس چلی جاؤ۔ بس یہاں سے بات بڑھی اور معاملہ یہاں تک پہنچا کہ میں نے اسے گھر بھیج کر پیچھے طلاق نامہ بھیج دیا.....

"ناظرہ! اگر روپے پیسے سے پیار مل سکتا ہے تو میرے پاس جتنی رقم ہے اور یہ مکان بھی میں پیار کے ایک بول کی خاطر دینے کے لئے تیار ہوں۔ کیا تم مجھے پیار دے سکتی ہو؟ میں تمہیں یہ صاف بتا دوں کہ مجھے تمہارے جسم اور تمہارے حسن کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں۔ میں صرف یہ بھیک مانگتا ہوں کہ جس طرح آج تم نے مجھے اپنی سنائی ہیں اور میری سنی ہیں اسی طرح کبھی کبھی آجایا کرو۔ میں تمہارے قریب نہیں بیٹھوں گا۔ تمہیں اپنے سامنے بٹھاؤں گا۔ مجھے ماں کا پیار دو۔ مجھے بہن کا پیار دو۔ مجھے ایک عورت کا پیار دو جس کے بغیر مرد ریگستان میں چلتا اور پیاس سے مرتا ہوا مسافر بن جاتا ہے۔ میں تمہیں چالیس ہزار روپیہ دے دیتا ہوں۔ یہ اپنے خاوند کو دے دینا اور اسے کہنا کہ یہ بیشک واپس نہ کرے لیکن تمہیں کبھی کبھی میرے پاس آنے کی اجازت دے دیا کرے"۔

"ارشد صاحب!" — ناظرہ نے کہا — "وہ اس قدر کمینی ذہنیت کا آدمی ہے کہ چالیس ہزار روپیہ دیکھ کر مجھے کہے گا کہ ہر روز چلی جایا کرو"۔

ناظرہ کہتی ہے کہ اس نے اور ارشد نے ایسی جذباتی فضا پیدا کر دی جیسے اس کا ذہنی توازن بالکل ہی بگڑ گیا ہو۔ ناظرہ نے تیزی سے ہاتھ ارشد کی طرف پھیلا کر کہا — "لاؤ چالیس ہزار۔ میں کل پھر تمہارے پاس آؤں گی"۔

ارشد نے دوسرے کمرے میں جا کر چالیس ہزار روپیہ نکالا۔ لا کر ناظرہ کے حوالے کر دیا۔ ناظرہ نے کچھ بھی نہ کہا۔ شکریہ بھی ادا نہ کیا اور اٹھ کر چلی گئی۔

اپنے گھر پہنچی تو اس کے خاوند نے سب سے پہلی بات، یہ منہ سے نکالی — "رقم لے آئی ہو؟"

"ہاں" — ناظرہ نے کہا — "لے آئی ہوں" — اس نے چالیس ہزار کے نوٹ خاوند کو دکھائے اور کہا — "یہ رقم اس شرط پر تمہارے ہاتھ میں دوں گی کہ پہلے طلاق لکھ کر میرے ہاتھ میں دے دو"۔

وہ احمقوں کی طرح ہنس پڑا۔

"میں مذاق نہیں کر رہی سیٹھ صاحب!" — ناظرہ نے کہا اور دوسرے کمرے میں جا کر لیٹر پیڈ اور قلم اٹھا لائی۔ خاوند کے آگے رکھ کر بولی — "طلاق لکھو۔ رقم لے لو"۔

خاوند کچھ دیر اسے مذاق سمجھتا رہا لیکن ناظرہ کے چہرے پر اور اس کے بولنے کے لب و لہجے میں قہر و عتاب اور نفرت دیکھ کر اس نے طلاق لکھ دی۔ ناظرہ نے مجھے بتایا کہ خاوند نے اس سے ڈر کر طلاق نہیں لکھی تھی۔ اسے چالیس ہزار روپیہ نظر آ رہا تھا۔ طلاق لکھ کر اس نے کہا — "یہ لو اور جاؤ۔ رقم میرے حوالے کرو اور یاد رکھو کہ میں یہ رقم واپس نہیں کروں گا"۔

ناظرہ اپنے گھر چلی گئی۔ یہ ایک الگ کہانی ہے کہ اس نے اپنے زیورات اپنے خاوند سے کس طرح نکلوائے لیکن ماں اور باپ نے ناظرہ کے ساتھ بہت برا سلوک کیا۔ ناظرہ نے انہیں کہا کہ میں اس گھر میں صرف تین ماہ کی عدت پوری کروں گی۔ اگر آپ لوگوں کو میرا وجود گوارا نہیں تو میرا ٹھکانہ موجود ہے۔ میں گھر سے اس طرح نکل جاؤں گی کہ آپ لوگ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔

ماں نے اُسی رات ناظرہ کے دوسرے رشتے کی باتیں شروع کر دیں۔ وہ کہنے لگی کہ اب وہ ناظرہ کو اس سے بھی زیادہ امیر آدمی کے ساتھ بیاہے گی۔ ناظرہ چپ رہی۔

دوسرے دن وہ ارشد کے گھر چلی گئی اور اسے طلاق نامہ دکھایا۔

"لو ارشد صاحب!" — ناظرہ نے کہا — "آپ نے مجھے کہا تھا کہ کبھی کبھی

آیا کرو لیکن میں ہمیشہ کے لئے آگئی ہوں۔ کیا آپ کو قبول ہے"۔

ارشد چکرا گیا۔ ذرا سنبھل کر بولا کہ فوراً "تو شادی نہیں ہو سکتی۔ ناظرہ نے اسے بتایا کہ وہ عدت اپنے ماں باپ کے گھر پوری کرے گی اور جس روز تین مہینے پورے ہو جائیں گے' وہ اگلے روز اس کے پاس آجائے گی۔ وہ نکاح خواں کا انتظام کر رکھے۔

ان تین مہینوں میں وہ ارشد سے ملتی رہی اور اس کی ماں اس کے لئے کوئی دوسرا رشتہ تلاش کرتی رہی اور اس کا خاوند مشہور کرتا رہا کہ ناظرہ بد چلن ہے لیکن ناظرہ یوں سب کچھ سن کر ٹالتی رہی جیسے مکھیوں کو اُڑایا جاتا ہے۔ تین مہینے پورے ہوئے تو ناظرہ نے اپنا اٹیچی کیس اٹھایا اور ماں سے کہا کہ میں جا رہی ہوں۔

"کہاں جا رہی ہو؟" —— ماں نے کہا۔

"اپنے دوسرے خاوند کے پاس"۔ —— ناظرہ نے کہا اور ماں پر سکتہ طاری کر کے وہ نکل گئی۔

آج پانچ سال ہو گئے ہیں۔ ناظرہ کو دیکھتی ہوں تو میں سمجھتی ہوں کہ اس سے بڑھ کر خوش و خرم عورت اور کوئی نہیں ہو سکتی۔

پیاسی روحیں

بیٹے کو ماں کے ساتھ اور بیٹی کو باپ کے ساتھ پیار ہوتا ہے۔ مجھ کو معلوم نہیں کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ شاید یہ اس لئے ہوتا ہے کہ بیٹی عورت ذات ہے' اپنے آپ کو کمزور اور اپنے باپ کو شیر بہادر سمجھتی ہے۔ یہ تو حقیقت ہے کہ عورت کتنی ہی جرأت اور دلیری والی کیوں نہ ہو وہ مرد کو اپنا محافظ سمجھتی ہے مگر وہ پیار ضرور مانگتی ہے جس کے بدلے وہ اپنے جذبات کی شکل میں پوری قیمت دیتی ہے۔

میرے دو بھائی تھے اور ایک بڑی بہن' یعنی ہم چار بہن بھائی تھے۔ ہم لوگ کار کوٹھی والے تو نہیں تھے لیکن کار کوٹھی والوں کے محتاج بھی نہیں تھے۔ باپ کا عہدہ اچھا اور تنخواہ اچھی تھی۔ خوشحالی تھی۔ اتنی بڑی حویلی اپنی تھی اور چھوٹا سا ایک مکان کرائے پر دیا ہُوا تھا۔ ہم بہت اچھے کپڑے پہنتے تھے۔ اچھا کھاتے تھے۔ رشتہ داروں میں ہمارے گھر کی بہت عزت تھی. مگر ہمارا گھر پیار اور محبت کے معاملے میں بہت غریب تھا' بلکہ کنگال تھا۔ بچے بھوکے رہ جاتے ہیں مگر پیار ضرور مانگتے ہیں۔ ہمارا باپ اس معاملے میں خالی ہاتھ تھا۔

باپ کا ہاتھ بیٹی کے سر پر ہوتا ہے تو بیٹی اپنے آپ کو شیر کی بچی سمجھتی ہے مگر میرے باپ کا ہاتھ میرے سر پر پڑتا تھا تو دو دن چکر آتے رہتے تھے۔ آپ پڑھ رہے ہیں کہ میں اپنے باپ کو ابا جان یا والد صاحب نہیں لکھ رہی۔ اللہ اس کو معاف کرے۔ ایسے باپ احترام کے قابل نہیں ہُوا کرتے۔

اگر میں یہ سنانے لگوں کہ میرا باپ گھر میں کیسی کیسی حرکتیں کیا کرتا اور کس طرح اپنی ڈکٹیٹر شپ چلایا کرتا تھا تو میری تحریر بہت ہی لمبی ہو جائے گی۔ میرا باپ مجھے یا میرے کسی بہن بھائی کو مارتا پیٹتا تھا تو رونے سے روکنے کے لئے دو تین تھپڑ

اور جڑ دیتا تھا اور وہ دو نالی بندوق کے دھماکے کی طرح کہا کرتا تھا —— "چپ" —— پھر وہ کمرے یا صحن میں اس طرح ٹہلا کرتا جس طرح محمد علی باکسر جیت کر رِنگ میں ٹہلا کرتا تھا۔

ایک واقعہ سے آپ اس کی ذہنیت اور عادت کو سمجھ لیں۔ میں اُس وقت دوسری جماعت میں پڑھتی تھی۔ میری چار سہیلیاں میرے گھر آئی ہوئی تھیں۔ میری عمر سات سال نہیں ہوئی تھی۔ چاروں سہیلیاں اسی عمر کی تھیں۔ ہم سکول سے آکر گڈی گڈے کا بیاہ کر رہی تھیں۔ اُس روز ہمارے گھر میں چاول پکے تھے۔ میں نے ایک پلیٹ میں چاول ڈال رکھے تھے۔ میری سہیلیاں بھی اپنے اپنے گھر سے کچھ نہ کچھ لے کر آئی ہوئی تھیں۔ میرا باپ آگیا۔ وہ میری پیٹھ کی طرف سے آ رہا تھا۔ اس نے پیچھے سے مجھ کو کان پر اتنی زور سے تھپڑ مارا کہ میں پہلو پر لڑھکتی چلی گئی۔ میرا خیال تھا کہ میں اٹھ نہیں سکوں گی۔

میں اٹھی تو پاؤں پر کھڑا نہیں ہُوا جاتا تھا۔ باپ نے میرا کان پکڑا اور اتنی زور سے مروڑا کہ تھپڑ کا درد کم ہو گیا۔ میری سہیلیاں' چھ چھ سات سات سال کی بچیاں' بھاگ گئی تھیں۔ باپ مجھے کان سے پکڑ کر گھسیٹتا ہُوا لے گیا اور پوچھا' تختی لکھی ہے؟ میں تختی لکھ کر اور پہاڑے یاد کر کے کھیلنے بیٹھی تھی۔ اس نے کہا' لا تختی۔ میں نے اسے تختی دکھائی۔ آج آدھی صدی بعد بھی مجھے یاد ہے کہ اسے تختی پر میری لکھائی میں کوئی غلطی نظر نہیں آرہی تھی اور وہ پریشان ہو رہا تھا۔ میں سسکیاں لے رہی تھی۔ اس نے ایک اور تھپڑ مار کر کہا —— "ماں کی طرح ٹھُس ٹھُس کرتی ہے اور تختی لکھنی نہیں آتی۔ یہ دیکھ ک اس طرح لکھتے ہیں؟ یہ ٹیڑھا ہے..... جا تختی دھو اور پھر سے لکھ"۔

میرا سر چکرا رہا تھا۔ کان بند ہو گیا تھا۔ غصہ الگ تھا لیکن یہ بے بس اور مجبور کا غصہ تھا جو دوسروں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا' اپنا ہی خون جلاتا ہے۔ اُس روز میری ماں کو بھی غصہ آگیا۔ اس نے میرے باپ سے کہا کہ بچی سکول کا کام کر کے کھیلنے بیٹھی تھی۔ آپ نے اسے مار کر اچھا نہیں کیا۔ باپ نے یہ ثابت کرنے کے لئے کہ اس نے مجھے مار پیٹ کر ایک کارنامہ کیا ہے' جھوٹ بولا کہ میں نے تختی ٹھیک نہیں لکھی۔ مجھے پہاڑے یاد نہیں اور میں ہر وقت کھیل کود میں لگی رہتی ہوں۔

"یہ لڑکی ہے لڑکا نہیں" —— باپ نے کہا —— "اسے سر نہ چڑھاؤ۔ نہیں تو جوان ہو کر میرے منہ پر کالک ملے گی"۔

میں حیران اور پریشان تھی۔ میں روتی تھی تو باپ بم کی طرح پھٹتا تھا —— "—— چُپ حرام زادی" —— یہ معمہ میرے ذہن میں جاگ اٹھا تھا کہ جوان ہو کر باپ کے منہ پر کالک ملنے کا کیا مطلب ہے۔ میں کسی سے پوچھ نہیں سکتی تھی۔ گھر میں کسی بھی بچے کو کچھ پوچھنے کی اجازت نہیں تھی۔ ہم سے صرف جواب مانگا جاتا تھا۔ اگر کسی کا جواب باپ کی مرضی کے مطابق نہ ہوتا تو اس کو میرے باپ سے دنیا کی کوئی طاقت نہیں بچا سکتی تھی۔

یہ صرف ایک واقعہ سنایا ہے۔ میں کہتی تھی کہ باپ مجھے ہر روز ایک تھپڑ مار لیا کرے لیکن پیار سے اٹھا لیا کرے' کبھی گود میں بٹھا لیا کرے' کبھی بازار سے دو پیسے کی کوئی چیز ہی لے آیا کرے' مگر وہ باپ نہیں جیل خانے کا داروغہ تھا اور ہماری ماں' میں اور میرے بہن بھائی خطرناک مجرم تھے۔ باپ گھر میں ہمیں گھُورنے' ڈانٹنے اور ہفتے میں ایک آدھ دفعہ مار پٹائی کرنے آتا تھا۔ ہماری ماں ہمیں اس سے نہیں بچا سکتی تھی۔ اسے تو ہمارا باپ خریدی ہوئی لونڈی سمجھتا تھا اور جس طرح وہ ہماری ماں کو بے جان چیز سمجھ کر استعمال کیا کرتا تھا وہ میں بیان نہیں کر سکتی۔ اس کے لئے ہمارا باپ مست حیوان تھا۔ میں نے دن کے وقت دو دفعہ اسے حیوانی حالت میں دیکھا۔

وہ گنوار اور ان پڑھ نہیں تھا۔ آپ کو شاید یقین نہ آئے وہ بی۔ اے تھا۔ گھر میں مالی تنگ دستی بھی نہیں تھی۔ یعنی تعلیم بھی تھی اور خوشحالی بھی تھی۔ کہتے ہیں جہاں یہ دونوں چیزیں نہ ہوں وہاں لوگ جاہلوں اور مویشیوں والی حرکتیں کرتے ہیں۔

میری بڑی بہن کی عمر تیرہ سال ہوئی تو اس ٹائی فائیڈ ہو گیا۔ میرے باپ نے علاج میں کوئی کسر نہ رہنے دی۔ وہ بھی میری طرح پیار کی ترسی ہوئی تھی۔ باپ ڈاکٹر کو گھر بھی لے آتا اور خود جا کر دوائیاں لاتا تھا۔ علاج میں کوتاہی اور لاپرواہی

نہیں ہوتی تھی لیکن باپ کے منہ سے پیار اور ہمدردی کا ایک لفظ بھی نہیں نکلتا تھا۔ ایک روز میری بہن نے ماں سے بڑی نحیف آواز میں پوچھا —— "امی! ابا مجھ سے ناراض ہیں؟"

ماں نے اس کا یہ وہم دور کرنے کے لئے کچھ نہ کچھ کہا لیکن ماں کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس کے چار روز بعد میری بہن اتنے اچھے علاج کے باوجود مر گئی۔ میں کہتی ہوں کہ ٹائی فائیڈ سے کوئی نہیں مرتا۔ وہ پیار کی پیاس سے مری ہے۔ میں اسے خوش قسمت سمجھتی ہوں جو اس جہنم سے آزاد ہو گئی۔ میں آپ کو یہ بھی بتاتی چلوں کہ میرے باپ نے میری بہن کی موت پر اس طرح رشتہ داروں اور محلے داروں کو ضیافتیں کھلائیں جیسے یہ وفات نہیں شادی ہو۔ ہر جمعرات کو دیگیں پکتیں اور ختم قرآن ہوتا تھا۔ چہلم تو دعوت ولیمہ تھی۔ اگر باپ زندگی میں اپنی بیٹی کے ساتھ اس دلچسپی کا اظہار کر دیتا تو وہ شاید نہ مرتی۔

میں سمجھتی تھی کہ صرف میرا باپ ہی ایسا ہے۔ میری دوسری سہیلیوں کے بھی باپ ایسے ہی تھے۔ ان میں تھوڑا تھوڑا فرق تھا۔ بعض گھر میں صرف حکم چلاتے تھے' مارتے پیٹتے نہیں تھے۔ بعض نے مار پٹائی کا کام اپنے بچوں کی ماں کو دے رکھا تھا۔ بعض بچوں کو گالیاں دیتے تھے۔ ان سب میں ڈکٹیٹر شپ ایک جیسی تھی۔ میری کلاس میں صرف دو بچیاں ایسی تھیں جو اپنے باپوں کی تعریفیں کرتی تھیں۔ وہ بتایا کرتی تھیں کہ ان کے باپ ان کے ساتھ کھیلتے ہیں۔ انہیں اپنے ساتھ باہر لے جاتے ہیں۔ ان سے پیار کرتے ہیں اور انہیں کہانیاں سناتے ہیں۔

ہم حیران ہوتی تھیں کہ ایسے باپ بھی ہوتے ہیں۔ یہ خیال بھی آتا تھا کہ ان کے باپوں کو شاید معلوم نہیں ہو گا کہ لڑکیوں کے ساتھ اچھا سلوک کرو تو جوان ہو کر وہ ان کے منہ پر کالک ملیں گی۔ ہمارے ذہن کچے تھے۔ ہم کہتی تھیں کہ اگر بچیوں کے ساتھ پیار کرنے والے باپ بیوقوف اور کم عقل ہیں تو یہی اچھے ہیں۔ میں نے کئی بار دعا کی تھی کہ میرا باپ بھی بیوقوف ہو جائے۔

میں بڑی ہوتی گئی مگر باپ کا سلوک وہی رہا۔ وہ ہر بات ڈانٹ ڈپٹ کے لہجے میں کرتا تھا۔ غصہ کہیں کا بھی ہو وہ ہماری ماں پر یا ہم بچوں پر نکلتا تھا۔ ماں کو ذرا بھی

سکون میسر نہیں تھا اس لئے وہ بھی ہمارے ساتھ پیار کی بات نہیں کرتی تھی۔ میں اُس عمر کو پہنچ گئی جہاں راز کی باتیں بھی سمجھ میں آجاتی ہیں۔ پتہ چلا کہ میرا باپ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے گھر میں لڑکی پیدا ہو۔ میری ایک سہیلی نے بتایا تھا کہ اس کا باپ کہا کرتا ہے کہ بیٹیوں کے ساتھ نرم سلوک نہیں کرنا چاہئے۔ ورنہ سر چڑھ جاتی اور جوان ہو کر خراب ہو جاتی ہیں۔

میرے باپ کے بھی خیالات ایسے ہی تھے۔ میم الف صاحب ہی بتا سکتے ہیں کہ جسے پیار نہ ملے اور پیار کی جگہ ڈانٹ ڈپٹ اور تھپڑ ملیں اس کے اندر کیسی آگ لگتی ہے اور وہ انسان کیا بن جاتا ہے۔ میں پندرہ سال کی ہو گئی تو مجھ کو پتہ چلا کہ میں تو بہت خوبصورت ہوں۔ مجھ کو خوبصورتی نہیں ملنی چاہئے تھی۔ آپ نے پندرہ سال کی بعض لڑکیاں دیکھی ہوں گی جو عقل کی باتیں کرتی ہیں اور سب میں بیٹھ کر بہت اچھا بولتی ہیں۔ مجھ میں یہ وصف پیدا ہی نہ ہُوا۔ میرے دل میں ایک خوف بیٹھ گیا تھا اور ایسے معلوم ہوتا تھا کہ میرے ساتھ کوئی حادثہ ہونے والا ہے۔

مجھ کو اپنے اوپر اعتماد نہ رہا۔ میں کھوئی کھوئی رہتی تھی۔ کبھی میں اتنی تنگ آجاتی کہ کہیں نکل جانے کی خواہش اٹھتی تھی۔ مجھے ہر وقت وہم رہتا تھا کہ میں نے جو کپڑے پہن رکھے ہیں ان میں کوئی نہ کوئی خرابی ہے جو مجھ کو نظر نہیں آرہی۔ میں اس وہم میں مبتلا ہو کر اپنے پہنے ہوئے کپڑوں کو ہی دیکھتی رہتی تھی۔ ایک عادت یہ ہو گئی کہ میں آئینے میں اپنے آپ کو بہت دیر تک دیکھتی رہتی تھی۔ مجھ کو اپنے آپ کے ساتھ پیار ہو گیا۔ مجھ کو اپنی ذات میں ایک خلاء محسوس ہوتا رہتا تھا۔ پیار کی پیاس تو اتنی تھی کہ کبھی کبھی میرے آنسو نکل آتے تھے۔

ہمارے پڑوس میں جو گھر تھا وہاں کا ایک جوان لڑکا تھا جس کی ابھی شادی نہیں ہوئی تھی۔ وہ کوئی اتنا خوبصورت جوان نہیں تھا کہ مجھ کو اچھا لگتا۔ ہمارا بیت الخلاء رواج کے مطابق چھت پر تھا۔ چھت پر ہر طرف فصیل تھی۔ میرا قد فصیل سے کچھ اونچا ہو گیا تھا۔ ایک روز میں اوپر گئی تو وہ اپنی چھت پر کھڑا تھا۔ میں نے اس کو دیکھا تو وہ تھوڑا مسکرایا۔ مجھ کو یقین تھا کہ مجھ کو دیکھ کر کوئی نہیں مسکرا سکتا۔ مسکراہٹ محبت اور چاہت کے لئے ہوتی ہے۔ میں نے نظریں نیچی کر کے اس کو

پھر دیکھا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔

وہ میرے لئے اجنبی نہیں تھا۔ ساتھ والے گھر کا لڑکا تھا۔ فرق یہ تھا کہ میں پردہ دار تھی اور بُرقعے میں سکول جایا کرتی تھی۔ میرا ایسا ارادہ نہیں تھا لیکن اپنے آپ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ اس روز اتنا ہی ہُوا۔ دوسرے دن پھر اُسی طرح ہُوا۔ تیسرے دن پہلے دو دنوں والے وقت میں کسی کام کے بغیر اوپر چلی گئی۔ وہ اپنے کوٹھے پر موجود تھا۔ اس روز وہ زیادہ مُسکرایا اور اُس نے سر بھی ہلایا۔ میرے سر اپنے آپ ہل گیا۔

اس سے اگلے روز وہ فصیل کے قریب آ گیا اور تہہ کیا ہُوا ایک کاغذ پھینک کر پرے ہٹ گیا۔

اس میں پیار اور محبت کی باتیں لکھی تھیں۔ یہ بھی لکھا تھا کہ تم پیار کے قابل ہو۔ اگر تم کو میری محبت قبول نہ ہو تو خدا کے واسطے مجھ کو معاف کر دینا اور یہ رُقعہ واپس پھینک دینا۔

میں نے رُقعہ واپس نہیں پھینکا۔ اس کو دیکھا۔ وہ مُسکرا نہیں رہا تھا۔ شاید ڈر رہا تھا۔ میں نے مسکرا کر اس کا ڈر دور کر دیا۔ اگر میرا دماغ نارمل ہوتا تو میں اس کی بجائے اپنے جیسے کسی خوبصورت جوان کو پسند کرتی لیکن یہ پہلا انسان تھا جس نے مجھ کو پیار کے قابل کہا تھا۔

میں سکول بُرقعے میں جاتی تھی۔ نقاب نیچے ہوتا تھا۔ اُس کو دو دفعہ راستے میں کھڑے دیکھا۔ میں آپ کو صاف بتا دیتی ہوں کہ میں پیار کے ذائقے سے واقف ہوئی تو اپنے گھر میں میرا دم گھُٹنے لگا۔ میں اب جوان تھی۔ گھر میں کوئی نہ کوئی مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے تو سب اپنا اپنا مشورہ دیتے ہیں۔ میں نے ایک بات میں اپنے ماں باپ کو اپنا مشورہ دیا تو باپ حقارت سے بولا —— "تُو چُپ رہ۔ دادی اماں نہ بن۔ میں جو کہتا ہوں وہ ٹھیک ہے" —— میں دسویں جماعت میں تھی تو بھی باپ مجھ کو معمولی سی باتوں پر بھی تھپڑ جڑ دیتا تھا۔ اس کے لئے میں ابھی پانچ چھ سال کی بچّی تھی۔

میرے پڑوسی کا نام کچھ اور تھا۔ فرضی نام مجید لکھ دیتی ہوں۔ مجید کے ساتھ

ملاقاتیں بڑھ گئیں۔ وہ کالج سے آ جاتا اور میں کسی نہ کسی بہانے سکول سے نکل جاتی۔ کبھی چھت پر ملاقات ہو جاتی۔ مجھ میں ایک بری عادت تھی۔ مُجھ کو کبھی کبھی وہم ہو جاتا تھا کہ اس کو میرے ساتھ محبت نہیں، وہ جھوٹ بولتا ہے۔ میں بگڑ جاتی تو وہ مجھ کو مناتا تھا۔ ایسا خیال کبھی کبھی آتا تھا کہ میں محبت کے قابل نہیں ہوں۔

میں نے میٹرک پاس کر لیا اور تعلیم کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ اب باہر نکلنا بند ہو گیا۔ مجید سے میل ملاقات کا سلسلہ چھت پر چلتا رہا لیکن خوف موجود رہتا تھا۔ ایک سال گزر گیا تو میری شادی اسی شہر میں کر دی گئی اور چھ سات مہینے بعد مجید کی بھی شادی ہو گئی۔ مجھ کو بالکل افسوس نہ ہُوا کہ میری محبت مجید کے ساتھ تھی اور میرا خاوند کوئی اور بن گیا۔ میں خاوند کے پاس گئی تو میں یہ دیکھ کر خوش ہو گئی کہ مجید اگر پیار کا دریا تھا تو خاوند پیار کا سمندر ہے۔ اس نے مجھ کو پوری آزادی دی۔ وہ آزاد اور روشن خیال تھا۔ مجھ کو بہت پیسے دیتا تھا۔ اس نے مجھ کو محبت کی انتہائی لذّت سے سرشار کیا اور میں اس کی محبت میں ڈوب گئی مگر اپنے باپ کے سلوک نے مجھ کو جو کچھ بنا دیا تھا۔ اس کو میں نہ بدل سکی۔ میرے دل پر جو خوف بیٹھا رہتا تھا وہ موجود رہا۔

مجھ کو کبھی کبھی بہت چھوٹی سی بات پر غصہ آ جاتا تھا۔ یہ دورہ سا ہوتا تھا جس کے دوران مجھ کو خاوند پر شک ہونے لگتا تھا کہ وہ دل سے کسی اور لڑکی کو چاہتا ہے اور مجھ کو پیسے اور جھوٹا پیار دے کر دھوکہ دے رہا ہے۔ میں چوری چھپے اس کے کوٹ کی جیبیں دیکھا کرتی کہ کسی لڑکی کا خط پڑا ہو گا۔ اس کے کپڑوں پر اگر میرا ہی بال ہوتا تو جل اٹھتی کہ یہ کسی اور لڑکی کا ہے۔ وہ کہا کرتا تھا کہ تم بہت پیاری لڑکی ہو۔ اگر تم وہمی نہ ہوتیں تو تم اور زیادہ حسین لگتیں۔

اب جب کہ میں سنجیدہ اور پختہ عمر کو پہنچ گئی ہوں تو مجھ کو خیال آتا ہے کہ میری ساس اتنی بُری نہیں تھی جتنی میں سمجھتی تھی۔ سُسر بھی اچھا آدمی تھا لیکن میرا خاوند اپنی ماں کے پاس بیٹھ جاتا تو میں کہتی کہ ماں اسے میرے خلاف پٹی پڑھا رہی ہے۔ دل میں یہ وہم رکھ کر اور بہانہ کوئی اور بنا کر میں ساس سے لڑ پڑتی اور اسے کہتی کہ وہ اپنے بیٹے کو میرے خلاف کر رہی ہے۔

میرا دماغ دوہرا کام کرتا تھا۔ ایک سوچ سیدھی آتی دوسری اُلٹی۔ محبت کے ساتھ وہم بھی ہوتا تھا۔ میرا خاوند آخر انسان تھا۔ وہ کچھ عرصہ میرے وہم، غصے اور بہتان تراشی کو برداشت کرتا رہا پھر وہ تنگ آنے لگا۔ میرا ایک بچہ پیدا ہُوا۔ پھر بھی میرا ذہن صاف نہ ہُوا۔ دو سال گزر گئے۔ ازدواجی زندگی کے چار سال گزر چکے تھے کہ میرے خاوند نے مجھ کو طلاق دے دی اور اپنا بچہ اپنے پاس رکھ لیا۔

میں اپنے ماں باپ کے گھر گئی تو باپ نے ان الفاظ کے ساتھ میرا استقبال کیا کہ میں اسی لئے کہتا تھا کہ بیٹی پیدا نہ ہو۔ تم نے میرے مُنہ پر کالک مل دی ہے۔ اس وقت تو میں نے طلاق کا الزام اپنی ساس اور خاوند پر عائد کیا لیکن آج آپ کو سچ بتاتی ہوں کہ یہ میرا اپنا قصور تھا۔ اس سے زیادہ صحیح یہ ہے کہ میرے باپ کے سلوک نے مجھے ایسا بنا دیا تھا کہ مجھ میں وہم اور غصہ اس طرح داخل ہو گئے تھے جس طرح کسی انسان میں جِنّ داخل ہو جاتے ہیں۔

مجید دو بچّوں کا باپ بن گیا تھا۔ اب میں نے ذرا آزادی سے اس کے ساتھ میل ملاقات شروع کر دی۔ شہر کے ایک اور حصے میں ان کا اپنا ایک اور مکان تھا۔ مجید کے باپ نے وہ خالی کرا کے مجید کو دے دیا۔ وہ اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ وہاں چلا گیا۔ مجید نے مجھ کو اس گھر کا راستہ بتا دیا۔ میں اس کی بیوی سے ملنے کے بہانے وہاں جا پہنچی۔ اس کے بعد مجید نے ملاقات کا یہ طریقہ اختیار کیا کہ اپنی بیوی کو دو تین دنوں کے لئے میکے بھیج دیتا اور میں دن کے وقت اس کے گھر چلی جاتی۔

ایک روز اس نے کہا کہ اس کی بیوی کو شک ہو گیا ہے۔ اس کی بیوی کے بھائی سخت قسم کے آدمی تھے۔ ان میں سے ایک نے شاید مجھ پر نظر رکھی ہوئی تھی۔

ایک دفعہ مجید کی بیوی اپنے گھر گئی تو مجھ کو پتہ چلا۔ میرا باپ دفتر گیا تو میں مجید کے گھر کو چل دی۔ تانگے سے اتر کر میں ایک گلی میں داخل ہوئی۔ مجید کا گھر ابھی آگے تھا۔ جب میں اس گلی میں مُڑی تو ایک آدمی نے میرا نام پکارا۔ میں نے رُک کر پیچھے دیکھا۔ میرے برقعے کا نقاب نیچے تھا۔ وہ کوئی بڑا اچھا نوجوان تھا۔

"یہیں سے واپس آجاؤ تو تمہاری عزت خراب نہیں ہوگی" ــــ اس نے ایسے لہجے میں کہا جس میں رعب یا دھمکی نہیں تھی ــــ "تم عزت دار باپ کی بیٹی

ہو۔ اس کی عزت کا خیال کرو۔ میں نے تم پر رحم کیا ہے کہ تم کو یہاں روک لیا ہے۔ مجید تمہارے انتظار میں ہے۔ میں تم کو اس کے ساتھ عین موقع پر پکڑ سکتا تھا۔ مجید کے پڑوسیوں نے اوپر سے مجید کے گھر میں اترنے کا میرے لئے راستہ بنایا ہوا ہے۔ وہ بھی میرے ساتھ ہوتے لیکن میرے دل میں رحم پیدا ہو گیا ہے۔ میری بہن کی زندگی میں کانٹے نہ بکھیرو"۔

میں تو چور تھی اور صاف پکڑی گئی تھی۔ میرے سارے جسم سے پسینہ پھوٹ آیا اور مجھ کو چکر آ گیا۔ میں کھوکھلی عورت تھی۔ میں سر جھکا کر واپس چل پڑی۔ اس نے مجھ کو روک لیا اور کہنے لگا کہ اکیلی نہ جاؤ۔ میں تم کو تانگے میں لے جاؤں گا۔ میں نے اس کو مری ہوئی آواز میں کہا کہ میں اکیلی آئی تھی، اکیلی چلی جاؤں گی..... لیکن اس نے مجھ کو اکیلے نہ جانے دیا۔ میں نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے اس سے پوچھا کہ وہ میرے باپ کو تو نہیں بتائے گا؟

میرے دل پر خوف تھا۔ اس نے کہا کہ وہ میرے باپ کو نہیں بتائے گا۔ ہم تانگے میں جا رہے تھے۔ تانگہ کسی اور طرف مُڑا تو میں نے اس سے پوچھا کہ وہ مجھ کو کہاں لے جا رہا ہے۔ اس نے مسکرا کر کہا کہ کہیں اور نہیں لے جاؤں گا۔ میں چُپ ہو گئی اور تانگہ ایک ہوٹل کے سامنے رُکا۔ اس نے تانگے والے کو پیسے دیئے اور مجھ کو اندر لے گیا۔ ہم نے ایک کیبن میں بیٹھ کر چائے پی ــــ اور میں اس کی دوست بن گئی۔

جس عورت کو طلاق ہو جائے اس کو لوگ شکی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ قصوروار خواہ خاوند ہی ہو۔ میں نے طلاق لے کر اپنے خلاف بڑے پکے شک پیدا کر لئے تھے۔ میرے ماں باپ میرے لئے بڑے پریشان رہتے تھے۔ میری عمر ابھی بائیس تئیس سال تھی۔ رشتہ داروں میں لڑکے موجود تھے۔ لیکن مجھ کو کس نے پسند کرنا تھا۔ سب کہتے تھے کہ ایک بچہ جِنّ کر پھینک آئی ہے۔ میرے باپ نے میرے ساتھ بول چال بند کر رکھی تھی۔ مجھ کو دیکھتا تھا تو اس کی آنکھوں میں حقارت ہوتی تھی۔ میری ماں کو رونے کے سوا کام ہی کوئی نہیں تھا۔ دونوں بھائی بھی مجھ سے روٹھے رَوٹھے رہتے تھے۔ اور میں بھٹک رہی تھی۔ میں نے اس نئے آدمی کو اپنا

ہمدرد اور ساتھی بنا لیا تھا۔

ایک سال بعد میرا ایک امیدوار سامنے آگیا۔ اس کی بیوی مرگئی تھی۔ عمر میں مجھ سے آٹھ دس سال بڑا تھا۔ مجھ سے پوچھے بغیر اس کے ساتھ میری شادی کر دی گئی۔ میں نے اسے دیکھا تو افسوس بھی ہُوا اور ہنسی بھی آئی۔ بالکل سیدھا اور بدسلیقہ سا آدمی تھا۔ اس کی شکل و صورت معمولی سی تھی۔ میری خوبصورتی سے اتنا مرعوب ہُوا کہ اس نے بڑی دلچسپ حرکتیں کیں۔ ہاتھ میری طرف کر کے پیچھے کر لیتا تھا۔ جب اس نے دو دفعہ یہ حرکت کی تو میری ہنسی نکل گئی۔ وہ کھسیانہ سا ہو گیا اور اس نے کہا —— "تم کو ہاتھ لگاتے ڈرتا ہوں۔ مجھ کو پتہ نہیں تھا کہ تم اتنی زیادہ خوبصورت ہو۔ مجھ کو تم اپنے قابل نہیں سمجھو گی"۔

میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس رات کے بعد ایسے ہُوا جیسے میں اس کا ہاتھ نہ پکڑوں تو وہ کوئی بھی کام نہ کر سکتا ہو۔ وہ مذہب کا پابند تھا۔ میں نے اس کے کہنے پر بھی پابندی نہ کی تو وہ چپ ہو گیا۔ وہ ہر لحاظ سے سیدھا آدمی تھا۔ اس کی نوکری ایسی تھی کہ تین روز دن کی اور تین روز رات کی ڈیوٹی ہوتی تھی۔ رات ساڑھے آٹھ بجے جاتا اور صبح چار بجے واپس آتا۔ اس مکان میں وہ اکیلا رہتا تھا۔ وہ کہیں اور کا رہنے والا تھا۔

یہ غلام قسم کا خاوند مجھ کو پسند نہ آیا لیکن میں نے اس کے ساتھ اپنا سلوک اچھا رکھا۔ میں آپ کو اپنی نفسیاتی حالت بتاتی ہوں۔ مجھ کو اطمینان نہیں ہوتا تھا۔ میں معلوم نہیں کیسی پیاس اور بھوک سی محسوس کرتی رہتی تھی۔ کبھی ایسے لگتا تھا جیسے کوئی چیز گم ہو گئی ہی۔ نہ یہ پتہ چلتا کہ وہ چیز کیا ہے نہ یہ پتہ چلتا کہ کہاں ہے۔ کبھی خیال آتا کہ میں غلط راستے پر جا رہی ہوں، کبھی یقین ہو جاتا کہ یہی راستہ ٹھیک ہے۔ کبھی طبیعت غصے سے بھر جاتی اور کبھی دل اتنا خوش ہوتا کہ ناچنے کودنے کو جی چاہتا۔ اکثر حالت یہ رہتی کہ کوئی خوف مجھ پر سوار ہے اور مجھ کو کسی ایسے آدمی کی ضرورت ہے جو اس خوف سے نجات دلا دے۔

جن راتوں کو خاوند کی ڈیوٹی ہوتی تھی وہ بڑی مشکل راتیں ہوتی تھیں۔ نیند دیر سے آتی اور ذہن میں بڑے ہی کڑوے خیال آتے تھے۔ بچپن تک ذہن چلا

جاتا اور باپ کے تھپڑ یاد آتے۔ ایسی خواہش اٹھتی کہ میں دوسرا جنم لوں اور مجھ کو پیار کرنے والا اور گود میں بٹھانے والا باپ ملے۔ ان خواہشوں اور یادوں سے میں پیاس سی محسوس کرنے لگتی تھی۔

آپ مجھ کو بدمعاش عورت کہیں گے لیکن میرے دل میں بدمعاشی کا مطلب عیاشی نہیں تھا۔ ایسے لگتا تھا جیسے کوئی کھوئی ہوئی چیز ڈھونڈ رہی ہوں۔ میں جھوٹے سہارے ڈھونڈتی اور خراب ہوتی پھرتی تھی۔ اسی پاگل پن میں، یا آپ اسے جو بھی نام دیں، میں نے ایک اور سہارا ڈھونڈ لیا۔ یہ اس محلّے کا ایک آدمی تھا۔ اس نے پہلے میرے خاوند کو دوست بنایا پھر میرے ساتھ بے تکلفی پیدا کی۔ حالانکہ میں پردے میں ہوتی تھی۔

میری ایک بھول یہ تھی کہ میری درپردہ زندگی سے کوئی بھی واقف نہیں تھا لیکن گلی محلّے کی عورتوں کی چار آنکھیں ہوتی ہیں۔ وہ میرے پاس آتی تھیں۔ میری باتوں سے انہوں نے اندازہ کر لیا ہو گا کہ میں شریف عورت نہیں۔ ایک ادھیڑ عمر عورت تھی جس کا خاوند غریب سا تھا لیکن عورت میں کچھ نرالے وصف تھے۔ اس کی جوانی ڈھل گئی تھی لیکن اس کا حسن ابھی جوان تھا۔ اس کی آنکھیں بھی مسکراتی تھیں۔ بہت پیار اور میٹھی باتیں کرتی تھی۔ عورتیں مجھ کو بتاتی تھیں کہ بڑی استاد عورت ہے لیکن مجھ کو اچھی لگتی تھی۔

پہلے تو وہ میرے حسن کی باتیں کرتی رہتی۔ جب اس نے دیکھا کہ میں نے اس کو دل میں بٹھا لیا ہے تو اس نے میرے خاوند کے خلاف باتیں شروع کر دیں۔ ایک روز کہنے لگی کہ میرے خاوند کی بیوی مرگئی تو وہ اس کے پیچھے پڑ گیا۔ کہتا تھا کہ کبھی کبھی آجایا کرو۔

"مجھ کو اس شخص سے بدبو آتی ہے" —— اُس نے کہا —— "معلوم نہیں تم اس کو کس طرح برداشت کرتی ہو"۔

اس طرح کی باتیں کر کر کے اس نے میرے دل میں میرے خاوند کی نفرت پیدا کر دی۔ ایک روز اس نے کہا —— "رات کو جو آدمی تمہارے پاس آیا تھا وہ اچھا آدمی نہیں"۔

میں نے اسے جھٹلانا چاہا کہ میرے پاس کوئی غیر آدمی نہیں آتا لیکن اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور بڑی پیاری مسکراہٹ سے کہا —— "میں تمہارا راز کسی کو بتا تو نہیں رہی"۔

مختصر یہ کہ وہ میری ہمراز بن گئی اور ایک روز اس نے کہا ایک بڑا خوبصورت آدمی مجھ کو اتنا چاہتا ہے کہ میرے ساتھ شادی تک کرنے کو تیار ہے۔ اس نے بتایا کہ وہ شادی کر کے مجھ کو سعودی عرب لے جائے گا جہاں اس نے کاروبار شروع کیا ہے۔ پھر میرے گھر میں نوٹوں کے ڈھیر لگ جائیں گے۔

میں آپ کو صحیح بتا رہی ہوں کہ روپے پیسے کے ساتھ مجھ کو ذرا سی بھی دلچسپی نہیں تھی۔ میری دلچسپی کسی ایک آدمی کے ساتھ بھی نہیں تھی لیکن اس عورت نے ایسی باتیں کیں کہ میرے دل میں ملک سے باہر جانے کا شوق پیدا ہو گیا۔ میں نے اس کو کہا کہ مجھ کو وہ آدمی تو دکھا دو۔ دوسرے ہی دن میں کواڑوں کے پیچھے کھڑی ہو گئی اور اس نے گلی میں اس آدمی کو میرے سامنے سے گزارا۔ وہ واقعی خوبصورت آدمی تھا۔ میں نے اس عورت سے کہا کہ اس کے ساتھ میری ملاقات کرا دو۔

ملاقات میرے گھر میں ہی ہو گئی۔ میں نے یہ ظاہر کیا کہ میں شریف عورت ہوں اور مجھ کو اس سے بہتر خاوند چاہئے جواب ہے۔ اس شخص نے میرے ساتھ اپنی محبت اور پسندیدگی کا اظہار ایسے الفاظ میں کیا کہ میرا دل موم ہو گیا۔ میں دراصل موم کی ہی بنی ہوئی تھی۔ جو جس سانچے میں ڈھالتا میں اُسی سانچے جیسی ہو جاتی تھی۔ یہاں مسئلہ طلاق لینے کا تھا۔ میرے امیدوار نے مجھے کہا تھا کہ میں طلاق لے کر اس کے پاس آجاؤں گی اور وہ اُسی روز مجھ کو کراچی پہنچا دے گا۔ دو دنوں میں پاسپورٹ وغیرہ بن جائے گا۔ نکاح بھی ہو جائے گا اور تیسرے روز سعودی عرب کو روانہ ہو جائیں گے۔

اُس نے مجھ کو طلاق لینے کے طریقے بتا دیئے۔ میں نے اپنے خاوند کو تنگ کرنا شروع کر دیا۔ اس نے ڈیڑھ دو مہینے میرا رویّہ برداشت کیا۔ پھر میں نے اگلا طریقہ استعمال کیا۔ وہ اپنی ڈیوٹی سے آتا تو میں گھر سے غائب ہوتی۔ میں نے اس پر اپنی

حرکتوں سے یہ ظاہر کرنا شروع کر دیا کہ میں نے کسی کو دوست بنا لیا ہے۔ وہ مذہبی آدمی تھا۔ ایک روز اس نے مجھ کو سیدھے راستے پر لانے کا یہ طریقہ اختیار کیا کہ میرے باپ کو اپنے ساتھ لے آیا۔ باپ نے آتے ہی مجھ کو ڈانٹنا شروع کر دیا۔ میں نے باپ کو زیادہ نہ بولنے دیا۔ اس کو کہا کہ میرا خاوند خود بدمعاش آدمی ہے اور فلاں عورت کے ساتھ اس کی دوستی ہے۔

وہ شریف آدمی ایسا جھوٹا الزام کیسے برداشت کر سکتا تھا۔ میں نے کہا کہ میں ایک عورت کو بلا لاتی ہوں وہ گواہی دے گی۔ میرے خاوند نے واویلا بپا کر دیا۔ میں نے اپنے باپ کو بھی جلی کٹی سنا دیں اور اپنے دل کا غبار نکالا۔ باپ نے مجھ کو ٹھنڈا کرنے کی بہت کوشش کی لیکن میں اب اس کے ہاتھ میں آنے والی نہیں تھی۔ وہ چلا گیا۔ میں خاوند کے ساتھ اکیلی رہ گئی۔ اس کو میں نے مجبور کر دیا کہ وہ مجھ کو طلاق دے دے۔ اس نے طلاق دے دی۔

وہ شخص جس کے لئے میں نے طلاق لی تھی تیار تھا۔ اصلی نام کی جگہ اس کو اشفاق لکھتی ہوں۔ رات کو ایک گاڑی چلتی تھی۔ ہم دونوں اس پر سوار ہوئے اور اگلی رات کراچی پہنچ گئے۔ اس نے ایک ہوٹل میں کمرہ لیا اور باقی رات وہاں گزاری۔ دوسرے دن وہ یہ کہہ کر چلا گیا کہ پاسپورٹ اور دوسرے ضروری کاغذات کے لئے جا رہا ہے۔

وہ دوپہر کے کھانے کے وقت آیا۔ اس کے ساتھ دو آدمی تھے۔ ایک تو اُجڈ سا تھا۔ دوسرا کوئی امیر آدمی لگتا تھا۔ دونوں اردو بولتے تھے۔ اشفاق نے کہا کہ یہ اس کے دوست ہیں اور یہ بڑی جلدی پاسپورٹ وغیرہ بنوا دیں گے۔ انہوں نے کھانا ہمارے ساتھ کھایا۔ میں نے دیکھا کہ دونوں مجھ کو اوپر نیچے سے دیکھتے تھے۔ ایک دفعہ دونوں نے میری طرف دیکھا پھر انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ دونوں نے سر ہلائے۔ مجھ کو کچھ شک ہُوا کہ ان کا کوئی خاص مطلب ہے۔

کھانے کے بعد اشفاق ان کے ساتھ ہی چلا گیا اور وہ رات دس بجے کے قریب آیا۔ اس نے بتایا کہ کل پاسپورٹ مل جائیں گے۔ وہ مجھ کو سعودی عرب میں اپنے کاروبار اور آمدنی کے متعلق بتاتا رہا۔ ہم دراصل میاں بیوی بن چکے تھے۔ نکاح کی

صرف رسم پوری کرنی تھی جو اشفاق کہتا تھا کہ اسی کمرے میں ہو جائے گی۔ میں اب کچھ اطمینان محسوس کرنے لگی۔ ملک سے باہر جانا مجھ کو بہت اچھا لگ رہا تھا۔ اپنا گھر تو مجھ کو ذرا سا بھی یاد نہیں آتا تھا۔

ہم آدھی رات کے بعد سوئے۔ صبح کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ہم اتنی جلدی جاگنا نہیں چاہتے تھے۔ اشفاق گالیاں بکتا اٹھا اور دروازہ کھولا۔ ایک تھانیدار اور تین کانسٹیبل اندر آئے۔ ان کے ساتھ دو آدمی تھے جنہوں نے کل دن کو ہمارے ساتھ کھانا کھایا تھا۔ دونوں کو ہتھکڑیاں لگی ہوئی تھیں۔ تھانیدار نے مجھ کو کہا کہ اٹھ کر وہاں کھڑی ہو جاؤ اور کانسٹیبلوں کو کہا کہ تلاشی لو۔

کانسٹیبلوں نے ہمارے اٹیچی کھلوا کر تمام کپڑے ادھر ادھر بکھیر دیئے۔ پلنگ سے بستر بھی اٹھا اور جھاڑ کر دیکھا۔ تھانیدار نے مجھ سے پوچھا کہ تم اس کی بیوی ہو؟ اشفاق نے کہا کہ ہاں اور میں نے سر ہلایا کہ نہیں۔ تھانیدار نے اشفاق کی دوستوں سے مسکرا کر کہا ——"تم یہ پریوں جیسی عورتیں کہاں سے لے آتے ہو؟ ہمیں کوئی نہیں ملتی"۔

اس آدمی نے جو امیر لگتا تھا اور اب ہتھکڑی میں تھا کہا ——"آپ کا اپنا مال ہے حضور! حاضر ہے۔ آپ تو بات ہی نہیں سنتے۔ حکم کریں"۔

"تم جانتے ہو یہ کیس میرا نہیں" —— تھانیدار نے کہا ——"تم کو یہ بھی پتہ ہے کہ مخبری بڑی پکی ہوئی ہے"۔

میں آپ کو کیسے بتاؤں کہ میری کیا حالت ہوئی۔ سارا جسم کانپ رہا تھا۔ اشفاق سر جھکائے کھڑا تھا۔ مجھ کو معلوم نہیں تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ میں نے ناول اور افسانے پڑھے تھے اور باتیں سنی تھیں مجھ کو پتہ چلنے لگا کہ میں انہی کہانیوں والی ایک خوبصورت لڑکی بن گئی ہوں اور معلوم نہیں کہ میری کہانی کیسے انجام کو پہنچے گی۔

پولیس مجھ کو اور اشفاق کو ان دو آدمیوں کے ساتھ لے گئی۔ باہر گاڑی کھڑی تھی۔ ہم کو اس میں بٹھایا اور کسی تھانے میں لے جانے کی بجائے پولیس ہیڈ کوارٹر میں لے گئے۔ تھانیدار نے مجھ پر مہربانی کی تھی کہ بُرقعہ لینے کی اجازت دے دی

تھی ورنہ میرا ہارٹ فیل ہو جاتا۔ آج مجھ کو خیال آتا کہ بُرقعہ لوہے کا خول نہیں ہوتا۔ جن کو بدی کرنی ہوتی ہے وہ سات پردوں میں بھی عیش موج کر لیا کرتی ہیں۔ کوئی بے پردہ عورت اپنی عصمت کی حفاظت کرنا چاہے تو دس مرد بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔

میں اپنا آپ بگاڑ چکی تھی اور اب تو میں پولیس کے پھندے میں آ گئی تھی۔ یہ آخری حد ہوتی ہے۔ مجھ کو دوسروں سے الگ کر کے ایک دفتر میں داخل کر دیا گیا۔ وہاں کوٹ پتلون میں ملبوس ایک آدمی بیٹھا ہُوا تھا۔ اس نے مجھ کو اپنے سامنے کرسی پر بٹھا کر بہت باتیں پوچھیں۔ بعد میں معلوم ہو گیا تھا کہ وہ شخص سی۔ آئی۔ ڈی کا یا شاید سی۔ آئی۔ اے کا ڈی۔ ایس۔ پی۔ تھا۔ وہ مجھ سے یہ معلوم کر رہا تھا کہ اشفاق نے مجھ کو اغوا کیا ہے کہ میں اپنی مرضی سے اس کے ساتھ آئی ہوں۔ میں نے اسے بتایا کہ میں اپنی مرضی سے اس کے ساتھ آئی ہوں لیکن اس نے کہا تھا کہ میرے ساتھ شادی کر کے مجھ کو سعودی عرب لے جائے گا۔ یہ ان دو آدمیوں کو ساتھ لے کر آیا جن کو پولیس نے پکڑا ہُوا ہے۔

میں نے رونا شروع کر دیا۔ وہ کوئی بڑا ہی نیک آدمی تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں کہاں کی رہنے والی ہوں اور کس کی بیٹی ہوں۔ میں نے اس کو یہی ساری کہانی سنا دی جو آپ کو سنا چکی ہوں۔ میں نے بچپن سے کہانی شروع کی تھی۔ کوئی ذرا سی بات بھی نہ چھپائی۔ میں نے اس عورت کا بھی نام لیا جس نے مجھ کو اشفاق کے حوالے کیا تھا۔ ڈی۔ ایس۔ پی نے اس کا نام اور پتہ پوچھ کر لکھ لیا اور کہنے لگا ——"وہ تمہارے سامنے لائی جائے گی"۔

مختصر قصہ یہ تھا کہ پاکستان میں ایک نیا جرم شروع ہو گیا تھا کہ لڑکیوں کو اسی طرح سبز باغ دکھا کر جس طرح اشفاق نے مجھ کو دکھائے تھے کراچی لے آتے تھے اور یہاں ان کی قیمت طے ہوتی تھی اور باقاعدہ نکاح پڑھا کر سعودی عرب اور کویت وغیرہ لے جاتے اور وہاں امیر کبیر عربوں کے حرموں میں فروخت کر آتے تھے۔ یہ دو آدمی جن کو اشفاق ہوٹل میں لایا تھا وہ مجھ کو دیکھنے اور قیمت طے کرنے آئے تھے۔ کسی نے (شاید اس ہوٹل کے کسی ملازم نے) مخبری کر دی کہ ہوٹل

میں "مال" آیا ہے اور یہ دو آدمی دیکھے گئے ہیں۔ اُسی رات ان کے قبضے سے ایک اور "مال" برآمد ہُوا تھا۔ پولیس نے ہمارے کمرے پر چھاپہ مارا اور میں برآمد ہو گئی۔

ڈی۔ ایس۔ پی نے مجھ کو گواہ بنانا تھا لیکن کہتا تھا کہ مجھ کو اپنے ماں باپ کے پاس جانا پڑے گا اور وہاں سے مجھ کو سرکاری خرچ پر بلایا کریں گے۔ میں نے اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے اور رو رو کر کہا کہ مجھ کو وہاں نہ بھیجیں۔ اس کے بجائے مجھ کو حوالات میں بند رکھیں۔

سب کہتے ہیں کہ پولیس والے اچھے لوگ نہیں ہوتے اور ان کے جال میں جو آجائے اس کو وہ خراب کرتے ہیں۔ مجھ جیسی خوبصورت عورت کو تو وہ جس طرح چاہتے خراب کر سکتے تھے لیکن میری زندگی کو پولیس نے ایسے موڑ پر ڈال دیا کہ میرے سارے پاپ کٹ گئے۔ مجھ کو یہ تو معلوم نہیں کہ پولیس نے میرے متعلق معلومات حاصل کرنے کی لئے کیا کارروائی کی تھی۔ یہ معلوم ہے کہ مجھ کو ڈی۔ ایس۔ پی نے ایک بزرگ سے آدمی کے حوالے کر دیا جو مجھ کو اپنے گھر لے گیا۔ اس کی بیوی تھی۔ ایک لڑکی سولہ سترہ سال کی تھی اور تین لڑکے اس سے چھوٹے تھے۔

کئی مرتبہ یہ بزرگ مجھ کو تفتیش کے لئے لے گئے۔ اس عورت کو بھی گرفتار کر کے کراچی پہنچا دیا گیا جس نے اشفاق کے ساتھ میری دوستی کرائی تھی۔ اس دوران اس بزرگ نے مجھ سے پوچھا کہ میں اس گروہ کے ہاتھ کس طرح چڑھی تھی۔ بزرگ اور ان کی بیوی کا میرے ساتھ سلوک اتنا اچھا تھا کہ میں نے انہیں بھی اپنی یہ ساری آپ بیتی سنا دی۔ انہوں نے بتایا کہ ڈی۔ ایس۔ پی نیک اور مخلص آدمی ہے اور اس نے اس بزرگ سے کہا تھا کہ وہ مجھ کو سرکاری تحویل میں رکھیں اور مجھ کو سیدھے راستے پر چلنے کی تلقین کرتے رہیں۔

یہ بزرگ میرے لئے ولی اللہ ثابت ہوئے۔ میرے دماغ میں یہ ڈالتے رہتے تھے کہ میں پیار کی پیاسی تھی اور یہ میرے باپ کا قصور تھا۔ باپ کے رویئے نے مجھ کو نفسیاتی مریض بنا دیا اور میں پیار کے دھوکے میں اپنا آپ لٹاتی رہی۔ وہ کہتے تھے

کہ پیار اور بخشش اللہ کے پاس ہے۔ تم اللہ کو یاد کرو۔ قصور خواہ کسی کا تھا گناہ تم سے سرزد ہوئے ہیں۔ اس طرح انہوں نے میرے دل میں اللہ اور رسولؐ اور مذہب کے احکام اور محبت بھر دی۔

اس دوران کیس عدالت میں گیا۔ میری گواہی ہوئی۔ ملزموں کے وکیلوں نے مجھ پر اخلاق سے گری ہوئی جرح بھی کی۔ ایک اور بڑی خوبصورت لڑکی برآمد کی گئی تھی۔ اس کیس میں دو ملزم اور تھے جن کو میں نے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ آخر میں ان سب کو چار چار سال سزائے قید دی گئی۔ جس عورت نے مجھ کو اشفاق سے ملایا تھا اس کی سزا دو سال تھی۔

مقدمہ چلنے کے دوران اس بزرگ نے میری شادی کا انتظام بھی کر دیا تھا۔ اس آدمی کی بیوی مر چکی تھی۔ میرے پہلے خاوند بھی تعلیم یافتہ تھے لیکن یہ تیسرا خاوند تعلیم کے ساتھ عقل والا بھی تھا۔ بڑی خاموشی سے شادی ہوئی۔ پتہ چلا کہ اس کو میری ساری ہسٹری معلوم ہے اور میرے لئے اس آدمی کو ڈی۔ ایس۔ پی نے منتخب کیا تھا۔ میں نے اس کو روح کی گہرائیوں میں بٹھا لیا۔ میں جو پیار اور شفقت کی تلاش میں بھٹک گئی تھی ایسی بُری حقیقتوں میں سے گزری جنہوں نے میرے دل اور میرے دماغ کے دریچے کھول دیئے۔ میں نے باقی عمر اللہ سے بخشش مانگتے گزار دی۔ اللہ نے اولاد دی جو آج جوان ہے۔ میرے سارے ارمان پورے ہو گئے۔ تین سال گزرے خاوند اللہ کو پیارا ہو گیا ہے۔